عالمی ادب سے انتخاب

مہرِ سکوت

(منتخب ترجمے)

زینت حسام

مہرِ سکوت
(منتخب ترجمے)

زینت حسام

ISBN: 969-8379-83-5

پہلی اشاعت: ۲۰۰۷ء

ناشر
اجمل کمال

طباعت: ذکی سنز پرنٹرز، کراچی

زیرِ اہتمام
آج کی کتابیں

سٹی پریس بک شاپ
316 مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ، صدر کراچی 74400
فون: 5213916 - 5650623 (92-21)

ترتیب

ابرہام یہوشوا

مہرِ سکوت
۹

❄

ڈونلڈ بارتھیم

غبارہ
۵۷

❄

کیم مونزو

جہاں گرد
۶۳

❄

اتالو کلوینو

چاند کی دوری
۶۷

❁

دانیال الارکون

مسخروں کا شہر

۸۳

❁

یوسف ادریس

الغریب

۱۱۹

❁

گابریئل گارسیا مارکیز

تنہائی کے سو سال

۱۸۱

ندرت کمال

کے لیے

ابرہام یہوشوا

مہرِ سکوت

کل وہ پھر رات گئے لوٹا اور میری نیند کا خیال کیے بغیر کھٹ پٹ کرتا اندر داخل ہوا۔ خالی مکان اس کے قدموں کی آہٹ سے گونجتا رہا۔ ہال کی بتیاں روشن کیے، وہ دیر تک کاغذات الٹ پلٹ کرتا رہا۔ لگتا تھا یہ ہنگامہ کبھی ختم نہ ہوگا۔ بالآخر خاموشی چھا گئی اور میں بڑھاپے کی کچی اور مبہم نیند میں لوٹنے کی کوشش کرنے لگا۔ اور پھر یہ بارش—— تین ہفتے ہو چکے ہیں اس بارش کو برستے ہوے۔ پانی کی برستی ہوئی چادریں کھڑکی سے مسلسل رگڑ کھاتی رہتی ہیں۔

وہ رات کو کہاں جاتا ہے؟ معلوم نہیں۔ ایک دفعہ میں نے دور تک اس کا پیچھا کیا۔ لیکن ایک پرانا واقف کار—— ایک لاعلاج قسم کا نثر نگار—— گلی کے نکڑ پر ٹکرا گیا اور اس نے مجھے دیر تک اٹکائے رکھا۔ لڑکا اس اثنا میں گلیوں کی بھول بھلیوں میں گم ہو چکا تھا۔

بارشیں اس میدان کو کولتار، ریت اور پانی کی دلدل میں تبدیل کرتی جا رہی ہیں۔ سردیوں میں تل ابیب: شہر جس میں پانی کی نکاسی کا کوئی انتظام نہیں، کوئی راستہ نہیں۔ جگہ جگہ جھیلیں ابھر آئی ہیں۔ اور دور گندا، مٹیالا، گرجتا ہوا سمندر، بڑھتے ہوے شہر سے پسپائی اختیار کرتا ہوا، صرف ایک پس منظر میں بدل گیا ہے۔

ابھی شام کے پانچ بھی نہیں بجے اور کھڑکیاں سرمئی دھند میں ڈوب چلی ہیں۔ وہ کیا تھا؟ واہمہ؟ خواب؟ ساحل سے کچھ فاصلے پر، وہ میری نظروں کے عین سامنے کھڑا تھا۔ اس کا سراپا بالکل واضح تھا۔ میرا خیال ہے اس کی آغوش میں سیاہ پرندے تھے، جن کی پھڑپھڑاہٹ کو وہ نرم ہاتھوں سے دبانے کی

کوشش کر رہا تھا۔اس کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھ کر میں حیران تھا۔اس نے مجھ پر ایک گہری نظر ڈالی اور دھیمے سے مسکرایا۔

دوسرے کمرے سے اس کے خراٹوں کی آواز آرہی ہے، اور میں جانتا ہوں اب مجھے نیند نہیں آئے گی۔کل ایک اور کشتی کی روانگی ہے، یا شاید پرسوں، اور مجھے امید ہے آخر کار میں اس پر سوار ہو جاؤں گا۔اور پھر یہ درد زائل ہو جائے گا۔ میں جانتا ہوں۔ مجھے صرف اُس لمحے تک اپنا وقار، اپنا ضبط برقرار رکھنا ہے۔صرف بیس گھنٹے اور۔

گوکہ وہ اس وقت میری نظروں کے سامنے نہیں ہے، لیکن مجھے معلوم ہے وہ سو رہا ہے۔ دل پر ہاتھ، بند آنکھیں، کھلا دہانہ، ہموار سانسیں۔

پہلے میں بتاتا چلوں کہ وہ دیکھنے میں کیسا ہے۔ میں اس کا نقشہ کھینچ سکتا ہوں۔ کیونکہ گو وہ ابھی سترہ برس کا نہیں ہوا، اس کے نقوش میں ٹھہراؤ آگیا ہے۔کافی عرصہ پہلے ہی مجھے احساس ہو گیا تھا کہ اس کے خط و خال ساکن ہو گئے ہیں۔ جیسے ان میں اب کوئی تبدیلی نہیں آئے گی—— وہ اب کبھی نہ بدلے گا۔

اس کے خفیف سے ڈھلکے ہوئے کندھے، عجز سے آگے کو جھکا ہوا خشم آلود جسم، سپاٹ سر۔اس کا چہرہ: کھردرا، موٹا، بھدا؛ رخسار اور پیشانی پر نکلتے ہوئے مہاسے، ڈاڑھی کی آمد کا پتا دیتی ہوئی سیاہ روئیدگی، چھوٹے، گھٹے ہوئے بال۔اور اس کی عینک۔

مجھے اچھی طرح معلوم ہے—— بلکہ میں پہلے ہی سے یہ اعلان کیے دیتا ہوں—— کہ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ غبی ہے، کند ذہن ہے۔ یہ اس کے بارے میں عام رائے ہے، اور میری بیٹیاں اس سے متفق ہیں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہوں کیونکہ اس میں ایسی کوئی بات نہیں جس سے میرے بارے میں انکشاف ہوتا ہو، یا میرے حواس کی صحت پر کوئی شک پیدا ہوتا ہو۔ میں نے اس موضوع پر کافی سائنسی مواد پڑھا ہے، اور میں تم کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ محض ایک حادثہ ہے۔اور پھر وہ مجھ سے قطعی مشابہت نہیں رکھتا۔سوائے ایک خاص وحشی پن کے، ہم دونوں میں کوئی قدرِ مشترک نہیں۔ لہٰذا مجھے کوئی خوف نہیں۔ اور مجھے اس بات پر اصرار ہے کہ وہ ایک بورڈر لائن کیس ہے۔ وہ

خرد و جنوں کی مبہم سرحد پر منڈلا رہا ہے۔ ثبوت؟ اس کی آنکھیں۔ میں وہ واحد شخص ہوں جسے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کے کئی مواقع پیش آئے ہیں، اور میں کہہ سکتا ہوں کہ اس کی آنکھوں میں کبھی کبھی (شاذ و نادر، مجھے اقرار ہے) ایک الاؤ سا روشن ہو جاتا ہے۔ اور اس لمحے اس کی آنکھوں میں ایک ایک پُر تاثیر چمک، ایک گمبھیر قوت سی لپک جاتی ہے۔

اور، صرف اس کی آنکھیں ہی نہیں۔

مگر اس کے باوجود...

وہ میری زندگی میں بڑی دیر بعد پیدا ہوا۔ حادثاتی طور پر، غلطی سے، کسی ملعون معجزے کے تحت۔ کیونکہ ہم دونوں — میں اور اس کی ماں — اس وقت بڑھاپے کی دہلیز پر تھے۔

وہ وقت مجھے اچھی طرح یاد ہے، اس کی پیدائش سے پہلے کا وقت۔ وہ ایک نرم و نازک سی بہار تھی، طویل، مسحور کن بہار۔ اور میں ایک شاعر، جس کے پانچ مجموعے چھپ چکے تھے، اور جس نے کبھی نظمیں نہ کہنے کا عہد کر لیا تھا۔ ایک قطعی فیصلہ۔ یقینِ کامل کے ساتھ، گہری مایوسی میں کیا گیا ایک اٹل فیصلہ۔ یہ میری زندگی کی وہ بہار تھی جب میں نے اپنے آپ سے اس حقیقت کا اعتراف کیا کہ اب مجھے خاموش ہو جانا چاہیے۔

میں دھن بھول چکا تھا۔

میرے قریب ترین دوستوں نے پہلے ہی مجھے طعنے دینے شروع کر دیے تھے۔ میری ہمتیں پست کر دی تھیں۔ میں جو نظم کہتا وہ رد کر دیتے۔ نوجوان شاعروں اور ان کی جدید شاعری نے مجھے پریشان کر دیا تھا، پاگل بنا دیا تھا۔ میں نے چوری چھپے ان کی نقل کرنے کی کوشش کی اور بدترین نظمیں کہیں۔

"ٹھیک ہے،" میں نے خود سے کہا، "میں اب خاموش ہو جاتا ہوں..." اور پھر کیا ہوا؟ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارے روزمرہ کے معمولات میں فرق آ گیا۔ کبھی ہم سرِ شام ہی سونے کے لیے لیٹ جاتے، اور کبھی پُرہجوم کیفوں میں رات گئے تک بیٹھے رہتے! فضول تقریریں، بے معنی بحثیں؛ یا پھر عمر رسیدہ فنکاروں کے ساتھ شامیں مناتے، فنکار جو عزت اور شہرت کی آس لگائے موت کی دہلیز پر بیٹھے تھے۔

وہ طویل، خوشگوار بہار، وہ سبک ہوائیں، وہ کھلے ہوئے غنچے۔ اور میں سڑکوں پر آوارہ پھرتا، بے چین روح کی طرح بھٹکتا۔ نشے میں دُھت ہونے کی کوشش کرتا، اور سب کے سامنے اپنے ہمیشہ

کے لیے خاموش ہو جانے کے عہد کو دہراتا۔ شاعری کو برا بھلا کہتا، کہتا اب تو مشینوں کے ذریعے نظمیں تیار کرنے کا زمانہ آ گیا ہے، پُرتضحیک لہجے میں دیر تک ہنستا، اور اپنی کمزوریوں کا اعتراف کرتا۔ اور رات میں اخبارات کے مدیروں کو پبلک ٹرانسپورٹ جیسے غیر اہم موضوعات پر خط لکھا کرتا، الفاظ کے موتی بٹھاتا، جملوں کو سجاتا بناتا۔

اور پھر اچانک یہ غیر متوقع حمل۔

شرمناک بات۔

گرمی کے اوائل میں ہمیں اس کا پتا چلا۔ پہلے کافی دن تو ہم نے شام ڈھلے تک چہل قدمی کر کے گزارے۔ پھر خود کو گھر میں قید کر لیا۔ اور پھر اس بات پر شرمندہ ہونے لگے۔ پہلے ہم نے اپنی بیٹیوں سے معذرت چاہی جو اپنی عمر رسیدہ ماں کے بڑھتے ہوئے پیٹ کی طرف خوف سے دیکھتیں؛ اور پھر رشتے داروں سے، جو نظریں نیچی کیے نوزائیدہ بچے کو دیکھنے آئے۔

(اس کی پیدائش وسط سرما میں ایک منجمد کر دینے والے دن وقوع پذیر ہوئی۔ باغ کی گھاس برف سے ڈھکی ہوئی تھی۔)

اب ہم بچے کے ساتھ قید ہو گئے۔ (لڑکیاں بچے کا ایک کام نہ کرتیں اور جان بوجھ کر زیادہ وقت گھر سے باہر گزارتیں۔) ہم دونوں ایک دوسرے سے بات کرنا چاہتے تھے، ایک دوسرے سے کہنا چاہتے تھے کہ ''دیکھو، یہ کتنی خوشگوار بات ہوئی ہے۔ یہ بچے کی پیدائش...'' لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے دل اس میں نہ تھے۔ اور پھر دوبارہ وہی معمول، نینداور نشے میں چور، رات گئے گھر آنا۔ گھر کی دیوار پر چنار کے لپٹتے ہوئے سائے، اور کمروں میں بندھی الگنیوں پر لٹکے ہوئے گیلے اور بھاری پوتڑے! کتنا پژمردہ کر دینے والا ماحول تھا۔ ہم جی رہے تھے یا جیسے خود کو پیروں پر گھسیٹ رہے تھے۔

آہستہ آہستہ بچہ بڑا ہونا شروع ہوا، نشوونما کے ہر مرحلے میں سست۔ وہ میرے بستر کے ساتھ لگے جھولے میں بے حس پڑا رہتا۔ جب میں وہ دن یاد کرتا ہوں تو اس کی سرمئی، چڑیا کے بچے کی سی پتلی، کپکپاتی ٹانگیں نظروں کے سامنے گھومنے لگتی ہیں۔

پہلی دفعہ اس وقت شک ہوا جب وہ تین سال کا ہونے کو تھا۔ پہلے پہل لڑکیوں نے اس موضوع کو اٹھایا، میں نے نہیں۔ اس کی جسمانی حرکات سست تھیں، وہ بری طرح ہکلاتا تھا، لہٰذا میری

بیٹیوں نے اسے ذہنی پس ماندہ قرار دیا۔ دوست احباب آتے، اس کو دیکھتے اور اس میں ان نشانیوں کو تلاش کرتے تا کہ اس بات کی تصدیق کر سکیں جو آج تک ہمارے منہ سے نہ نکل پائی تھی۔

مجھے اس کی زندگی کا وہ حصہ اچھی طرح یاد نہیں۔ میں اس تمام عرصے میں اس کی ماں کی بیماری میں الجھا رہا۔ وہ تیزی سے گھلتی جا رہی تھی۔ بچے کی پیدائش کے بعد اب اس میں جان باقی نہ رہی تھی، صرف کھوکھلا خول رہ گیا تھا۔ وہ ہم سے دور صحرا میں اتر جاتی، ویران، بنجر ٹیلوں میں بھٹکتی اور افق کی دھند میں گم ہو جاتی، اور ہم بے بسی سے دیکھتے رہنے کے سوا کچھ نہ کر سکتے تھے۔

ہر دن اس پر تبدیلی کا نشان چھوڑ جاتا۔

بچہ چھ برس کا تھا جب اس کی ماں کا انتقال ہوا۔ بھاری، ڈھل مل سا بچہ۔ وہ گھر میں کسی سے مانوس نہ ہوا تھا، اپنی ذات میں سمٹ کر رہ گیا تھا۔ لیکن وہ کبھی خوابوں کی دنیا میں گم نہیں رہتا تھا، وہ خوابوں میں رہنے والا بچہ تھا ہی نہیں۔ مضطرب اور بے چین، وہ ہر وقت تناؤ کا شکار رہتا۔ جب کبھی میں اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتا تو وہ کانپنے لگتا۔

کاش میں اس پر ترس کھا کر کہہ سکتا: یتیم بچہ۔ لیکن یہ لفظ میرے حلق میں اٹک سا جاتا ہے۔ ماں کی موت نے اس پر کسی قسم کا تاثر نہ چھوڑا، گو کہ میری بوکھلاہٹ کی وجہ سے وہ جنازے میں ہمارے پیچھے پیچھے گھسٹتا چلا آیا تھا۔ اس نے کبھی اپنی ماں کے بارے میں نہ پوچھا: گویا اسے علم تھا کہ اب وہ کبھی واپس نہ آئے گی۔ موت کے چند ماہ بعد اس کی تمام تصویریں گھر سے غائب ہو گئیں۔ اور جب کچھ دنوں کے بعد ہمیں اس کا احساس ہوا تو ہمارے ذہنوں میں کہیں یہ خیال نہ آیا کہ اس سے بھی پوچھا جا سکتا ہے۔ جب بالآخر ہم نے اس سے گمشدہ تصویروں کے بارے میں پوچھا تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ شام کا اندھیرا ہو چلا تھا جب اس نے ہمیں دفینے کی جگہ دکھائی: باغ کے آخری کونے میں، چنار کے درخت کے نیچے، بوسیدہ، کسی قدیم وقت کے گڑھے کے نشانوں کے درمیان، ایک چیتھڑے میں لپٹی ہوئی، کٹی پھٹی تصویریں۔

وہ دیر تک ہمارے سامنے کھڑا، شدتِ جذبات سے آگ بگولہ سا بنا، ہکلا ہکلا کر کچھ کہتا رہا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں اضطراب سے گھوم رہی تھیں۔

زندگی میں پہلی دفعہ ہماری آنکھیں کھلیں۔ ہمارے سامنے ایک ننھا منا، جیتا جاگتا انسان تھا۔

میں اپنے آپ پر قابو نہ پاسکا، اور اس کو خوب مارا، زندگی میں پہلی بار۔ میں نے اس کی کلائی پکڑی اور اس کے رخسار پر زور زور سے چانٹے لگائے۔ اور پھر میری بیٹیوں نے بھی اس کی پٹائی کی۔ (لڑکیوں نے اسے کیوں مارا؟)

اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا...

وہ حیرت زدہ سا ہمیں دیکھتا رہا، اور پھر زمین پر گر کر مٹی میں لوٹنے لگا، اور خوب رویا۔ ہم نے اسے گھسیٹ کر کھڑا کیا اور گھر کے اندر لے آئے۔

اس سے پہلے مجھے کبھی احساس تک نہ ہوا تھا کہ وہ گھر کے چپے چپے سے اس حد تک واقف ہوگا، ہر کونے کھدرے کا اسے علم ہوگا۔ اس نے اپنی ماں کی تصویریں بوسیدہ البموں سے نکالی تھیں، پرانے لفافوں کی تلاشی لی تھی، اور اسے باغ کے اس خفیہ گوشے کا بھی علم تھا جس سے میں آج تک لاعلم رہا۔ ہم اس گھر میں برسوں سے رہ رہے تھے، اور میں نے کتنی ہی بے قرار راتیں باغ میں ٹہل ٹہل کر گزاری تھیں، لیکن مجھے آج تک چونے کے اس پرانے گڑھے کا نشان تک نظر نہ آیا تھا جو سرمئی کائی سے ڈھکا ہوا تھا۔

کیا وہ ابتدائی علامتیں تھیں؟ مجھے نہیں معلوم۔ نہ میں، اور نہ میری بیٹیاں اس وقت یہ بات سمجھنے کے لیے تیار تھیں۔ ہمیں صرف اس کی وجہ سے پیش آنے والی رسوائی کا خوف تھا۔ اس کو لوگوں کی نظروں سے چھپانا ناممکن تھا، لیکن کم از کم ہم اس کی حفاظت تو کرنا چاہتے تھے۔

اس وقت تک، دراصل، میری بیٹیوں کی شادی نہیں ہوئی تھی...

ستمبر میں میں نے اس کو شہر کے مضافات میں ایک اسکول کی پہلی جماعت میں داخل کرادیا۔ ہفتہ بھر میں دفتر سے جلد اٹھتا رہا۔ میں چھٹی ہونے سے پہلے اسکول کے گیٹ کے سامنے پہنچ کر اس کا انتظار کرتا۔ مجھے خطرہ تھا کہ بچے اس کا مذاق اڑائیں گے۔

دوپہر میں وہ اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دیے، ستمبر کے جھلسا دینے والے آسمان کے نیچے میرے ساتھ ساتھ چلتا۔ بستہ اس کی پیٹھ پر جھول رہا ہوتا، ٹوپی اس کے ماتھے پہ اتری ہوئی ہوتی، ہونٹ نیم وا ہوتے۔ اس کی سانسوں کی مدھم آواز۔ اور اپنی داخلی بصیرت کے زاویے کو تبدیل کیے بغیر، عدم معروضیت سے، دنیا کا جائزہ لیتی ہوئی اس کی وہ شفاف نگاہیں۔

واقف کار اپنے ہیٹ اتار کر ہلاتے، میرے پاس آتے، مجھ سے ہاتھ ملاتے، جھک کر اس کا

ننھا سا ہاتھ تھام کر نرمی سے دباتے، مسکرانے کی کوشش کرتے۔ اس کی اوپر اٹھی ہوئی، خالی، بے رونق نگاہیں ان کو منجمد کر دیتیں۔ احمق، بالکل احمق، ضعیف العقل۔

ایک ہفتے بعد میں نے اس کو خود سے گھر پہنچنے دیا۔ میرا خوف بے جا تھا۔ بچوں کو اسے اپنے گروہوں سے دور رکھنے کی زحمت ہی نہیں اٹھانی پڑی۔ وہ تھا ہی الگ تھلگ، تنہا۔

اس سال میری لڑکیوں کی شادیاں ہو گئیں۔ دونوں کی ایک ہی دن، جیسے کسی عجلت میں۔ گویا کسی مجبوری کے تحت وہ گھر سے فرار ہونے پر تلی بیٹھی ہوں۔ وہ دونوں اس وقت کتنی کم عمر تھیں۔

وہ سال کیسی کشمکش میں گزرا۔ کوئی ہفتہ نہ جاتا تھا کہ گھر میں طرب و نشاط کی محفل نہ ہو۔ آنکھوں میں آنسو لیے، لڑکیاں مجھ سے تقاضا کرتیں کہ میں اسے مہمانوں سے چھپا کر رکھوں، اور میں اپنی کمزوری میں ان کی بات مان لیتا۔ میں اس کو لے کر باہر نکل جاتا، اور ہم دونوں گلیوں میں، میدانوں میں بھٹکتے، ساحل کے کنارے کنارے چلتے۔

ہم دونوں خاموش رہتے۔ ڈوبتے سورج اور شام کے پہلے ستاروں کو ابھرتا ہوا دیکھتے۔ بلکہ، میں دیکھتا اور وہ میرے ساتھ کھڑا ہوتا، ساکت، زمین پر نظریں گاڑے۔ لیکن پھر برسات شروع ہو گئی، میدان کیچڑ میں تبدیل ہو گیا؛ اور ہم دونوں گھر کے اندر قید ہو کر رہ گئے۔ لڑکیوں سے شادی کے طلبگار دونو جوان ہماری زندگی میں داخل ہو گئے تھے۔ پھر ان کے دوست، اور ان کے دوستوں کے دوست۔ گھر قہقہوں اور دھویں سے بھرا رہتا۔ شروع میں ہم نے اس کو ملازمہ کے کمرے میں چھپانے کی کوشش کی، لیکن جب اس کو وہاں نیند نہ آتی تو ہم خاموشی سے اس کو باورچی خانے میں پہنچا دیتے۔ وہ شب خوابی کے لباس میں بیٹھا رہتا اور لوگوں کو آتے جاتے دیکھا کرتا۔ اور پھر اٹھ کر برتن دھونے لگتا۔ پہلے تو اس نے صرف چمچے دھوئے، لیکن پھر ان لوگوں نے اس سے چھریاں بھی دھلوانا شروع کر دیں۔

آہستہ آہستہ اس کو ڈرائنگ روم میں داخل ہونے کی اجازت مل گئی، جہاں یہ سارا ہنگامہ بپا ہوتا۔ شروع شروع میں، وہ مہمانوں کو بسکٹ اور مٹھائی پیش کرتا رہا۔ رفتہ رفتہ جام انڈیلنے اور سگریٹ سلگانے کی پیشکش کرنے لگا۔ ابتدا میں لوگ اس کو دیکھ کر سمٹ سے جاتے۔ کمرے میں اچانک خاموشی چھا جاتی، ایک میٹھا سا خوف طاری ہو جاتا۔ ایک بیٹی کا منگیتر غصے میں اٹھ کر کھڑکی سے باہر اندھیرے میں تکنے لگتا۔ کمرے میں کوئی آواز سنائی نہ دیتی، جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ صرف بچے کی تیز، مضطرب

سانسیں خاموشی کو چیرا کرتیں، اور وہ ایک درد بھری سنجیدگی کے ساتھ ہاتھوں میں ٹرے اٹھائے ایک مہمان سے دوسرے مہمان کے پاس جاتا۔ کوئی اس کے ہاتھ سے بسکٹ یا مٹھائی لینے سے انکار نہ کرتا۔

آہستہ آہستہ لوگوں کو اس کی عادت ہوگئی۔ لڑکیوں کے دل پگھل گئے، اور وہ مہمانوں کے سامنے اس کی موجودگی کو برداشت کرنے لگیں۔ اس کی چھوٹی چھوٹی خدمات روزمرہ کا معمول بن گئیں۔ اور شام ڈھلے، جب مہمان تھک سے جاتے، اس کے چہرے پر ایک نئی دمک آ جاتی۔ کوئی مہمان، نشے میں مخمور، اس میں اچانک دلچسپی کا اظہار کرتا۔ اس کو اپنے قریب کھینچ کر بٹھالیتا، اور دیر تک اس سے باتیں کرتا۔ بچہ اس کے بازوؤں میں گھبراہٹ اور تناؤ سے لکڑی کی طرح اینٹھ جاتا، اس کی آنکھیں ویران ہو جاتیں۔ پھر وہ اٹھ کر راکھ دان خالی کرنے لگتا۔

ان گرمیوں کے آخر میں ہم دونوں گھر میں تنہا رہ گئے۔

اگست کے وسط کی ایک سہ پہر لڑکیوں کی شادی ہوگئی۔ نیلے آسمان تلے ہمارے باغ میں ایک بڑا سا چھتر لگا۔ مہمانوں کے قدموں کے نیچے کٹی ہوئی گھاس سرسرا رہی تھی۔ جذبات کی شدت سے میری سانس رکنے لگی تھی۔ میرے اندر کچھ ٹوٹ سا گیا تھا۔ پُرنم آنکھوں اور رُندھے ہوئے گلے کے ساتھ میں ہر ایک کو سینے سے لگاتا پھر رہا تھا، بوسے دے رہا تھا۔ بچہ شادی کی تقریب میں موجود نہ تھا۔ غالباً دولھا والوں میں سے کسی نے اس بات کا انتظام کر رکھا تھا کہ وہ وہاں موجود نہ رہے۔ اسے شام کو واپس گھر لایا گیا۔ جب آخری مہمان مجھ سے گلے ملنے کے بعد رخصت ہو رہے تھے تو اچانک میری نظر اس پر پڑی۔ وہ ایک لمبی میز کے قریب بیٹھا تھا۔ روزمرہ کے کپڑوں میں ملبوس، سوائے ایک سرخ ٹائی کے جو کسی نے اس کے گلے میں لٹکا دی تھی۔ کیک کا ایک بڑا سا ٹکڑا اس کے ہاتھوں میں تھما دیا گیا تھا۔ سنا ہوا میز پوش سرک کر اس کے گھٹنوں تک آ پہنچا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ منھ چلا رہا تھا، اور اس کی نظریں چنار کی شاخوں میں الجھے ہوئے زرد چاند پر منجمد تھیں۔

میں اس کے قریب گیا اور آہستگی سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

گھبراہٹ میں اس کے ہاتھوں سے کیک کا ٹکڑا چھوٹ گیا۔

میں نے کہا، ”چاند! کتنا خوبصورت چاند ہے...“

اس نے نگاہیں اٹھا کر چاند کی طرف یوں دیکھا جیسے زندگی میں پہلی بار چاند دیکھ رہا ہو۔

اور پھر ہم دونوں کی ایک دوسرے کی رفاقت میں زندگی کا آغاز ہوا۔ اس لمحے، اس ویران، خاموش گھر میں، بکھری ہوئی خوشبوؤں کی شیشیوں اور رومالوں کے سرسراتے ہوئے ٹکڑوں کے درمیان۔ میں ایک شاعر، جس کے لبوں پر مہر ثبت ہو چکی تھی، اور وہ ایک ضعیف العقل، تنہا بچہ۔

کیونکہ یہ اس کی تنہائی ہی تھی جس کے ساتھ اس نے میرا سامنا کیا۔

یہ بات میں اب سمجھ پایا ہوں۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ وہ اسکول میں بالکل تنہا تھا۔ پہلے ہی ہفتے میں اس نے کلاس روم کی آخری بنچ میں پناہ ڈھونڈ لی تھی۔ کلاس سے الگ تھلگ، وہ ہمیشہ کونے میں خاموش بیٹھا رہتا۔ استاد پہلے ہی اس کو لاعلاج قرار دے چکے تھے۔

اس کی تمام رپورٹوں میں درج ہوتا: ''جانچ ممکن نہیں''، اور صفحے کے کونے پر استاد کی جھجکتی ہوئی تحریر میں گھسیٹا ہوا دستخط ہوتا۔ مجھے آج تک حیرت ہے کہ وہ لوگ اسے ایک جماعت سے دوسری جماعت میں کیسے چڑھاتے رہے۔ کبھی کبھار وہ ایک ہی جماعت میں دو تین سال گزار دیتا، لیکن آخرکار اگلی جماعت میں پہنچ ہی جاتا۔ ہو سکتا ہے وہ مجھ پر عنایت کر رہے ہوں۔ ہو سکتا ہے ان میں کچھ استاد ایسے ہوں جنھیں میری پرانی نظمیں پسند ہوں۔

میں ان کا سامنا کرنے سے عموماً کتراتا۔

ان کی بھی پوری کوشش ہوتی کہ مجھ سے نظریں نہ ملنے پائیں۔

میں انھیں کوئی الزام نہیں دیتا۔

اگر ہمیں زبردستی ملنا ہی پڑتا، مثلاً یومِ والدین کے موقعے پر، تو میں ہمیشہ دیر سے اور سب سے آخر میں پہنچتا۔ اس وقت اسکول کی عمارت اندھیرے میں ڈوب چکی ہوتی، اور اندر ننگے بلبوں سے روشن خالی کمروں کے سامنے پڑی ہوئی کرسیوں میں تھکن سے چور استاد نیم دراز ہوتے۔

تب میں ہیٹ ہاتھ میں دبائے، چور کی طرح دروازے میں داخل ہوتا۔ اگر وہاں اس وقت کوئی نوجوان ماں باپ بیٹھے ہوتے، تو میری سفید چوٹی دیکھتے ہی اٹھ کھڑے ہوتے۔ (میں نے اب تک چوٹی رکھی ہوئی تھی۔) استاد مجھے دیکھ کر مریل سا ہاتھ مصافحے کے لیے بڑھاتے اور ایک کمزور سی مسکراہٹ چہرے پر لاتے۔

میں بیٹھ جاتا اور ان کا سامنا کرتا۔

وہ مجھے کیا بتا سکتے تھے جو میں پہلے ہی سے نہ جانتا تھا؟

کبھی وہ بھول جاتے کہ میں کون ہوں۔

''جی جناب؟ آپ کس بچے کے والد ہیں؟''

اور میں اس کا نام لیتا۔ میرے سینے میں اچانک ایک ٹیس سی اٹھتی۔

وہ اپنے کاغذات الٹتے، اس کی خالی رپورٹ نکالتے۔ آنکھیں بند کر کے اپنا سر ہاتھوں میں تھام لیتے اور مجھ سے سخت لہجے میں سوال کرتے: ''کب تک؟''

ان کا مطلب ہوتا کہ آخر وہ اسے کب تک اسکول میں رکھیں؟

میں خاموش رہتا۔

انھیں غصہ آجاتا۔ شاید باہر پھیلتا ہوا اندھیرا ان کی بے صبری میں اضافہ کر دیتا۔ وہ اصرار کرتے کہ میں اسے اسکول سے اٹھا لوں۔ اب وہ مزید یہ ذمے داری نہیں اٹھا سکتے۔ اٹھا کر کہاں لے جاؤں؟ انھیں نہیں معلوم۔ کہیں اور... شاید کوئی ادارہ اسے لے سکے۔

لیکن رفتہ رفتہ ان کے طیش میں کمی آجاتی۔ وہ اقرار کرتے کہ وہ خطرناک نہیں ہے۔ بے ضرر ہے۔ کلاس میں کسی کو پریشان نہیں کرتا۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ کلاس میں بالکل خاموشی سے بیٹھتا ہے اور توجہ سے استاد کی ہر بات سنتا ہے۔ بلکہ وہ ہوم ورک بھی کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

میرے ہاتھوں میں ہیٹ چرمرا کر ادھ موا ہو چکا ہوتا ہے۔ میں کن انکھیوں سے کلاس روم کی طرف دیکھتا ہوں۔ چھلکوں، پھٹے کاغذوں، اور چھلی ہوئی پنسلوں کے ٹکڑوں سے اٹا فرش، تختۂ سیاہ پر چاکوں سے بنائے ہوئے گل بوٹے اور تصویریں۔ آنسوؤں کے ننھے ننھے قطرے میری آنکھوں میں چبھنے لگتے ہیں۔ میں ان سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں بچے کی مدد کروں گا، ہر شام اس کو پڑھاؤں گا۔ کیونکہ ہمیں ہمت نہیں ہارنی چاہیے۔ کیونکہ بچہ آخر بورڈر لائن کیس ہی تو ہے۔

لیکن ہر شام گھر میں مجھ پر یاسیت چھا جاتی ہے۔ میں گھنٹوں کتابیں کھول کر اس کے ساتھ بیٹھا رہتا ہوں اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ وہ میرے قریب جنبش کیے بغیر، اکڑا بیٹھا رہتا ہے۔ میرے منھ سے نکلے الفاظ پانی میں مٹی کے تیل کی طرح تیرتے ہیں۔ آخر کار جب میں اس کو اٹھنے دیتا ہوں، وہ اپنے

کمرے میں جا کر آدھ گھنٹہ خود سے ہوم ورک کرنے میں گزار دیتا ہے۔ پھر وہ اپنی کتابیں بند کر کے بستے میں رکھ دیتا ہے۔

کبھی کبھی صبح کے وقت، جب وہ سو رہا ہوتا ہے، میں بستہ کھول کر اس کی کاپیاں دیکھتا ہوں۔ اس کے جوابات مجھے حواس باختہ کر دیتے ہیں: عقل سے بعید خیالات۔ حساب کی کاپی دیکھ کر میں بھونچکا رہ جاتا ہوں: جوش و خروش سے لکھے ہوئے عجیب و غریب اور غیر منطقی اعداد۔

لیکن میں کچھ نہیں کہتا۔ مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں۔ جب تک وہ صبح اٹھ کر خاموشی سے اسکول جاتا ہے، کلاس کی آخری بنچ پر بیٹھنے کے لیے، مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں۔

اسکول میں کیا ہوتا ہے، اس نے آج تک مجھے نہیں بتایا۔ اور نہ ہی میں نے پوچھا۔ وہ منھ سے ایک لفظ نکالے بغیر اسکول جاتا ہے، اور واپس آجاتا ہے۔ پانچویں یا چھٹی جماعت میں ایک مختصر سا وقفہ آیا تھا جب بچوں نے اسے تنگ کرنا شروع کر دیا۔ ایسا لگتا تھا گویا بچوں نے اسے اچانک دریافت کیا ہو، اور وہ مستعدی کے ساتھ اس کی دل آزاری میں لگ گئے۔ اس کی کلاس کے تمام بچے، لڑکیوں سمیت، وقفے کے دوران اس کے گرد گھیرا ڈال لیتے اور اس کے ہاتھ پیروں میں چٹکیاں کاٹتے، گویا اطمینان کرنا چاہتے ہوں کہ وہ گوشت پوست کا جسم رکھتا ہے، انسانی وجود رکھتا ہے۔ لیکن وہ اس کے باوجود اسکول جاتا رہا۔ واقعتاً میں مصر رہا کہ وہ برابر جاتا رہے۔

کچھ ہفتوں بعد بچوں نے اسے تنگ کرنا ترک کر دیا، اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

ایک دن جب وہ اسکول سے لوٹا تو شدتِ جذبات سے اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ اس کے ہاتھ چاک سے اٹے ہوئے تھے۔ میں نے سوچا، شاید اسے بلیک بورڈ کے سامنے بلایا گیا ہوگا، لیکن اس نے کہا، ''نہیں۔'' اس شام وہ خود میرے پاس آیا اور مجھے بتایا کہ اسے کلاس کا مانیٹر مقرر کیا گیا ہے۔

کچھ دن گزر گئے۔ میں نے اس سے پوچھا، کیا وہ اب تک مانیٹر ہے؟ اس نے اثبات میں جواب دیا۔ دو ہفتے بعد بھی اس کی تقرری برقرار تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ یہ ذمے داری نبھانے میں اسے مزہ آرہا ہے یا مشکل ہو رہی ہے۔ وہ بے حد مطمئن تھا۔ اس کی آنکھوں میں چمک آگئی تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات گمبھیر ہو چلے تھے۔ صبح اس کے بستے کی تلاشی لیتے ہوئے مجھے اکثر اس کے عجیب و غریب ہوم ورک کے علاوہ، چاک کے ٹکڑے اور بورڈ صاف کرنے والا کپڑا نظر آتا۔

میرا خیال ہے تب سے لے کر وہ اسکول کے آخری دن تک کلاس کا مانیٹر رہا، اور اسکول کے چوکیدار کے ساتھ کافی مانوس ہوگیا۔ آخری سالوں میں تو ان کی آپس میں ایک طرح سے دوستی بھی ہوگئی تھی۔ اکثر چوکیدار اسے اپنی کوٹھری میں بلاتا اور کسی استاد کا چھوڑا ہوا چائے کا کپ پیش کرتا۔ اس کا تو امکان کم ہی ہے کہ ان میں واقعی کبھی کوئی بات چیت ہوئی ہو، لیکن ایک طرح کا تعلق سا پیدا ہوگیا تھا۔

گرمیوں کی ایک شام میں اتفاقاً اس کے اسکول کے قریب آنکلا۔ میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ چوکیدار سے سلام دعا کرتا چلوں۔ گیٹ بند تھا۔ میں باڑھ کے ایک سوراخ سے راستہ بناتا اندر داخل ہوا، اور تاریک سنسان برآمدوں سے ہوتا ہوا چوکیدار کی کوٹھری تک جا پہنچا۔ یہ کوٹھری سیڑھیوں کے نیچے تھی۔ میں کوٹھری کو جانے والے زینے پر اترا تو وہ نظر آیا۔

وہ بستر پر ٹانگیں اوپر کیے بیٹھا تھا۔ کوٹھری کا باقی حصہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ پستہ قد، موٹا سا آدمی۔ وہ گھٹنوں پر رکھی ہوئی تانبے کی ٹرے کو پالش سے چمکا رہا تھا۔ میں ہیٹ اتار کر کوٹھری میں سکڑتا ہوا داخل ہوا اور بچے کا نام بدبدایا۔ وہ اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں، اور نہ میرے آنے پر کسی حیرت کا اظہار کیا۔ گویا اسے یقین تھا کہ میں ایک نہ ایک شام اس کے پاس ضرور آؤں گا۔ اس نے نظریں اٹھا کر مجھے دیکھا اور اچانک منھ سے ایک لفظ نکالے بغیر مسکرانے لگا۔ ایک خاموش مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی۔

''تم میرے بیٹے کو جانتے ہو؟'' میں نے کہا۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کے چہرے پہ اب تک مسکراہٹ تھی اور وہ ٹرے کو چمکائے جا رہا تھا۔

''کیسا لڑکا ہے وہ؟ اچھا بچہ...''

اس کی مسکراہٹ سرد پڑگئی۔ اس کے ہاتھ رک گئے۔ وہ کچھ بڑبڑایا اور اپنے سر کی طرف اشارے میں انگلی ہلائی۔

''بے چارہ بچہ... پاگل...'' اور میرے چہرے کو غور سے دیکھتا رہا۔

میں اس کے سامنے خاموش کھڑا رہا۔ میرا دل منجمد ہو چکا تھا۔ اس سے پہلے کبھی مجھے اتنی شدید مایوسی نہ ہوئی تھی جتنی اس لمحے ہوئی۔ چوکیدار دوبارہ پالش میں جٹ گیا۔ میں ایک لفظ کہے بغیر باہر نکل آیا۔

ان سب باتوں کا یہ مطلب نہیں کہ شروع ہی سے بچے کا خیال میرے دل و دماغ پر مسلط تھا۔

شاید معاملہ اس کے برعکس تھا۔ میں اس سے الگ تھلگ رہتا، غائب ذہن، دوسری چیزوں کے بارے میں سوچتا رہتا...

اپنے بارے میں...

اس سے پہلے میں اپنی ذات میں کبھی اس حد تک گم نہ ہوا تھا۔

پہلی چیز تو میری خاموشی تھی۔ میری ابدی خاموشی۔ ہاں، میں نے اسے برقرار رکھا تھا۔ اور یہ کوئی مشکل کام نہ تھا۔ میں نے ایک سطر تک نہ لکھی تھی۔ یہ سچ ہے کہ کبھی ایک مبہم سی آرزو میرے اندر انگڑائی لیتی کہ میں کچھ کہوں۔ اور میں خود سے سرگوشی کرتا، مثلاً خزاں۔ اور پھر، خزاں۔

بس، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

دوست میری سن گن لیتے۔ ''ناممکن،'' وہ کہتے، ''تم چپکے چپکے کچھ لکھ رہے ہو۔ کچھ کہتے رہتے ہو۔ تم ہم سب کو اپنی تخلیق سے اچانک حیران کرنا چاہتے ہو...''

اور میں جذباتی سا ہو جاتا۔ مسکراتا، اور کہتا، ''نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ میں جو کچھ کہنا چاہتا تھا، کہہ چکا۔''

پہلے تو انھیں میری بات پر شبہ رہا۔ لیکن رفتہ رفتہ یقین آ گیا۔ اور میری خاموشی کو لوگوں نے بالآخر خاموشی سے قبول کر لیا۔ صرف ایک دفعہ اس کا ذکر آیا۔ کسی نے (ایک نوجوان نے) ایک اخبار کے لیے شاعری پر ایک طرح کا جائزہ لکھا جس میں میرا نام بھی یونہی لے دیا، اور حقارت سے میری خاموشی کو بانجھ پن پر محمول کیا۔ ایک پیراگراف میں اس نے دو دفعہ میرے لیے یہ لفظ استعمال کیا: بانجھ۔

اور اس پر میرا تذکرہ ختم کر دیا۔

لیکن میں نے پروا نہ کی۔ میں پُرسکون رہا۔

میرے اطراف یہ ویرانہ....

بنجر صحرا...

چٹانیں اور راکھ...

دوسری چیز یہ کہ مجھے بڑھاپے نے آ لیا تھا۔ میں نے کبھی نہ سوچا تھا کہ یہ حال ہو جائے گا۔ جب

تک میں شہر میں گھومتا ہوں سکون سے رہتا ہوں۔ لیکن شام کو کھانے کے بعد جب ہاتھ میں کتاب یا اخبار تھامے، آرام کرسی میں دھنس جاتا ہوں تو کچھ دیر بعد مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے مجھ پر فالج گر پڑا ہو، جیسے میں تقریباً ختم ہو چکا ہوں۔ میں کوشش کر کے کرسی سے اٹھتا ہوں، بڑی مشکل سے لباس تبدیل کر پاتا ہوں۔ میری بوڑھی ٹانگیں کپکپاتی ہیں۔ اپنی بے جان ٹانگوں کو گھسیٹتا، بستر میں آ گرتا ہوں، لحاف میں دبک کر گول مول ہو جاتا ہوں۔ اس تمام جدو جہد میں کتابیں گر کر اِدھر اُدھر بکھر جاتی ہیں۔ یہ وہ جاسوسی ناول ہیں جن کو میں پچھلے دنوں سے بے حد دلچسپی کے ساتھ پڑھنے لگا ہوں۔

گھر خاموشی میں ڈوبا ہوتا ہے۔ ایک بھولا بھٹکا نغمہ ریڈیو سے پھوٹتا ہے۔ میں کتاب پڑھتا ہوں۔ اور آہستہ آہستہ، انجانے میں، کائی جمی چٹان میں تبدیل ہو جاتا ہوں۔ آدھی رات کو ریڈیو خاموش ہو جاتا ہے اور کتابیں میرے گھٹنوں سے پھسل کر نیچے گر جاتی ہیں۔ مجھے ریڈیو بند کرنا ہے اور بتی بجھانی ہے۔ تب وہ بھیانک لمحہ آتا ہے، خوف کا وقت۔ میں بستر سے ایک بے جان لاش کی طرح نیچے گر جاتا ہوں۔ درد سے ادھ موا، گھسٹتا ہوا، جسم میں بچی کھچی طاقت کے ساتھ سوئچ تلاش کرتا ہوں۔

ایک مرتبہ، آدھی رات کو میں نے ہال میں اس کے قدموں کی چاپ سنی۔ میں یہ بتاتا چلوں کہ اس کو بڑی بے سکون نیند آتی تھی۔ اس کو ڈراؤنے خواب نظر آتے تھے۔ خواب، جنھیں وہ بیان نہ کر سکتا تھا۔ رات کو مدھم سی روشنی اس کے بستر کے قریب جلتی رہتی، اور جب اس کی آنکھ کھلتی، وہ سیدھا باورچی خانے کے نل کے قریب جاتا اور کئی گلاس پانی کے چڑھا جاتا جس سے اس کے خوف میں کمی آتی۔

اس رات جب وہ پانی پی کر واپس جا رہا تھا تو میں نے اسے آواز دے کر کمرے میں بلایا اور بتی بجھانے اور ریڈیو بند کرنے کے لیے کہا۔ مجھے آج بھی تاریک گزرگاہ میں کھڑا اس کا وہ ہیولا یاد ہے۔ اس لمحے اچانک مجھے احساس ہوا تھا کہ وہ بڑا ہو گیا ہے۔ اس کے جسم پر گوشت چڑھ چکا تھا۔ پشت پر پڑتی ہوئی روشنی اس کے نیم وا دہانے کے سائے کو واضح کر رہی تھی۔

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔

اگلی رات اس نے پھر آدھی رات کے قریب گھر میں ٹہلنا شروع کر دیا۔ مجھے اس کے قدموں کی آہٹ کا انتظار تھا۔ میں نے ایک دفعہ پھر بتی بجھانے کے لیے اسے اندر بلایا۔

اور اس کے بعد ہر رات...

اس طرح اس کی خدمتوں نے مجھے گھیرنا شروع کر دیا۔ میں ان پر انحصار کرنے لگا۔ یہ سلسلہ رات کو بتی بجھانے اور ریڈیو بند کرنے سے شروع ہوا اور دوسرے کئی کاموں تک پھیل گیا۔ کیا عمر تھی اس کی؟ تیرہ سال کا ہوگا، میرا خیال ہے...

ہاں، اب مجھے یاد آیا۔ اس کی تیرھویں سالگرہ انھی دنوں پڑنے والی تھی اور میں نے فیصلہ کیا تھا کہ اس دفعہ اس کی سالگرہ مناؤں گا۔ کیونکہ اب تک میں اس کی سالگرہ پر خاموشی اختیار کرتا چلا آیا تھا۔ میں نے ایک عمدہ، فیاضانہ سی پارٹی دینے کا تہیہ کیا۔ میں نے اس کے کلاس ٹیچر سے بات کی اور دوسرے اساتذہ کو بھی مدعو کیا۔ اس کی جماعت کے سارے بچوں کو دعوت نامے بھیجے۔

یہ سچ ہے کہ اس کی کلاس میں تمام بچے عمر میں اس سے چھوٹے تھے۔ بہ مشکل گیارہ سال کے ہوں گے...

سالگرہ کے دن، ہفتے کے روز صبح بڑی دیر سے، ایک کٹھن انتظار کے بعد، دس کھسر پھسر کرتے لڑکوں کا ایک گروہ ہمارے گھر میں نمودار ہوا۔ ہر لڑکے کے ہاتھ میں سفید کاغذ بندھا ایک چھوٹا سا پیکٹ تھا۔ ایک بھی استاد نے آنے کی زحمت نہ کی تھی۔ اور نہ کلاس کی کوئی لڑکی آئی تھی۔

بے حد بوکھلاہٹ میں ان سب نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ وہ میرے سفید بالوں کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ (ایک لڑکے نے سرگوشی میں پوچھا: ''کیا یہ اس کا دادا ہے؟'') خائف سے وہ ہمارے گھر کے اندر داخل ہوئے جہاں وہ پہلے کبھی نہ آئے تھے۔ انھوں نے مجھے غور سے دیکھا اور دیر تک میری حرکات کا مشاہدہ کرتے رہے۔ اور جب انھوں نے مجھے بظاہر صحیح العقل پایا تو اطمینان کا سانس لیا۔

تحفے کھولے گئے۔

معلوم ہوا سب ایک ہی چیز تحفے میں لائے تھے۔ پنسلوں کا سستا سا ڈبا۔ تمام پیکٹوں سے یہی نکلا، سوائے ایک کے۔ وہ گھونگھریالے بالوں والا، کمزور، شاعر قسم کا بچہ ایک پرانا زنگ آلود جیبی چاقو لایا تھا۔ وہ ایک بڑا سا چاقو تھا جس کے کئی پھل تھے۔ تمام بچوں نے اس چاقو کو تحسین آمیز نظروں سے دیکھا۔

سارے تحفے روایتی مبارک باد کے رقعوں کے ساتھ پیش کیے گئے تھے۔ جیبی چاقو والے شاعر بچے نے چند دلچسپ اشعار بھی لکھے تھے۔

شدید اضطراب میں، اس نے خاموشی سے تحفے قبول کیے۔

مجھے حیرت تھی کہ ایک بچہ بھی کتاب تحفے میں نہ لایا تھا۔

جیسے انھیں خوف ہو کہ وہ پڑھ نہ سکے گا...

میں نے ہر ایک کی آؤ بھگت کی۔ سب کو کیک، سینڈوچ، ٹافیاں، شربت اور آئس کریم پیش کی۔ وہ ڈرائنگ روم میں بکھرے ہوئے بیٹھے تھے، آرام کرسیوں اور صوفوں میں دھنسے ہوئے، خاموشی سے ٹافیاں چباتے ہوئے۔ ان کی آنکھیں مسلسل گردوپیش کا جائزہ لیتی رہیں، جیسے انھیں کچھ شبہ ہو۔ کبھی کبھار اچانک دو تین بچے ٹھی ٹھی کرنے لگتے، بغیر کسی وجہ کے۔

میرا بیٹا کمرے کے کونے میں تنہا بیٹھا تھا۔ جس کے اعزاز میں وہ تقریب منعقد کی گئی تھی، اس تقریب میں وہ ایک ملاقاتی کی طرح الگ تھلگ بیٹھا تھا۔ اس کے بھی منہ میں کچھ تھا، لیکن اس کی نظریں نیچی تھیں۔

میں نے سوچا شاید میری موجودگی سے بچے جھجک رہے ہوں، لہٰذا کمرے سے باہر نکل آیا۔ اور واقعی جیسے ہی میں باہر آیا، کمرے میں قہقہے ابلنے لگے۔ جب میں تھوڑی دیر بعد واپس آیا تو دیکھا وہ سب جوتے اتارے ہوئے، قالین اور صوفوں پر اچھل کود رہے تھے۔ وہ وہاں موجود نہ تھا۔ میں اس کی تلاش میں کمرے سے نکلا۔ وہ باورچی خانے کی بالکنی میں بیٹھا لڑکوں کے جوتے صاف کر رہا تھا۔

''میں مانیٹر ہوں،'' اس نے کہا۔ اور اس طرح اس کی سالگرہ کی تقریب اختتام کو پہنچی۔ ان کے کپڑے کھیل کود سے گندے ہو چکے تھے۔ ہنسی دباتے ہوئے، انھوں نے جوتے پہنے، ایک ایک کر کے مجھ سے ہاتھ ملائے اور رخصت ہوئے۔ اپنے پیچھے پنسلوں کے نو ڈبے چھوڑ گئے۔ جہاں تک جیبی چاقو کا تعلق ہے، جو سب کو اتنا پسند آیا تھا، وہ ننھے شاعر نے میرے بیٹے سے ایک ہفتے کے لیے ادھار مانگ لیا۔ اور کبھی واپس نہ کیا۔

میں اپنے دفاع میں یہ تمام تفصیلات بتا رہا ہوں۔ کیونکہ چند ہفتوں بعد وہ میرے بھی جوتوں پر پالش کرنے لگا۔ میں جوتے بالکنی میں چھوڑ دیتا، اور ان پر پالش ہو چکی ہوتی۔ وہ بڑے شوق سے یہ کام کرتا تھا، بغیر کسی تردد کے۔ یہ ایک معمول بن گیا، میرا اور اس کا معمول۔ اور پھر اسی طرح کئی معمول بنتے چلے گئے۔

مثلاً میرے جوتے اتارنا۔ میں سہ پہر کے بعد دفتر سے گھر لوٹتا ہوں۔ ہال میں رکھی ہوئی بنچ پر بیٹھ کر اپنی ڈاک کھولتا ہوں۔ وہ کمرے سے نمودار ہوتا ہے، میرے قدموں میں بیٹھ جاتا ہے، فیتے کھولتا ہے، جوتے اتارتا ہے اور میرے پیروں میں سلیپر ڈالتا ہے۔

اس سے مجھے آرام ملتا ہے۔

اچانک مجھ پر انکشاف ہوتا ہے کہ میری ڈھلتی ہوئی طاقت کے مقابلے میں اس کے بازوؤں میں قوت ہے۔ جب بھی مجھ سے کسی مرتبان کا ڈھکن نہیں کھلتا، دیوار سے کیل نہیں نکلتی، میں اس کو بلاتا ہوں۔ اس سے کہتا ہوں، ''تم جوان ہو، طاقتور ہو، میں کمزور ہوتا جا رہا ہوں، بہت جلد میں ختم ہو جاؤں گا۔''

لیکن مجھے اس سے مذاق نہیں کرنا چاہیے۔ وہ ٹھٹھول کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ وہ ششدر کھڑا رہ جاتا ہے۔ اس کا چہرہ ویران ہو جاتا ہے۔

وہ کوڑے کی بالٹی خالی کرنے کا عادی ہے۔ یہ وہ آٹھ سال کی عمر سے کرتا چلا آ رہا ہے۔ وہ میرے چھوٹے موٹے کام کرتا ہے، سگریٹ لانا، اخبار خریدنا۔ اس کے پاس کافی وقت ہوتا ہے۔ وہ ہوم ورک میں آدھے گھنٹے سے زیادہ نہیں لگاتا۔ اس کا کوئی دوست نہیں۔ وہ کچھ نہیں پڑھتا۔ بس کرسی میں دھنسا، گھنٹوں دیوار کو گھورتا رہتا ہے۔ ہم ایک خاموش سے محلے میں رہتے ہیں۔ کھڑکی میں صرف درخت نظر آتے ہیں اور ایک باڑھ۔ یہ ایک پرسکون سی گلی ہے۔ اس کے لیے کرنے کو ہے ہی کیا؟ جانوروں سے اسے دلچسپی نہیں۔ میں نے اسے ایک مرتبہ کتے کا پلّا لا کر دیا لیکن وہ ایک ہفتے کے اندر ہی اسے کھو بیٹھا، اور کسی افسوس کا اظہار نہ کیا۔ اس کے لیے کرنے کو ہے ہی کیا؟ میں اسے گھر کی صفائی کرنا سکھاتا ہوں۔ اسے بتاتا ہوں کہ کون سی چیز کہاں رکھنی چاہیے۔ وہ آہستہ آہستہ سمجھ جاتا ہے اور الماری میں میرے کپڑے تہہ کر کے سلیقے سے رکھنا سیکھ لیتا ہے۔ فرش پر بکھرے ہوئے اخبار اور کتابیں اکٹھا کرتا ہے۔ صبح جاتے ہوئے میں شب خوابی کا لباس بستر پر چھوڑ جاتا ہوں۔ جب واپس آتا ہوں تو ہر چیز قاعدے قرینے سے اپنی جگہ رکھی ملتی ہے۔

کبھی مجھے یوں لگتا ہے جیسے کسی سفر کے لیے میری تمام چیزیں تیار رکھی ہوں۔ بس صرف ایک سوٹ کیس کھولنے کی دیر ہے، اس میں محنت سے تہہ کیے ہوئے کپڑے ڈالوں اور چل پڑوں۔ ایک دن مجھے ایک مختصر سے سفر پر شمال جانا پڑ گیا۔ اس کو بتانے کے آدھ گھنٹے کے اندر اندر اس نے میرا سوٹ

کیس تیار کر کے دروازے پر رکھ دیا تھا۔ اور میری چھڑی بھی تیار تھی۔

ہاں، پچھلے چند دنوں سے میں چھڑی استعمال کرنے لگا ہوں، گو کہ ابھی مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ جب میں گلی میں لوگوں سے باتیں کرنے کے لیے رکتا ہوں تو زمین میں کسی مناسب درز میں چھڑی اٹکا کر اپنا پورا وزن ڈال کر کھڑا ہوتا ہوں۔ وہ وقتاً فوقتاً چھڑی کی نوک تیز کرتا رہتا ہے تاکہ مجھے اس کام میں آسانی رہے۔

میرے آرام کے لیے وہ اتنی باریکیوں میں جاتا ہے۔

ان دنوں اس نے کھانا پکانا سیکھ لیا تھا۔ اس کام نے عمر رسیدہ ملازمہ سے سیکھا تھا جو کبھی کبھار صفائی کے لیے آتی تھی۔ شروع میں تو اس نے صرف اپنے لیے پکانا شروع کیا جو وہ میرے آنے سے پہلے ہی اکیلے بیٹھ کر کھالیتا تھا۔ لیکن کچھ عرصے بعد اس نے میرے لیے بھی پکانا شروع کر دیا۔

مختصر، سادہ سا کھانا؛ اتنا خوش ذائقہ تو نہیں لیکن سلیقے سے پیش کیا ہوا۔ اس نے دوچھتی سے ایک پرانا ڈنر سیٹ ڈھونڈ نکالا تھا۔ وہ شادی کا تحفہ تھا۔ یہ کافی بڑا سیٹ تھا جس میں مختلف سائز اور انواع و اقسام کے سنہری کناروں والے ڈونگے اور قابیں تھیں جن میں خوشنما پھول، تتلیاں، اور پروں والے ننھے منے بچے بنے ہوئے تھے۔ وہ یہ سیٹ استعمال میں لانے لگا۔ وہ میرے سامنے پانچ مختلف سائز کی پلیٹیں رکھتا، بہت سارے چھری کانٹے سجاتا اور مصر انداز میں میرے سامنے بیٹھ کر مجھے کھانا کھاتے دیکھتا۔

اس نے یہ سب کہاں سے سیکھا تھا؟

معلوم ہوا، ایک بادشاہ کی ضیافت کی کہانی کلاس میں پڑھ کر سنائی گئی تھی۔

میں چونک پڑتا ہوں۔ ''کون سا بادشاہ؟''

اسے نام یاد نہیں۔

''کہانی کے دوسرے ہیرو؟''

اسے یاد نہیں۔

میں اس سے کہتا ہوں کہ کم از کم کہانی ہی سنادے۔

وہ شروع کرتا ہے لیکن پھر ایک دم خاموش ہو جاتا ہے جیسے کہانی اس کے ذہن میں گڈمڈ ہو گئی ہو۔

اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ اس کے رخساروں پر بلوغت کے پہلے مہاسے نکل رہے ہیں۔

مجھے خیال آتا ہے: اس کو اگر اس وقت دوسرے زاویے سے دیکھا جائے تو دیکھنے والے کو اس کا چہرہ دیکھ کر خوف آ جائے۔

رات میں وہ مجھے ٹب کا غسل لینے میں مدد دیتا ہے۔ میں بیٹھ کر صابن ملوانے کے لیے اسے آواز دیتا ہوں، اور وہ دبے پاؤں غسل خانے میں داخل ہوتا ہے۔ پانی میں میری برہنگی سے ہیبت زدہ، وہ اسفنج اٹھاتا ہے اور احتیاط سے میری گردن پر ملنا شروع کرتا ہے۔

جب میں اس کی کوئی خدمت کرنا چاہتا ہوں تو مجھے کبھی کامیابی نہیں ہوتی۔ دفتر سے واپسی پر مین اعلان کرتا ہوں: ''آج کھانا میں پکاؤں گا!'' مگر کھانا تیار ہو چکا ہوتا ہے۔ میں اسے غسل میں مدد دینا چاہتا ہوں۔ پتا چلتا ہے وہ پہلے ہی نہا دھو چکا ہے۔

لہٰذا میں رات کو اسے اپنے دوستوں کے پاس لے چلتا ہوں، فنکاروں کے جلسوں اور ادبی محفلوں میں لے جاتا ہوں، کیونکہ میں اب تک کئی انجمنوں کا ممبر ہوں۔ اس طرح میں نے لوگوں کو اس کی موجودگی کی عادت ڈلوادی ہے اور اب وہ اس کا کوئی نوٹس نہیں لیتے، جیسے اب میں ان کے سایوں کو نوٹ نہیں کرتا۔

وہ ہمیشہ آخری صف میں بیٹھتا ہے، دیر سے آنے والوں کے لیے دروازہ کھولتا ہے، کوٹ اتارنے میں ان کی مدد کرتا ہے اور کوٹوں کو ٹانگتا ہے۔ لوگ اسے خدمت گار سمجھتے ہیں۔ اور واقعتاً وہ خدمت گاروں ہی کے ساتھ رہتا ہے۔ میں اکثر اسے گیٹ کیپروں کے نزدیک، سنجیدگی سے ان کی باتیں سنتے ہوے، کھڑا پاتا ہوں۔ ایک آدھ دفعہ میں نے اسے صفائی کرنے والی عورت سے بات کرتے دیکھا جو اپنی جھاڑو اٹھائے کھڑی تھی۔

وہ اس سے کیا بات کرتا ہے؟ میں آج تک نہیں بوجھ پایا ہوں۔

کیا وہ مجھ سے محبت کرتا ہے؟ کون کہہ سکتا ہے۔ لگتا ہے میرے رویے میں کوئی ایسی بات ہے جو اسے خوفزدہ کر دیتی ہے۔ شاید میری عمر، یا میری خاموشی۔ جو کچھ بھی ہو، وہ میری موجودگی میں یوں سہما رہتا ہے جیسے اسے کسی بھی وقت چانٹا پڑنے کی توقع ہو۔

حیرت ہے۔ کیونکہ ہم دونوں کے درمیان صلح وامن ہے۔ دن سکون سے گزر رہے ہیں۔ اور میرا خیال تھا یہ سکون، یہ خاموشی زندگی بھر رہے گی۔ میرا مطلب ہے جب تک ہم دونوں کا ساتھ ہے۔ میں سوچتا تھا میں کتنا خوش نصیب ہوں کہ اپنی اس خاموشی کے دوران میرا واسطہ ایک کند ذہن لڑکے سے ہے، وہ جو خردوجنوں کی سرحد پر ہے، مجھ سے دور۔

یہ سچ ہے کہ کبھی کبھی میرے اندر ایک خواہش جاگتی ہے کہ میں کسی سے چمٹ جاؤں۔ اور پھر میں یروشلم بھاگتا ہوں، گھنٹے دو گھنٹے کے لیے بیٹیوں کے پاس چلا جاتا ہوں۔ وہ میری اچانک آمد سے حیران رہ جاتی ہیں۔

وہ مجھ سے محبت سے ملتی ہیں، میری گردن میں جھول جاتی ہیں، مجھ سے بغل گیر ہوتی ہیں۔ اور جب ہم ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے کھڑے ہوتے ہیں، ان کے شوہر یہ منظر دیکھتے ہیں۔ ان کی نگاہوں میں ہلکی سی حقارت ہوتی ہے۔ پھر ہم بیٹھ کر گپ شپ کرتے ہیں، لفظوں سے کھیلتے اور شگوفے چھوڑتے ہیں۔ بذلہ سنجی کے اس مظاہرے سے ان کے شوہروں کو سخت بیزاری ہوتی ہے، لیکن وہ اس بیزاری کا اظہار لفظوں میں نہیں کرتے، شکایت کا ایک لفظ بھی زبان پر نہیں لاتے۔ کیونکہ انھیں اچھی طرح معلوم ہے کہ میں زیادہ دیر نہیں ٹھہروں گا۔ اگر میں ہوا کے گھوڑے پر سوار آتا ہوں تو رخصت بھی اسی طرح ہوتا ہوں۔ ایک دو گھنٹے بعد میں اٹھ کھڑا ہوتا ہوں، اپنی آرزو کی تلچھٹ دل میں لیے۔ وہ سب مجھ سے کچھ دیر اور رکنے کو کہتے ہیں، رات گزارنے پر اصرار کرتے ہیں، لیکن میں کبھی نہیں ٹھہرتا۔ مجھے بیٹے کے پاس جانا ہے، میں دلیل دیتا ہوں؛ گویا اس کے وجود کا انحصار میری موجودگی پر ہو۔ ہم ایک دوسرے سے دوبارہ لپٹ کر پیار کرتے ہیں۔ پھر ان کے شوہر مجھے اسٹیشن تک چھوڑنے آتے ہیں۔ اس وقفے میں ہمارے درمیان شاذونادر ہی بات ہوتی ہے۔ ہمارے پاس ایک دوسرے سے کہنے کو کچھ نہیں ہوتا۔ اور پھر میں ان کی نظروں میں مشکوک ہوں۔ میری پشت پر بل کھاتی ہوئی یہ سفید چوٹی، اور میرے ہاتھوں میں لہراتی ہوئی یہ چھڑی۔ میں اب تک ان کی نظروں میں ایک شاعر ہوں۔ میرے مجموعے، مجھے معلوم ہے، ان کے ڈرائنگ روم کی الماری میں نمایاں جگہ پر رکھے ہوئے ہیں۔ میں کیا کر سکتا ہوں؟

ایسے موقعوں پر مجھے اپنے بیٹے کا بے وقوف سا چہرہ ہی پسند ہے۔

سردیوں میں اکثر میں گھر کی چٹخنیاں شام چھ بجے ہی چڑھا لیتا ہوں۔ اور پھر سونے کے وقت

تک کیا کرتا ہوں؟ اخبار پڑھتا ہوں، ریڈیو سنتا ہوں، کتابوں کی ورق گردانی کرتا ہوں۔ وقت گزرتا جاتا ہے اور میں خلوت میں بوریت سے مول تول کرتا رہتا ہوں۔

گرمیوں میں میں ساحل پر ٹہلتا ہوں، یا سڑکوں پر آوارہ گردی کرتا ہوں۔ اکثر میں کسی تعمیر ہوتی ہوئی عمارت کے سامنے رک جاتا ہوں اور سوچ میں ڈوبا گھنٹوں کھڑا رہتا ہوں۔

فضول خیالوں میں گم...

برسوں پہلے، میں جہاں کہیں بھی جاتا اپنے ساتھ ایک چھوٹی سی بیاض رکھتا۔ پاگلوں کی طرح، جیسے کسی بخار میں پھنکتا ہوا، تخلیق کے شعلوں کو ہوا دیا کرتا۔ شعر جوڑتا، قافیے ملاتا، لفظوں کو الٹا پلٹتا۔ اور آج کل...کوئی ہوک نہیں اٹھتی۔

وہ کہاں ہے؟

میں کھڑکی سے باہر جھانکتا ہوں۔ وہ باغ میں ہے۔ ایک سونی خزاں کے آسمان کے نیچے، وہ درختوں اور جھاڑیوں کی وحشیانہ طریقے سے کاٹ چھانٹ کر رہا ہے، پوری پوری شاخیں اڑا رہا ہے، پتوں کو نوچ رہا ہے۔ سب سے زیادہ جھنجھلاہٹ اسے پرانے چنار کے درخت پر ہے۔ اس کے تنے کے قریب پھوٹتی شاخوں کو وہ بے رحمی سے اڑا رہا ہے، درخت پر چڑھ کر اس کی پھیلتی ہوئی سب شاخوں کو کاٹ رہا ہے۔ درخت اس کے بوجھ سے جھکتا ہے، اور کراہتا ہے۔

کبھی کبھی میری آنکھیں گھنٹوں اس پر لگی رہتی ہیں، اور میں کوشش کے باوجود اس پر سے نظریں نہیں ہٹا پاتا۔ اس کی پُرعزم گمبھیرتا، اس کی تندی۔ شام کے سائے اس کے چہرے پڑ رہے ہیں۔ اور وہ احمقانہ حد تک بڑھا کو لگ رہا ہے، اس موٹے شیشوں کی عینک کی وجہ سے، جو اس نے حال ہی پہننا شروع کی ہے۔ اس کی دور کی نظر کمزور ہے۔

مجھے معلوم ہے وہ ضرورت سے زیادہ کاٹ چھانٹ کر رہا ہے، اپنی تندی میں پودے جڑوں سمیت اکھاڑ کر پھینک رہا ہے۔ لیکن میں پھر بھی اس کو نہیں روکتا۔ کھڑکی میں خاموش کھڑا دیکھتا رہتا ہوں۔ اپنے آپ سے کہتا ہوں: ''جو پودے بچیں گے، وہ بہار میں پھول دیں گے اور اس نقصان کا ازالہ ہو جائے گا۔''

پہلی دفعہ اسے کب پتا چلا تھا کہ میں شاعر ہوں؟ میرا مطلب ہے یہ جو پاگل پن ہے جس نے ہم دونوں کو پچھلے ایک سال سے اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔

پچھلی سردیوں کے آخر میں میں بیمار پڑ گیا۔ میں نے اسکول سے کچھ دنوں کے لیے اس کی چھٹی کروادی تا کہ وہ میری تیمارداری کر سکے۔ کئی دنوں تک ہم تمام وقت مسلسل ایک ساتھ رہے۔ وہ میرے پاس سے ہلا تک نہیں۔ اس سے پہلے کبھی ایسا نہ ہوا تھا؛ کوئی دن نہ جاتا تھا جب میں شام کو باہر نہ نکلتا، آوارہ گردی کے لیے، لوگوں سے ملنے کے لیے، کیفے میں بیٹھنے کے لیے۔

میں بستر میں پڑا بخار میں پھنک رہا تھا۔ وہ گھر میں ٹہلتا یا اپنی نظریں مجھ پر جمائے، میرے کمرے کے دروازے پر بیٹھا رہتا۔ کبھی میں اس سے چائے مانگتا، اور وہ اٹھ کر باورچی خانے جاتا اور میرے لیے گرم گرم چائے کا کپ لاتا۔

شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ سرمئی آسمان نے کھڑکیوں کو ڈھانپ دیا تھا۔ ہم نے گھر کی بتیاں روشن نہیں کی تھیں کیونکہ بیماری سے میری آنکھیں بے حد حساس ہو گئی تھیں۔

ہمارے درمیان بے پایاں خاموشی تھی۔ کیا میں اس سے کوئی بات کر سکتا تھا؟

کیا اس نے ہوم ورک کر لیا ہے؟

اس نے کمرے کے دوسرے کنارے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

میں اس سے کیا بات کر سکتا تھا؟

میں نے اس سے پوچھا، کیا وہ اب تک کلاس کا مانیٹر ہے؟ اس نے گردن کی جنبشوں سے ہاں اور نہیں میں جواب دیا۔

آخر میں تھک گیا اور اپنا سر تکیے پر گرا کر آنکھیں موند لیں۔ کمرہ اندھیرے میں ڈوب گیا۔ باہر پھوار پڑنے لگی۔ ان دنوں بیماری کے دوران میرے ذہن نے اِدھر اُدھر بھٹکنا شروع کر دیا تھا۔ عجیب و غریب خیالات آیا کرتے۔ میں بستر کے بارے میں تصور کرتا کہ وہ سفید، وسیع پہاڑوں اور تند دریاؤں کی ایک ہیبت ناک سرزمین ہے، اور میں اس کی کھوج میں ہوں۔

اور پھر گمبھیر سکوت۔ میرے جسم کے ہر خلیے کو اپنی لپیٹ میں لیتی ہوئی بستر کی وہ گرمی۔

اور اس رِستی ہوئی خاموشی میں اس کی کھردری آواز نے مجھے چونکا دیا۔

''بابا، تم کیا کرتے ہو؟''

میں نے آنکھیں کھولیں۔ وہ دروازے کے پاس بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں مجھ پر تھیں۔

حیرت زدہ، میں نے تکیے کے سہارے اٹھنے کی کوشش کی۔

''کیا؟ کیا مطلب ہے تمھارا؟ کیا کرتا ہوں؟ ابھی؟ میں اونگھ رہا ہوں...''

''نہیں۔ عام طور پر...'' اور اس نے دوسری طرف منھ پھیر لیا، جیسے یہ سوال کر کے شرمندہ ہو۔

مجھے اس کا سوال سمجھنے میں کچھ دیر لگی۔ وہ میرے کام کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔

کیا کلاس میں پیشوں کے بارے میں گفتگو ہوئی تھی؟

اسے معلوم نہیں۔

میں اسے اپنے کام کے بارے میں بتاتا ہوں۔ (میں اخبار کے تراشے جمع کرنے والے ایک دفتر میں ملازم ہوں۔) اس کی سمجھ میں نہیں آتا۔ میں تفصیل سے اس کو اپنے کام کے بارے میں بتاتا ہوں۔ لیکن اچانک وہ میرے کام کی نوعیت کو سمجھ جاتا ہے۔ اس پر کوئی ردعمل نہیں ہوتا۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ کچھ مایوس ہوا ہو۔ میں سمجھ نہیں پاتا کیوں۔ اس کے کمزور ذہن میں یہ خیال تو نہیں آسکتا تھا کہ میں پائلٹ یا جہاز کا کپتان ہوں۔ کیا اس کا خیال تھا میں ہوائی جہاز اڑاتا ہوں؟ جہاز رانی سے متعلق ہوں؟

نہیں۔

پھر، اس نے کیا سوچا تھا؟

اس نے کچھ نہیں سوچا تھا۔

دوبارہ سکوت ہوجاتا ہے۔ وہ کونے میں گم سم، اداس بیٹھا ہے۔ اس کی عینک شام کے دھندلکے میں چمک رہی ہے۔ بارش اب تیز ہوگئی ہے۔ بوڑھا چنار باغ میں سہا کھڑا ہے، آنسوؤں میں بھیگا ہوا۔ اچانک مجھ سے اس کا غم برداشت نہیں ہو پاتا۔ میں بستر میں اٹھ کر بیٹھتا ہوں۔ اندھیرے میں میری آنکھیں پوری کھل جاتی ہیں، اور میں اس سے سرگوشی میں کہتا ہوں: ''درحقیقت میں کچھ اور بھی کرتا تھا۔ میں شاعری کرتا تھا۔ تمھارا باپ کبھی ایک شاعر تھا۔'' میں ہیجانی کیفیت میں پلنگ سے اٹھ کھڑا ہوتا ہوں۔ کتابوں کے طاقچے کے پاس جاتا ہوں اور ایک ایک کر کے اپنے مجموعے نکالتا ہوں۔

وہ مجھے خاموشی سے دیکھتا ہے۔ اس کی عینک ناک پر کھسکی ہوئی، اس کے بازو کرسی کے ہتھے پر

بے جان سے پڑے ہوے۔

میں اس کی کلائی پکڑ کر، گھسیٹ کر اپنے سامنے کھڑا کرتا ہوں۔ میں خشک ہاتھوں سے اپنی کتابوں کے صفحے کھولتا ہوں۔ چھوٹے چھوٹے خشک صفحات، جن کو مدتوں سے چھوا نہ گیا تھا، میرے ہاتھوں میں ہلکے سے سرسراتے ہیں۔ بوسیدہ کاغذ پر الفاظ کی سیاہ لکیریں سامنے لہراتی ہیں۔ الفاظ: خزاں، بارش، ترکاری۔

اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ وہ ساکت ہے، نظریں جھکائے، خاموش۔ بالکل غبی۔

میں نے اسے کمرے سے باہر بھیج دیا، اور اپنی کتابوں کو بانہوں میں بھر کر پلنگ پر لے آیا۔ رات گئے تک میرے کمرے کی بتی روشن رہی، اور میں تمام رات چاہت کے اس میٹھے درد کو محسوس کرنے کی سعیِ ناکام کرتا رہا جو کبھی میں نے ان قدیم نظموں میں انڈیلا تھا۔ الفاظ: روٹی، راہگزر، رسوائی۔

دوسرے دن میرا بخار کچھ کم ہو گیا تھا۔ میں نے اس کو اسکول بھیجا، اور اپنے مجموعوں کو دوسری کتابوں کے بیچ میں ٹھونس دیا۔ مجھے یقین تھا اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ دوسرے دن میں نے دیکھا میرے پانچوں مجموعے سلیقے سے ایک قطار میں لگے تھے۔ مجھے احساس ہوا کہ کسی چیز نے اس پر اثر کیا ہے۔ لیکن بس اتنا ہی۔

وہ اس کے اسکول کا آخری سال تھا۔ گو کہ اس حقیقت سے اس کی عادتوں میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ وہ اب بھی روزانہ شام کو آدھ گھنٹہ ہوم ورک کرنے میں گزارتا، کاپیوں میں جھکا کچھ لکھتا رہتا؛ اور پھر کاپیاں بند کر کے بستے میں رکھ دیتا اور گھر کے کام کاج میں لگ جاتا۔ کلاس میں وہ اب بھی اسی طرح کونے میں بیٹھتا، لیکن اب وہ کلاس میں حاضری کم دیتا تھا۔ چوکیدار اکثر اس کو اپنے پاس بلا لیتا، اور دوچھتی میں پرانے چولھے رکھوانے، اور تہہ خانے میں ٹوٹے فرنیچر کی مرمت میں اس کی مدد لیتا۔

جب وہ کلاس میں ہوتا تو ہمیشہ کی طرح مگن بیٹھا رہتا اور اس کی آنکھیں استاد پر مرکوز رہتیں۔

اسکول کے آخری دنوں کا وہ بجھا بجھا ماحول...

کلاسیں ختم ہونے سے دو تین ہفتے پہلے اس کی کلاس میں میری ایک نظم پڑھائی گئی۔ نصابی کتاب کے آخری صفحوں میں چند نظمیں شامل تھیں، غالباً کسی خالی گھنٹے میں پڑھانے کے لیے۔ ان میں میری بھی نظم تھی، برسوں پہلے لکھی گئی نظم۔ وہ میں نے نوعمروں کے لیے نہیں لکھی تھی، لیکن لوگ غالباً یہی

سمجھے تھے اور اسی لیے اسے نصاب میں شامل کیا گیا تھا۔

استاد نے وہ نظم کلاس میں پڑھ کر سنائی، اور مشکل الفاظ کے معنی بتائے۔ پھر ایک طالب علم سے نظم بہ آواز بلند پڑھنے کو کہا۔ شاید میرا بیٹا اس واقعے پر کوئی توجہ نہ دیتا اگر استاد نے اس کی طرف اشارہ کر کے کہا نہ ہوتا! ''لیکن ہاں... یہ اس کے والد کی نظم ہے۔''

اس انکشاف سے نہ تو کلاس میں میرے لڑکے کی حیثیت پر کوئی اثر پڑا اور نہ نظم کی اہمیت بڑھی... بہر حال، کلاس ختم ہوتے ہی یقیناً نظم اور شاعر دونوں بھلائے جا چکے تھے۔

لیکن میرا بیٹا شاید اس بات کو نہ بھولا۔ اس کا چہرہ دمکتا رہا۔ غالباً وہ کلاس روم خالی ہونے کے بعد دیر تک وہاں منڈلاتا رہا، ہیجانی کیفیت میں فرش سے چھلکے چنتا رہا، بلیک بورڈ صاف کرتا رہا۔

میں جب شام کو لوٹا تو گھر میں اندھیرا تھا۔ میں نے دروازہ کھولا تو اس کو اندھیرے میں منتظر پایا۔ وہ اپنے جذبات پر قابو نہ پا سکا۔ مجھ سے لپٹ گیا اور ایک وحشیانہ قسم کا واویلا شروع کر دیا۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ اس نے مجھے نہ جیکٹ اتارنے کی مہلت دی اور نہ ٹائی ڈھیلی کرنے کا موقع دیا، اور مجھے بازوؤں سے گھسیٹتا ہوا ایک کمرے میں لے آیا۔ بتی جلائی، اپنی کتاب کھولی اور بھرائی ہوئی آواز میں میری نظم پڑھنے لگا۔ غلط سلط تلفظ، لفظوں کو کھاتا ہوا، آواز کو غلط جگہوں پر اٹھاتا ہو۔

اس کی پر آشوب کیفیت دیکھ کر میں چکرا گیا۔ رحم سے میرا دل پھٹنے لگا۔ میں نے اس کو سینے سے چمٹا لیا اور اس کے بالوں کو سہلانے لگا۔ یہ بات واضح تھی کہ وہ نظم کو سمجھ نہ سکا تھا، گو کہ نظم میں کوئی ایسے گہرے معنی نہ تھے۔

اس نے میری آستین پکڑ لی اور پوچھا کہ میں نے یہ نظم کب لکھی تھی۔

میں نے اسے بتایا۔

میری دوسری نظمیں کہاں ہیں؟

میں نے اپنے مجموعوں کی طرف اشارہ کیا۔

بس صرف یہ پانچ مجموعے یا کچھ اور بھی؟ اس نے پوچھنا چاہا۔

میں مسکرا دیا اور اپنی الماری کی ایک دراز کھول کر اسے دکھائی۔ دراز میں کاغذوں کے ٹکڑے، میری ادھوری نظمیں، بیاضوں کے اوراق بکھرے پڑے تھے۔

کیا آج میں نے کوئی نئی نظم لکھی ہے؟ اس نے سوال کیا۔ میں اپنی ہنسی پر قابو نہ رکھ سکا۔ اس کا بے وقوف سا چہرہ اوپر اٹھا ہوا تھا اور وہ رشک وفخر سے مجھے تک رہا تھا۔ شام کا وقت تھا اور میں اب تک جیکٹ اور ٹائی میں ملبوس تھا۔

میں نے اسے بتایا کہ اس کی پیدائش سے پہلے نظمیں لکھنا میں نے چھوڑ دی تھیں، اور دراز میں جو کچھ کباڑ جمع ہے وہ مجھے کبھی کا پھینک دینا چاہیے تھا۔

میں نے جیکٹ اتاری، ٹائی کو ڈھیلا کیا اور بیٹھ کر جوتوں کے تسمے کھولنے لگا۔

وہ دوڑ کر میری چپلیں لے آیا۔

اس کے چہرے پر اداسی چھا گئی تھی۔

گویا اس نے کوئی بری خبر سن لی ہو۔

میں پھر ہنس پڑا۔

میں نے اس کے بال محبت سے پکڑے اور اس کا سر ہلایا۔

میں، جو اس کو چھونے سے گھبراتا تھا۔

چند دنوں بعد میں نے دیکھا کہ میری دراز کھلی ہوئی تھی۔ اس میں سے سارے کاغذ غائب تھے۔ ایک پرزہ تک نہ بچا تھا۔ میں نے اس کو باغ میں جا پکڑا۔ وہ ہاتھ میں کدال لیے درخت کے قریب خودرو جھاڑیاں صاف کر رہا تھا۔ اس نے ایسا کیوں کیا؟ اس کا خیال تھا مجھے ان کاغذات کی ضرورت نہ رہی تھی۔ اس نے دراز کی صفائی کر دی۔ کیا میں نے خود نہیں کہا تھا کہ میں لکھنا چھوڑ چکا ہوں؟

وہ سارے کاغذات کہاں چلے گئے؟

اس نے وہ سارے کاغذات پھینک دیے تھے جن پر کچھ لکھا ہوا تھا۔ چھوٹی چھوٹی بیاضیں اس نے ردی میں بیچ ڈالی تھیں۔

میں نے اس کی خوب پٹائی کی۔ زندگی میں دوسری دفعہ، اور اس دفعہ بھی چنار کے نیچے۔ میں نے اپنے بوڑھے ہاتھوں کی پوری طاقت سے اس کے کھردرے رخساروں پر چانٹے لگائے۔

وہ بری طرح کانپنے لگا...

اس کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔ بیلچے میں اس کی انگلیاں گڑی رہ گئیں۔ وہ پلٹ کر مجھے مار سکتا تھا۔ اس میں اتنی قوت تھی کہ وہ مجھے مار گراتا۔

لیکن اچانک میرا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ تمام قصہ کتنا غیر اہم تھا۔ پرانی نظموں کے نشانات۔ نظمیں جو کب کی گم ہو چکیں۔ یہ لرزش کیسی؟

کیوں؟ جب کہ میری خاموشی پر مہر ثبت ہو چکی ہے۔

اور پھر میں نے سوچا کہ چلو، قصہ ہمیشہ کے لیے تمام ہوا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ تو آغاز ہے۔

گرمیوں کے طویل، اکتا دینے والے دن۔ شفاف، نیلا آسمان۔ کبھی کوئی بھولا بھٹکا بادل کا ٹکڑا کسی خواب آگیں سفر پر آسمان کے ایک سرے سے تیرتا ہوا دوسری سمت نکل جاتا۔ تمام دن ہمارے چنار پر چڑیوں کے جھنڈ شور مچاتے۔

شامیں، سرخ، کھا جانے والی۔

بچے کا اسکول میں آخری دن۔

اور ایک دن بعد، سالانہ تقریب، اسناد کی تقسیم۔

اس کو ڈپلوما نہیں ملا، ظاہر ہے۔ بہر حال، وہ دوسرے لڑکوں کے ساتھ تقریب میں شریک ہوا۔ سفید قمیص اور خاکی پتلون پہن کر اسٹیج پر چڑھا (وہ کوئی سترہ سال کا ہو چکا تھا) اور دوپہر کی تیز دھوپ تلے بیٹھ کر تقریریں سنتا رہا۔ پرنسپل نے اساتذہ اور اسکول کے منتظمین کا شکریہ ادا کیا۔ جب چوکیدار کا نام آیا تو میں نے دیکھا میرے بیٹے کی نظریں مجمعے میں اس کو تلاش کرنے لگیں۔ میں ہال کے آخری سرے پر کرسیوں کے انبار کے پیچھے چھپا بیٹھا تھا۔ میرا ہیٹ میرے ٹخنوں پر دھرا تھا۔ تقریریں ختم ہو گئیں اور ورائٹی پروگرام شروع ہوا۔

دو موٹی تازی لڑکیاں اسٹیج پر چڑھیں اور کپکپاتی جذباتی آواز میں اعلان کیا کہ وہ پیانو پر ایک دھن سنائیں گی جو کسی نامعلوم موسیقار نے کئی سو سال پہلے ترتیب دی تھی۔ وہ ایک پرانے پیانو کے پیچھے بیٹھ گئیں اور چار ہاتھوں سے اس میں سے اداس سے سر نکالنے لگیں۔

والدین نے خوشی سے تالیاں بجائیں۔

ایک چھوٹا سا، گھونگھریالے بالوں والا لڑکا، ایک بڑا سا بربط اٹھائے اسٹیج پر آیا اور کسی دوسرے گمنام موسیقار کی دھن بجائی۔

میں نے آنکھیں بند کرلیں۔

مجھے یہ گمنامی کا خیال اچھا لگا۔

والدین نے پھر والہانہ انداز میں تالیاں بجائیں۔

اچانک مجھے کسی کی نگاہوں کی گرمی محسوس ہوئی۔ میں نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ مجھ سے کچھ فاصلے پر چوکیدار بیٹھا تھا۔ اس نے مجھے دیکھ کر نرمی سے سر ہلایا۔

دو لڑکے اور دو لڑکیاں اسٹیج پر آئے اور کچھ پڑھنا شروع کیا۔ ایک کہانی، ایک مزاحیہ خاکہ، دو تین نظمیں۔

نظموں کی آواز کانوں میں پڑتے ہی میرا بیٹا اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑا ہوا اور پریشان نظروں سے مجھے تلاش کرنے لگا۔ حاضرین کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ معنگ، بے وقوف سا لڑکا اسٹیج کے نیچے لوگوں کے سامنے کھڑا کس کو تلاش کر رہا ہے۔ اس کے ساتھیوں نے کھینچ کر اسے کرسی پر بٹھانا چاہا، لیکن وہ کھڑا رہا۔ اس کی نظریں میری تلاش میں ہال کے چاروں اطراف بھٹکتی رہیں۔ نظمیں اس کے کانوں میں گونج رہی تھیں اور وہ دھیمے دھیمے ان کے سُروں پر سر ہلا رہا تھا۔ اس نے چیخنا چاہا۔ لیکن وہ مجھے نہ پا سکا؛ میں نے خود کو کرسیوں کے بالکل نیچے تقریباً کبڑا کر لیا تھا۔

جیسے ہی تقریب اختتام کو پہنچی میں تیزی سے باہر نکل آیا۔ وہ شام کو گھر پہنچا۔ مجھے بعد میں پتا چلا کہ مہمانوں کے جانے کے بعد وہ چوکیدار کے ساتھ ہال میں کرسیوں کی ترتیب ٹھیک کرتا رہا تھا۔

وقت آ پہنچا تھا کہ اس کی قسمت کا فیصلہ کیا جاتا۔ میں اس بات کو دہراتا ہوں کہ وہ سرحد پر تھا، خرد و جنوں کی سرحد پر۔ کیا میں نے وقت کو یونہی گزرنے نہیں دیا؟ کیا وہ اب تک میرے قابو میں ہے؟

فی الحال وہ میرے ساتھ گھر میں رہنے لگا۔ وہ اپنے باپ کی دیکھ بھال کرتا۔ پھر وہ نظموں کی طرف متوجہ ہونے لگا۔

ہاں، وہ اب تک بندی کرنے لگا تھا۔

قصہ یوں تھا کہ میری ادھوری نظمیں، کاغذ کے وہ ٹکڑے، میری وہ بیاضیں، اس نے ضائع نہ کی

تھیں اور نہ ہی ردی میں بیچی تھیں۔ وہ سب کچھ اب تک اس کے پاس محفوظ تھا۔ اس دن چنار کے درخت کے نیچے اس نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔

مجھے وہ سارے کاغذات اکٹھے نہیں ملے۔ شروع میں اس نے یہ سب مجھ سے چھپانے کی کوشش کی۔ لیکن آہستہ آہستہ مجھے علم ہوتا گیا۔ کاغذ کے ننھے منے ٹکڑے گھر میں اِدھر اُدھر اڑتے پھرتے، اس کی پتلون کی جیبوں سے جھانکتے، اس کے تکیے کے نیچے نظر آتے، اس کی چادر کے اندر کھڑکھڑاتے۔ اس نے ایک نئی عادت اپنالی۔ میں جب اسے کسی کام سے باہر بھیجتا تو وہ کاغذ کا ایک ٹکڑا نکالتا اور کام کی نوعیت اپنی بچکانہ، بری بڑی ٹیڑھی میڑھی لکھائی میں درج کر لیتا، املا کی غلطیوں سے بھرپور۔

''میں گمنامی میں ڈوب چکا ہوں،'' ایک دن اچانک اس نے مجھے بتایا۔

میری چھتری ٹوٹ گئی تھی اور میں نے اس کی مرمت کے لیے کہا تھا۔ فوراً اس نے ایک چھوٹی سی بیاض نکالی، میری پرانی بیاضوں میں سے ایک جو کبھی میری زندگی کا اٹوٹ حصہ تھیں، جن کو میں کتنی چاہت سے ہر وقت اپنی جیبوں میں رکھتا تھا تاکہ نظم آتے ہی اسے لکھ ڈالوں۔ کوئی بند، کوئی خیال، کوئی سطر۔

میرا حلق خشک ہوگیا۔ پیشانی پر پسینے کے قطرے پھوٹ نکلے۔ میرا ہاتھ خود بخود آگے بڑھا۔ اس نے فوراً بیاض میرے حوالے کر دی۔ میں نے کمزور لرزتے ہاتھوں سے اس کے صفحے پلٹے۔ سفید صفحے، نکالے ہوئے صفحوں کے کٹے ہوئے حصے۔ اور پھر ایک ٹوٹی پھوٹی سطر، میرے گھسیٹے ہوئے خط میں: ''میں گمنامی میں ڈوب چکا ہوں''، اور پھر خالی صفحے، مڑے ہوئے کونے۔

مجھے سکون ہوگیا۔ اس نے بیاض مجھے لوٹانا چاہی، لیکن میں نے اصرار کیا کہ وہ اسے اپنے پاس رکھے۔

وہ چلا گیا۔

اوپر اس کے کمرے میں جا کر میں نے اس کی میز کی تلاشی لی، لیکن مجھے کچھ نہ ملا۔ پھر میں نے اس واقعے کو فراموش کر دیا۔ شام کو میں نے اپنی میز پر پیلا سا کاغذ کا ٹکڑا دیکھا۔ اس میں میرے ہی خط میں تحریر تھا: ''یہ نیلا آسمان، آدمیت کے مقابل...''

اور ''نیلا آسمان'' ایک مدھم سی لکیر سے کٹا ہوا۔

میں اس کے کمرے کی طرف دوڑا۔ وہ وہاں بیٹھا تھا، میرے مبہم انتظار میں۔ میں نے اس کی آنکھوں کے سامنے وہ کاغذ کا ٹکڑا تہہ کیا، اس کی میز پر رکھا اور کمرے سے نکل آیا۔ اس شام کھانے کے بعد مجھے پھر اپنی دو بھولی بھٹکی سطریں نظر آئیں:

''بے وقعت پھر تمھارے سامنے۔

یہ طویل، سست رو سردیاں۔''

اور کاغذ میں نے اسی وقت پھاڑ دیا۔

اور دوسرے دن میرے ٹیڑھے میڑھے، تکلیف دہ خط میں:

''میرا جنوں میرے کمزور بیچ میں...''

اور اس کے گرد درشتی اور تیزی سے مٹائے ہوئے الفاظ۔

اور اس پھٹے ہوئے کاغذ کے پاس گلدان میں ایک سرخ پھول رکھا تھا۔

اب میں پھولوں کے بارے میں بتاتا ہوں۔

گھر اب پھولوں سے بھر گیا تھا۔ طاقچوں سے، کوٹھری سے، پرانے بوسیدہ گلدان برآمد ہوئے اور پھولوں سے بھر گئے۔ وہ راستے میں چمپا جمع کرتا، باغوں سے گلنار چراتا، اور گھروں سے چوری چھپے گلاب توڑ کر لاتا۔ گھر تیز خوشبوؤں سے بھر گیا۔ زرد شاخیں میز پر بکھری رہتیں۔ مرجھائے ہوئے پھولوں کی پتیاں قالین پر چرمراتیں۔

میری میز پر کورے کاغذ کے دستے سلیقے سے رکھے رہتے۔ تراشی ہوئی نوک دار پنسلیں قریب ہی رکھی ہوتیں۔

اور یوں اپنے غبی ذہن کی ضد میں وہ مجھے دوبارہ شاعری پر راغب کرنے کی کوشش میں لگ گیا۔

شروع میں میں کافی محظوظ ہوا۔ میں چھوٹے چھوٹے پرزے اٹھاتا، ادھوری سطریں پڑھتا اور ان کو پھاڑ کر پھینک دیتا۔ پھولوں کو سونگھتا۔ خالی بیاضوں پر نوک دار پنسلوں سے نقطے اور لکیریں بناتا اور ہزاروں دفعہ اپنے دستخط کرتا۔

لیکن جلد ہی اس کا یہ جنوں بڑھنے لگا۔ نا قابلِ برداشت ہوگیا۔

میری پرانی بیاضوں سے نکلے ہوئے وہ کاغذ پورے گھر میں میرا پیچھا کرتے۔ مجھے اندازہ نہ تھا کہ میں نے اتنا کچھ لکھنا چاہا تھا۔ وہ ان کاغذ کے ٹکڑوں کو ان کتابوں کے اندر رکھ دیتا جن کو میں پڑھ رہا ہوتا، میرے بریف کیس میں، بستر کے قریب لیمپ پر، صبح کے اخبار کے نزدیک، چائے کی پیالی کے نیچے، ٹوتھ پیسٹ کے قریب، یہاں تک کہ جب میں اپنا بٹوا کھولتا تو کاغذ پھڑ پھڑاتے ہوئے نیچے گرتے۔

میں انھیں پڑھتا، پھاڑتا اور پھینک دیتا۔

تب تک میں نے کوئی احتجاج نہ کیا تھا۔ میں تجسس میں گھر چکا تھا۔ میں پڑھنا چاہتا تھا کہ برسوں پہلے میرے ذہن میں کون سے خیالات موجزن تھے۔ اور پھر کبھی تو یہ کاغذ کے ٹکڑے ختم ہونے ہی تھے۔ اتنا تو مجھے یقین تھا: یہ سلسلہ ایک نہ ایک دن ختم ہو جائے گا۔

رات گئے جب میں لحافوں کے بوجھ تلے لیٹا ہوتا، اس کے قدموں کی آواز آتی۔ وہ گھر میں گشت لگاتا، میری شکستہ تحریر لیے ننھے منے کاغذ اِدھر اُدھر اُگاتا پھرتا۔ مڑے تڑے ایک دوسرے سے پیوستہ حروف، الفاظ کے نیچے کھنچی ہوئی موٹی سیاہ لکیریں۔

ہم دونوں نے معمول کے مطابق خاموشی برقرار رکھی۔ اور وہ روزانہ میرے پھاڑے ہوئے کاغذوں کے ننھے منے پرزے راکھ دانوں اور ردی کی ٹوکریوں میں سے چنتا رہا۔

سوائے اس کے کہ اب کاغذوں کی موجیں تھمتی جا رہی تھیں۔ ایک صبح میں نے اپنی میز پر ایک صفحہ پایا جس پر اس کے ہاتھ کی ایک سطر لکھی ہوئی تھی۔ اس نے میرے خط کی نقل کرنے کی کوشش کی تھی۔ اگلی صبح پھر خالی صفحے پر اس کے ہاتھ کی بھدی لکھائی۔

اور پھول، ہر کمرے میں...

اور آسمان، بادلوں سے ڈھکا ہوا...

میرے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا۔ میں غصے سے پاگل ہوگیا، اور اس کے کمرے میں دندناتا ہوا پہنچا۔ وہ میز پر بیٹھا کچھ لکھنے میں مصروف تھا۔ وہی میرے خط کی نقل۔ میں نے بچی کھچی بیاضیں سمیٹیں اور عین اس کی آنکھوں کے سامنے پرزے پرزے کرنے لگا۔ میں نے گھر کے تمام گلدانوں سے پھول

نوچ ڈالے اور دروازے پر ڈھیر کر دیے، اور اس کو حکم دیا کہ انھیں باہر پھینک کر آئے۔

''اب کھیل ختم ہوا،'' میں نے اس سے کہا۔

اس نے پھول سمیٹے اور گھر کے قریب میدان میں دفن کرنے چل دیا، اور پھر واپس نہیں آیا۔ وہ تین دن گھر سے باہر رہا۔ دوسرے دن میں نے پورے شہر کی خاک چھان ڈالی۔ (اس اثنا میں گھر گرد سے اٹ گیا اور باورچی خانے میں جھوٹے برتنوں کا انبار لگ گیا۔)

تیسرے دن سہ پہر کو وہ واپس لوٹا۔ دھوپ کی تمازت سے اس کا رنگ جل گیا تھا، اور اس کے کپڑوں میں مٹی کی خوشبو تھی۔

میں نے غصے کو قابو میں کیا اور اس کو اپنے سامنے پکڑ کر بٹھایا۔

وہ کہاں گیا تھا؟ کیا ہوا تھا؟ وہ گھر سے کیوں بھاگا تھا؟

وہ گھر کے قریب ایک میدان میں سوتا رہا تھا۔ جب میں گھر سے باہر نکلتا تو وہ چپکے سے اپنے کمرے میں آکر چھپ جاتا۔ ایک دفعہ میں اچانک گھر آ گیا تھا اور وہ اپنے کمرے میں موجود تھا۔ لیکن مجھے علم نہ ہو سکتا تھا۔ وہ کیوں بھاگ گیا تھا؟ وہ تسلی بخش جواب نہ دے سکا۔ اس کا خیال تھا کہ میں چاہتا ہوں وہ میری نظروں سے دور ہو جائے۔ اس کا خیال تھا میں تنہائی میں نظمیں لکھنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ اسکول میں شاعروں کے بارے میں یہی بتایا گیا تھا۔ ان کی تنہائی کے بارے میں...

وہ منحوس استاد۔

یا یہ سب اس کی مکاری تھی؟

اب وقت آ گیا ہے کہ میں اس کا فیصلہ کروں۔ وہ اب سرحد کے اس پار لڑکھڑانے لگا ہے۔

میں نے انتہائی صبر کے ساتھ اس سے دیر تک بات کی۔ تم اب کیا چاہتے ہو؟ میں نے اس سے کہا۔ مجھے جتنا کچھ لکھنا تھا، میں لکھ چکا۔ میں شاعری ترک کر چکا ہوں۔ آخر تم کیا چاہتے ہو مجھ سے؟

اس نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ اور اس کے منھ سے شدتِ جذبات میں کچھ الفاظ نکلے جو میں بڑی مشکل سے سمجھ پایا۔ اس کا خیال تھا کہ میں دکھی ہوں، میں خوش نہیں ہوں۔

کاش اس لمحے تم نے اسے دیکھا ہوتا۔

وہ ضعیف العقل لڑکا، خرد و جنوں کی سرحد پر کھڑا ہوا، اس کی عینک آہستہ آہستہ اس کی ناک پر

پھسلتی ہوئی، لمبا تڑنگا، اٹھارہ برس کا۔

خزاں کی دھوپ شام کے وقت خراماں خراماں کمروں سے گزرتی ہوئی۔ برابر والے گھر سے موسیقی کی آواز۔ کوئی وائلن کے سروں کی مشق کر رہا ہے، ایک ہی مشق کئی دفعہ، اور ہر دفعہ بے سری۔ ایک تار سے ہر دفعہ غمناک سی چیخ نکلتی ہے۔

اچانک مجھے اپنی موت کا یقین ہو گیا ہے۔ میں سوچ سکتا ہوں کہ باغ میں گھاس یوں ہی سرسراتی رہے گی۔

میں اس کو دیکھتا ہوں جیسا وہ حقیقتاً ہے: ایک نامکمل تخلیق۔

میں مسکراتا ہوں اور سرگوشی میں کہتا ہوں، ''میں تھک گیا ہوں۔ غالباً تم میرے لیے لکھ سکتے ہو۔''

وہ سکتے میں رہ جاتا ہے۔ اپنی عینک اتارتا ہے اور اسے قمیص سے صاف کر کے دوبارہ پہنتا ہے۔

''میں نہیں لکھ سکتا،'' وہ بھی سرگوشی کرتا ہے۔

اتنا کرب۔ یقیناً وہ نہیں لکھ سکتا۔ مجھے اب آزاد ہونا ہے۔ یہ زنجیریں توڑنی ہیں، یہ رشتے، یہ بندھن... برسوں کی اذیت۔ آدمی اس پر رو سکتا ہے۔ وہ سب مجھے اس کے ساتھ اکیلا چھوڑ گئے۔ اور پھر وہی بے سُری وائلن کی تان۔

''تم میری مدد کرو گے،'' وہ آہستہ سے کہتا ہے، گویا ہم دونوں میں یاری ہے۔

''میں تمھاری کوئی مدد نہیں کروں گا۔''

مجھ پر گہری تھکان طاری ہو گئی۔

میں اٹھ کر کھڑا ہوا، ہیٹ اٹھایا اور باہر نکل آیا۔ دو دفعہ نو آموز موسیقار کے گھر کا چکر لگایا اور شہر کی طرف چل پڑا۔

رات کو جب میں واپس آیا تو وہ جا چکا تھا۔ مجھے پھر اپنا کھانا خود تیار کرنا پڑا۔ اور جب میں سلائس کاٹ رہا تھا تو چھری میرے ہاتھ سے پھسل گئی۔ کئی سال بعد خون بہا تھا۔

میرا خیال تھا کہ وہ گھر سے بھاگ گیا ہے، لیکن وہ آدھی رات کو واپس آ گیا۔ اس وقت میں اپنے کمرے کی بتی گل کر چکا تھا۔ وہ گھر میں ٹہلنے لگا۔ کمرے کو اپنے قدموں سے ناپتا، بالکل جیسے میں ٹہلا

کرتا تھا، جب لفظوں کا دریا میرے اندر تلاطم برپا کرتا، الفاظ جب نظموں کی صورت باہر نکلنے کی کوشش کرتے۔

میں اس کے گشت کرنے کی آواز سنتے سنتے سو گیا۔

دوسرے دن اس نے اپنا کمرہ خالی کیا۔ اسکول کی کتابیں، انسائیکلوپیڈیا جو اسے تحفے میں ملے تھے، کاپیاں، ڈبے، تمام چیزیں باہر نکال دیں۔ نئے کاغذوں کے دستے اور چھلی ہوئی پنسلیں اپنی میز پر منتقل کرلیں۔

خزاں کے آنے سے آسمان پھیکا پڑ گیا تھا۔

میں ریٹائرمنٹ کے بارے میں سوچنے لگا۔ کچھ رومانوی سے انداز میں۔ ملازمت چھوڑ دوں، گھر بیچ ڈالوں، پیسے سمیٹوں اور فرار ہو جاؤں، کہیں دور، کسی دور دراز مقام پر۔ کسی قدیم شکستہ بندرگاہ میں رہائش اختیار کرلوں، اور وہاں سے کسی بڑے شہر کی چھوٹی سی کھولی میں منتقل ہو جاؤں۔ مختصراً: ارادے، حماقتیں۔ میں نے ٹریول ایجنسیوں کے چکر لگانا شروع کر دیے۔ اور رنگ برنگے کتابچوں سے لدا پھندا گھر پہنچنے لگا۔ گھر کے باہر باڑھ پر ''برائے فروخت'' کا تختہ لٹکا دیا۔

ہلکی سی بارش ہوئی۔

ایک جمعے کو میں اپنی بیٹیوں سے ملنے یروشلم گیا اور سبت کا دن وہاں گزارنے کا فیصلہ کیا۔

میرا بے حد گرم جوشی سے استقبال کیا گیا۔ انھوں نے میرے اعزاز میں موم بتیاں جلائیں اور گھر کو پھولوں سے بھر دیا۔ نواسے نواسیاں میری چھڑی سے کھیلتے رہے۔ مجھے احساس ہوا اب تک میں ان لوگوں سے غفلت برتتا رہا تھا۔ کھانے کے وقت انھوں نے مجھے میز پر سب سے اہم جگہ بٹھایا۔

میں پوری شام اُس کی باتیں کرتا رہا، کسی جنونی کی طرح۔ میں نے موضوع نہیں بدلا، کوئی اور بات کرنے پر تیار نہ ہوا۔ میں نے ان لوگوں سے اس کا حل طلب کیا، اصرار کیا کہ اسے کسی کام پر لگانا ضروری ہے۔ میں نے اعلان کیا، میں ملک سے باہر جا رہا ہوں، دنیا کی سیر کرنے۔ اب کوئی اور اس کی ذمے داری اٹھائے۔ وہ کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔ وہ کسی کی بھی خدمت کر سکتا ہے۔ کچھ بھی کرے، بس میں اب اس کی ذمے داری نہیں لے سکتا۔ اب مجھے آزادی چاہیے۔ اب وہ بالغ ہو چلا ہے۔

میں نے نظموں کے بارے میں ایک لفظ نہ کہا۔

پہلی بار میرے دامادوں نے مجھے بھرپور توجہ دی۔ لڑکیاں چکرا گئیں، پریشان ہو گئیں۔ تم دونوں کے درمیان کیا ہوا ہے؟ ہم سب میز سے اٹھ گئے اور کافی پینے کے لیے آرام کرسیوں میں بیٹھ گئے۔ بچے لباس تبدیل کر کے شب بخیر کہنے آئے۔ ننھے منے ہاتھوں کو ہلاتے انھوں نے ایک شاعرہ کے دو مصرعے پڑھے، وہ شاعرہ جس کو مرے ہوئے ابھی زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا۔ پھر انھوں نے ہونٹوں سے میرا چہرہ گیلا کر دیا اور سونے کے لیے چلے گئے۔ میں اس کی باتیں کرتا رہا۔ میری توجہ بٹانے کی تمام کوششیں ناکام ہو چکی تھیں۔ وہ سب بے حد تھک چکے تھے۔ وہ اب صرف سر ہلا رہے تھے۔ وقتاً فوقتاً وہ ایک دوسرے کی طرف یوں دیکھتے گویا میں پاگل ہو گیا ہوں۔

اور پھر وہ سب اچانک اٹھ کھڑے ہوئے، مجھ سے کچھ کہے بغیر۔ مجھے آہستگی سے پکڑ کر بستر تک لے گئے۔ مجھے بوسے دیے اور اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

تب مجھے پتا چلا پوری شام باہر طوفان امنڈتا رہا تھا۔ ایک جواں سال درخت کی شاخیں کھڑکی سے ٹکراتی رہیں، شیشے پر منھ مارتی، فریم سے ٹکراتی۔ تمام رات وہ درخت میرے بستر تک پہنچنے کی کوشش کرتا رہا۔ جب میری آنکھ کھلی، ہر سو خاموشی تھی۔ طوفان تھم چکا تھا۔ آسمان صاف تھا، سوائے بادلوں کے چند ٹکڑوں کے۔ جواں سال درخت سورج کی طرف منھ کیے خاموش کھڑا تھا۔ صرف چند ٹوٹے ہوئے، چمکیلے پتے کھڑکی کی منڈیر پر پڑے تھے۔

میں دوپہر میں گھر واپس چلا گیا۔ میرے دامادوں نے اس کے لیے ملازمت تلاش کرنے کا وعدہ کیا۔ میری بیٹیوں نے کسی نیم معطل ادارے کا تذکرہ کیا۔

سردیاں گویا زمین سے پھوٹ پڑی تھیں۔ سڑک اور فٹ پاتھ کے درمیان ننھے منے تالاب بن گئے تھے۔ میرا عکس ہلکورے لیتا اور ہزار کرچیوں میں بکھر جاتا۔

وہ گھر پر نہیں تھا۔ اس کا کمرہ مقفل تھا۔ میں باہر باغ میں گیا اور کھڑکی سے اس کے کمرے میں جھانکنے کی کوشش کرنے لگا۔ کھڑکی کھلی تھی اور کمرہ بالکل صاف ستھرا تھا۔ سفید کاغذ اس کی میز پر چمک رہے تھے۔ ان پر یقیناً کچھ لکھا ہوا تھا۔ میں واپس اندر آیا اور اس کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی، لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ دوبارہ باہر آیا اور ایک بڑا سا پتھر اس کی کھڑکی کے نیچے لڑھکا کر اس پر چڑھنے لگا۔ لیکن

میری ٹانگیں کانپنے لگیں۔ میں بوڑھا ہو چلا تھا۔ اچانک میں نے سوچا: ''وہ میرا کیا لگتا ہے؟'' میں اندر گیا، ٹائی بدلی اور دوستوں کی تلاش میں کیفے کی طرف چل پڑا۔

ہفتے کی رات۔ سڑکوں پر شور وغل۔ ہم کیفے کے ایک کونے میں جمع ہیں۔ بوڑھے، تلخ، فنکار، کوٹوں میں لپٹے، بجھے ہوئے آتش فشاں۔ دھواں اگلتے ہوئے، جھریوں بھرے ہاتھوں سے دنیا کو مسلتے ہوئے۔ زمین سے منجمد کرنے والے بخارات اٹھ رہے ہیں اور کیفے کی شیشے کی دیوار دھندلا چکی ہے۔ میں کرسی میں بے سدھ پڑا ہوا ہوں، سگریٹ کا ٹکڑا انگلیوں میں دبائے، مرغولے بناتا ہوا، پتھریلے فرش پر چھڑی کو رقص دیتا ہوا۔ میں جانتا ہوں، یہ شہر ریت پر بنا ہے، گم سم اور دشوار گذار، مکانوں اور فٹ پاتھ کی پتلی سطح کے نیچے جلی ہوئی ریت کا ایک وسیع صحرا ہے۔

اچانک چند لمبے بالوں والے، غلیظ لاابالی نوجوانوں کا ایک گروہ باہر گلی میں نمودار ہوتا ہے۔ ہم ان کو دیکھ کر بھنویں چڑھاتے ہیں، ناکیں سکیڑتے ہیں۔ میرا بیٹا اس غول کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس کے رخسار تمتما رہے ہیں۔

وہ سب برابر والے کیفے کی خالی کرسیوں پر ڈھیر ہو جاتے ہیں۔ میرا لڑکا ان سے کچھ فاصلے پر ایک کرسی میں دبک گیا ہے۔ ان کے درمیان غل غپاڑے کی صورت میں کوئی گفتگو ہونے لگی ہے۔ میری نظریں اس پر جمی رہتی ہیں۔ کوئی اٹھتا ہے، جیب سے کاغذ کا ایک ٹکڑا نکالتا ہے اور ایک نظم پڑھنا شروع کرتا ہے۔ کوئی توجہ نہیں دے رہا، سوائے میرے بیٹے کے۔ وہ ایک ایک کے پاس آ کر رکتا ہے، اور پھر میرے لڑکے کے اوپر جھک جاتا ہے۔ کچھ لوگ ہنستے ہیں۔ کوئی جھک کر میرے بیٹے کے گالوں کو تھپتھپاتا ہے...

مجھے یقین ہے کسی کو اس کا نام نہیں معلوم۔ اور نہ اس کے باپ کا۔

چند لمحوں بعد میں کھڑا ہوتا ہوں۔ چھڑی سنبھالتا ہوں اور ساحل کی طرف نکل جاتا ہوں، سیاہ سمندر کو دیکھنے۔ اور پھر گھر۔ میں صوفے پر لیٹ جاتا ہوں۔ اخبار اٹھاتا ہوں اور ورق گردانی کرنے لگتا ہوں۔ ادبی صفحے پر نظر ڈالتا ہوں۔ ایک نظم کی دو تین سطریں پڑھتا ہوں، افسانے کا ایک پیراگراف، اور رک جاتا ہوں۔ ادب مجھے بور کرتا ہے، رُلا دینے کی حد تک۔ اور پھر میں سو جاتا ہوں، لباس تبدیل کیے بغیر۔ خواب دیکھتا ہوں کہ مجھے آپریشن کے لیے لے جایا جا رہا ہے۔ مجھے سُن کرنے کا انجکشن دیا جا رہا ہے اور پھر میری چیر پھاڑ شروع ہو جاتی ہے۔ لیکن مجھے درد کا احساس نہیں ہوتا۔ میری آنکھ کھل جاتی

ہے۔ پھر بے ہوشی۔ بے جان گوشت کے لوتھڑے کی طرح۔ تب میری سمجھ میں آتا ہے: میرے چہرے پر روشنی پڑ رہی ہے۔

میں سردی سے کپکپاتا ہوا اٹھتا ہوں۔ میرے کپڑوں پر شکنیں ہیں۔ باہر ہلکی ہلکی بارش ہو رہی ہے۔ میں باورچی خانے میں جاتا ہوں، کیتلی چڑھاتا ہوں اور پانی کے ابلنے کا انتظار کرتا ہوں۔ جھوٹے برتنوں کا انبار لگا ہوا ہے۔

ایک بڑی سی چھکڑا گاڑی، جس کی بتیاں گل ہیں، ہماری تنگ گلی میں رینگتی ہوئی آتی ہے۔ ہمارے گھر کے سامنے روشن کھمبے کے نیچے، بریک کی چرمراتی آواز کے ساتھ رکتی ہے۔ اندر سے شور وغل کی آوازیں آتی ہیں۔ پھر خاموشی کا ایک طویل وقفہ۔ ایک دروازہ کھلتا ہے اور کسی کو اتارا جاتا ہے۔ چہرہ ہیبت زدہ، حواس باختہ۔ یہ میرا بیٹا ہے۔ اس کے نقوش ساکن ہیں۔ اس کے چہرے پہ مسکراہٹ کا سایہ تک نہیں۔ ایک اور دروازہ کھلتا ہے، اور ایک شخص گھسٹ کر باہر نکلتا ہے، سڑک کے بیچوں بیچ، شراب کے نشے میں چور۔ وہ میرے لڑکے کی طرف بڑھتا ہے۔ اس کا ہاتھ تھامتا ہے اور جوش سے ہلا ہلا کر مصافحہ کرتا ہے۔ اور پھر کار میں واپس دھنس جاتا ہے۔

کار کے اندر مقید انسانی ہجوم کے چیخنے چلانے کی آوازیں۔ خاموشی کا ایک طویل وقفہ... پھر ایک جھٹکا اور گھڑگھڑاہٹ۔ اور اندھی، ٹوٹی پھوٹی گاڑی ایک کالے کچھوے کی طرح سرکتی ہوئی گلی سے باہر نکل جاتی ہے۔

میرا بیٹا کھمبے کے نیچے کھڑا ہے، عین اسی جگہ جہاں اس کو اتارا گیا تھا۔ کافی دیر تک وہ ساکت کھڑا رہتا ہے۔ اس کا جسم ہلکا سا آگے کو جھکا ہوا ہے۔ اچانک وہ دُہرا ہو جاتا ہے اور قے کرتا ہے۔ ہتھیلی سے منھ صاف کرتا ہے اور لڑکھڑاتا ہوا گھر کے اندر داخل ہوتا ہے۔ باورچی خانے کی طرف سے ہوتا ہوا گزرتا ہے، میری موجودگی سے بے خبر، اور اپنے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ بند کر لیتا ہے۔ شراب کی مدھم سی بو ہال میں تیرنے لگتی ہے۔

سرما۔ بارش کے پہلے چھینٹے کے ساتھ ہی یہ نشیبی علاقہ دلدل میں تبدیل ہونے کی سعی کرنے لگتا ہے۔

ایک بوڑھا شاعر، جو اب تقریباً اندھا ہو چلا ہے، جو مسلسل احمقانہ، ترحم آمیز نظمیں چھپوا کر

نوجوان شاعروں کے دل جیتنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے، سڑک پر مجھ سے ٹکراتا ہے۔ میری بانہوں میں بازو ڈال کر سرمئی آسمان کے نیچے، گیلی سڑکوں پر مجھے گھماتا ہے۔ بالآخر آنکھ کے خفیف سے اشارے کے ساتھ مجھے اطلاع دیتا ہے کہ نوجوان فنکاروں کے ساتھ وہ میرے بیٹے سے بھی مل چکا ہے۔

''اچھا نوجوان ہے۔ کیا وہ لکھتا ہے؟''

چاروں طرف سے افواہیں مجھے گھیر لیتی ہیں۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے وہ اسے ستاتے ہیں، چھیڑتے ہیں۔ دوسروں کا خیال ہے کہ بگڑے ہوئے نوجوانوں نے خوشی کے ساتھ اس کو اپنے گروہ میں شامل کر رکھا ہے۔ انھیں روز روز تو ایک بے زبان احمق نہیں مل سکتا۔ اس کے علاوہ وہ ایک نوجوان شاعر کا منظورِ نظر بن چکا ہے، اور ایک ادبی رسالے کے ایڈیٹر کا چپراسی بھی۔

میں اس کو سخت الفاظ میں برا بھلا کہتا ہوں۔ لیکن وہ نہیں سنتا۔ خالی الذہن، اس کی آنکھیں بادلوں سے ڈھکی دنیا کا جائزہ لیتی ہیں۔ وہ مجھے دیکھتا تک نہیں۔ اس کا چہرہ چند ہفتوں میں کچھ زرد پڑ گیا ہے۔ اس کے بھدے، غبی نقوش میں ایک راہبانہ، روحانی سی کیفیت پیدا ہو چکی ہے۔ مجھے معلوم ہے: اگر میں نے احتیاط نہ کی اور اگر میرے منھ سے کچھ نکل گیا تو وہ بھاگ جائے گا، پاگل ہو جائے گا، گلیوں میں آوارہ پھرے گا۔ مجھے بدنام کرے گا۔ پہلے ہی وہ گھر کو نظرانداز کرنے لگا ہے۔ وہ کھانا باہر کھاتا ہے۔ باغ ایک جھنکاڑ میں تبدیل ہو گیا ہے۔ میرا خیال تھا اسے پودوں سے محبت ہے۔

جب وہ گھر میں ہوتا ہے، خود کو کمرے میں بند کر لیتا ہے اور کسی جنونی کی طرح لکھتا رہتا ہے۔ ہم نے اب تک اس کی ایک نظم بھی نہیں دیکھی، لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ لکھتا ہے۔

میں ہال میں اس کو جا لیتا ہوں۔ اس کی آستین پکڑ کر کھینچتا ہوں اور طنز بھرے لہجے میں کہتا ہوں، ''محترم لکھتے ہیں! جی؟''

وہ میرے ہاتھ کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کرتا ہے۔ میرا لہجہ اس کو پریشان کر دیتا ہے۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آتا، اور وہ مجھے خوف بھری نظروں سے دیکھتا ہے گویا میں لاعلاج ہوں۔

اس میں گھنٹوں اپنے کمرے میں بند ہو کر توجہ مرکوز رکھنے کی حیرت انگیز صلاحیت ہے۔ کبھی کبھار وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوتا ہے، کتابوں کی الماری کی طرف جاتا ہے، نظموں کا کوئی مجموعہ اٹھاتا ہے اور گھنٹوں اس میں سر دیے کھڑا رہتا ہے۔ اس کا قاعدہ ہے کہ وہ صفحہ نہیں پلٹتا۔ پھر وہ خاموشی سے

کتاب واپس رکھ کر کمرے سے نکل جاتا ہے۔ پچھلے دنوں سے وہ لغت استعمال کرنے لگا ہے۔ وہ اکثر لغت کھول کر دیر تک اندھوں کی طرح اس کے صفحے الٹتا پلٹتا ہے۔ مجھے یقین نہیں کہ اسے لغت کا استعمال آتا ہوگا۔

آخر مجھ سے رہا نہیں جاتا۔ میں اس سے پوچھتا ہوں وہ کون سا لفظ تلاش کر رہا ہے۔

وہ جاننا چاہتا ہے کہ آسمان کو کس طرح لکھا جاتا ہے۔

''آسمان؟''

''لفظ، آسمان...''

''کیا مطلب ہے کس طرح لکھا جاتا ہے؟ جس طرح بولا جاتا ہے آسمان، اسی طرح لکھا جاتا ہے۔''

اس کی سمجھ میں نہیں آتا۔ وہ اسی طرح خوفناک حد تک سنجیدہ صورت لیے کھڑا ہے۔

''س سے یا ش سے؟'' وہ سرگوشی کرتا ہے۔

''ش سے؟'' میں غصے سے دہاڑتا ہوں۔ ''ش سے کیوں؟''

وہ اپنے ہونٹ کاٹنے لگتا ہے۔

''اور پھر تمھیں آسمان سے کیا کرنا ہے آخر؟...''

وہ کوئی جواب نہیں دیتا۔ آہستگی سے لغت بند کرتا ہے اور اپنے کمرے میں چلا جاتا ہے۔ کچھ دیر بعد وہ پھر دبے پاؤں کمرے میں داخل ہو کر لغت اٹھاتا ہے اور تلاش شروع کر دیتا ہے۔ میں چونک پڑتا ہوں۔

''اب کیا؟''

''آزادی...'' وہ ہکلاتا ہے۔

''آزادی؟ کیا مطلب؟''

''ز سے یا ذ سے؟''

ایک بار پھر وہی ناقابلِ فہم طیش کی لہر۔ اس لیے اور بھی کہ خود میں گڑبڑا رہا ہوں کہ آزادی کیسے لکھا جاتا ہے۔ میں اس کے ہاتھ سے لغت چھینتا ہوں اور جنونی کیفیت میں لفظ تلاش کرنے لگتا ہوں۔

اسی دوران میرے ریٹائرمنٹ کے منصوبے کی تیاری ہو رہی ہے۔ وقتاً فوقتاً لوگ گھر دیکھنے آتے ہیں جو کہ میں فروخت کرنا چاہتا ہوں۔ میں انھیں سارے کمرے دکھاتا ہوں؛ ان کو ہر کونے کھدرے میں جھانکنے کی اجازت دیتا ہوں؛ نیچے تہہ خانے میں لے جاتا ہوں؛ احاطے کے گرد، باغ میں اور بالکنی کے پیچھے لے جاتا ہوں؛ دھیمی آواز میں اس مکان کی خصوصیات گنواتا ہوں جس میں میں نے تیس سال گزارے ہیں؛ اور پھر سردمہری سے مکان کی قیمت بتاتا ہوں۔ میں ان کے نام پوچھتا ہوں اور جواب میں اپنا نام بتاتا ہوں۔ وہ کاغذ پر جھک کر میرا نام لکھتے ہیں، ایک نام جو ان کے لیے بالکل اجنبی ہے۔ ان کے چہروں پر اس نام سے مانوسیت کی کوئی رمق نظر نہیں آتی۔ کیا انھوں نے اپنی زندگی میں آج تک شاعری نہیں پڑھی؟ غالباً میں اس خطے سے گمنام ہی اٹھ جاؤں گا۔

گاہکوں کو البتہ باغ دیکھ کر شدید مایوسی ہوتی ہے۔ خودرو جھاڑیاں اور کیچڑ۔ میرا لڑکا بیلچہ اٹھانے سے قطعی انکاری ہے۔ آخر خود ہی باغبانی کے اوزار اٹھاتا ہوں اور ہر روز جھاڑیاں اکھاڑتا ہوں۔

آفس میں میرے لیے الوداعی پارٹی۔ تمام لوگ چھٹی سے ایک گھنٹہ پہلے، شام چار بجے، اکٹھے ہوئے۔ کیک پیش کیے گئے اور جام بلند ہوئے۔ کافی دیر تک میری خدمات کو سراہا گیا۔ بعضوں کی آنکھوں میں میں نے آنسو بھی دیکھے۔ کسی نے میری شاعری کا تذکرہ نہیں کیا۔ گویا میرے احساسات کو مجروح کرنا نہ چاہتے ہوں۔ اور تقریب کے اختتام پر ایک الوداعی تحفہ: ایک پینٹنگ، مٹیالا سمندر...

میں اپنا سامان باندھتا ہوں۔ کتابوں کے سامنے تذبذب میں کھڑا ہوں۔ کسے ساتھ رکھوں، کسے چھوڑ جاؤں۔ میں اپنے دامادوں کو لڑکے کے مستقبل کے بارے میں تاکیدی خطوط ارسال کرتا ہوں۔ میں فون پر ان سے بات کرتا ہوں اور اصرار کرتا ہوں کہ کچھ کریں۔ بالآخر وہ مجھے ایک دن شہر کے ایک چھوٹے سے کیفے میں ملاقات کا وقت دیتے ہیں۔ میز کے گرد بیٹھ کر وہ مجھے اپنا منصوبہ بتاتے ہیں۔ انھوں نے معلومات کروائی ہیں، اور یروشلم کے نزدیک ایک بوڑھے جلدساز نے لڑکے کو جلدسازی سکھانے کے لیے آمادگی کا اظہار کیا ہے۔ لڑکے کے کھانے پینے اور رہنے کا انتظام بھی وہیں ہوگا۔ بوڑھے جلدساز کا ایک ایسا ہی بیٹا تھا جو کسی بیماری میں چل بسا۔ البتہ اس نے ایک شرط رکھی ہے۔ اگر لڑکا بیمار ہو جائے، مثلاً اگر اسے مرگی کے دورے پڑنے لگیں، یا کچھ اور... تو اس کو فوراً واپس لینا ہوگا۔ وہ لوگ ایسی صورت میں اس کی دیکھ بھال اور تیمارداری کا ذمہ ہرگز نہیں لے سکتے۔

لہٰذا میرے دامادوں نے مزید کھوج کے بعد ایک ایسی بوڑھی عورت تلاش کر لی ہے جو اس جلد ساز کے گھر کے قریب ہی رہتی ہے۔ وہ لڑکے کو بیماری کی حالت میں قبول کرنے کو تیار ہے۔ ظاہر ہے کچھ پیسوں کے عوض۔ اور بس۔ مجھے صرف ان دونوں انتظامات کے کاغذات پر رضامندی کے دستخط کرنے ہیں۔

وہ کاغذات نکالتے ہیں۔

میں فوراً دستخط کرتا ہوں۔ لیکن میں غصے سے آگ بگولہ ہو رہا ہوں۔

''جہاں تک مرگی کے دورے وغیرہ کا تعلق ہے، تم لوگوں کا تردد بے معنی ہے۔ تمھیں معلوم ہے وہ ان میں سے نہیں ہے۔ وہ بورڈر لائن کیس ہے۔ میں نے یہ ہزار دفعہ بتایا ہے، لیکن تم لوگ سمجھتے ہی نہیں۔ خیر، چھوڑو ان باتوں کو...''

میرے داماد کاغذات سمیٹتے ہیں اور نقل میرے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔ کافی کے آخری گھونٹ چڑھاتے ہیں اور شفقت آمیز مسکراہٹ سے مجھے دیکھتے ہیں۔

''دیکھا آپ نے۔ آپ سمجھتے تھے ہم آپ کا خیال نہیں رکھتے...''

دوسرے دن میں پھر کاغذات پر دستخط کرتا ہوں۔ اس دفعہ مکان کی فروخت کے کاغذات پر۔ مجھے ایک مناسب گاہک مل ہی گیا۔ بہرحال مکان بیچ کے مجھے اچھی خاصی رقم مل گئی ہے جو کہ صرف زمین کی قیمت ہے۔ مکان کو مسمار کر دیا جائے گا۔

گھر کی اشیا مکان کی قیمت میں شامل تھیں۔ تین مزدور شام کو آئے اور گھر خالی کرنا شروع کر دیا۔ تمام چیزیں چلی گئیں سوائے دو عدد گدّوں کے۔ انھوں نے وہ میز تک اٹھالی جس پر وہ بیٹھ کر لکھ رہا تھا۔ وہ غصے سے پاگل ہو گیا۔ کاغذوں کو بازوؤں میں سمیٹے، وہ خالی مکان میں بھٹکتا رہا۔ چند کاغذات پھسل کر فرش پر گر گئے اور ایک مزدور نے انھیں اٹھا کر لیمپ ان میں لپیٹنا شروع کر دیا۔ وہ اپنے بھاری بھرکم ڈیل ڈول کے ساتھ مزدور پر پل پڑا، اور اس کو دانت سے کاٹنے کی کوشش کی۔

مجھے احساس ہوا کہ شام کے وقت اس کے حواس بالکل کند ہو جاتے ہیں۔

نوٹوں سے میری درازیں بھر گئی ہیں۔ گو کہ مجھے جائیداد کی اصل قیمت کا ایک چوتھائی ہی ملا ہے لیکن پھر بھی نوٹوں کے انبار لگ گئے ہیں۔ میں سب کچھ بیچ دینا چاہتا ہوں۔ اور جو نہیں بیچ سکتا، اسے

بانٹ دیتا ہوں۔ کتابوں کے انبار میں زبردستی دوستوں کے گھر پہنچاتا رہا ہوں۔ اگر میرے لڑکے کو ذرا بھی فرصت ہوتی تو شاید وہ میری نکالی ہوئی چیزیں ردی میں بیچ دیتا۔

ہم تہہ خانے کے پھیرے لگاتے ہیں اور پرانے کپڑے، جھاڑوئیں، مزید کتابیں، مسودے... میرے اپنے اور دوسروں کے... بے کار، فضول اشیا، ٹوٹی پھوٹی چیزیں نکالتے ہیں۔ تہہ خانے کے زینے پر تین دن تک گرد و غبار کا طوفان سا چھایا رہتا ہے۔

کیفے میں میں اپنے دوستوں سے کہتا ہوں، ''دیکھو، اس طرح آزاد ہوا جاتا ہے بندھنوں سے...''

ساتھ ساتھ، میں باقاعدگی سے شہر کی چھوٹی سی بندرگاہ پر روز جاتا ہوں تاکہ سیاحت کے شوق کو ہوا دے سکوں، جہاں گردی کی چنگاری سلگا سکوں۔ اوورکوٹ پہنے، چھتری ہاتھ میں لیے، میں کرینوں کے درمیان گھومتا پھرتا ہوں، نمک اور زنگ کی بُو سونگھتا، جہازیوں سے بات چیت کرنے کی کوشش کرتا۔ میں ابھی تک یہ سوچ رہا ہوں کہ کہاں جاؤں۔ پہلے میں نے سوچا تھا یوروپ میری منزل ہوگا۔ پھر خیال آیا کیوں نہ یونانی جزیروں پر جا کر رہ جاؤں۔ میری ایک ترک جہاز کے کپتان سے باسفورس کے سفر کی بات چیت چل رہی تھی کہ اس اثنا میں میں نے ایک احمقانہ قیمت پر قبرص تک آنے جانے کا جہاز کا ٹکٹ خرید لیا۔ میں نے جہاز میں چڑھ کر اپنی ہونے والی کیبن کے دروازے کو چھتری سے تھپتھپایا۔

یہ سفر میری جہاں گردی کا نقطۂ آغاز ہوگا۔ اس کے بعد کوئی اور سفر، کوئی اور منزل۔

میرا بیٹا مسلسل لکھتا رہتا ہے، کھڑے کھڑے، گویا عبادت میں مصروف ہو۔ اس کے کاغذ کھڑکی کی منڈیر پر بکھرے رہتے ہیں، جس کو وہ میز کے طور پر استعمال کر رہا ہے۔ کاغذوں کے قریب ایک چھوٹی سی لغت رکھی رہتی ہے جس کو اس نے اس تمام ہنگامے میں کسی طرح بچا لیا ہے۔ میں جب اس کا ہیولا دیکھتا ہوں، مجھے خیال آتا ہے: یہ جیسا بھی ہے، کسی عورت کے ساتھ سو سکتا ہے۔ اور کیا معلوم؟ ہو سکتا ہے وہ یہ کر بھی چکا ہو۔ اس نے اب تک میری ریٹائرمنٹ کی حقیقت کو نہیں سمجھا ہے، میری متوقع روانگی کو۔ وہ اپنے مشغلے میں مصروف ہے۔ ایک دوپہر میں نے بڑی مشکلوں سے اسے اس جنون سے نکالا اور اپنے ساتھ بوڑھے جلد ساز سے ملاقات کرانے یروشلم لے گیا۔

وہ سردیوں کا ایک لطیف سا دن تھا۔ بادل چھائے ہوئے تھے لیکن بارش نہیں ہو رہی تھی۔ یروشلم

کے بس اسٹیشن پر بوڑھا جلد ساز سامان ڈھونے والے پرانے، چھوٹے سے ٹرک میں ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ ٹرک کے پچھلے حصے میں بغیر جلد کی کتابوں کے انبار ہچکولے کھا رہے تھے۔ وہ ہمیں شہر کے مضافات میں لے گیا۔ درختوں سے لدی پھندی وادی کے دامن میں، سرحد کے قریب کی آبادی میں اس کا گھر تھا۔ اس نے خاموشی سے ہمیں گھر میں داخل ہونے کا اشارہ کیا اور اس کی بیوی نے خاموشی سے ہمارا استقبال کیا۔ چائے اور کیک سے ہماری تواضع کی گئی اور ہمیں کھانے کی میز کے گرد بٹھایا گیا۔

میں ان لوگوں سے مل کر بہت خوش ہوا۔ انھوں نے نہایت غور سے میرے بیٹے کا جائزہ لیا۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اسے دیکھ کر خوشی سے کھل اٹھے لیکن ان دونوں نے اطمینان کا سانس ضرور لیا۔ غالباً وہ بدتر حالت کی توقع کر رہے تھے۔ رفتہ رفتہ ہمارے درمیان بات چیت کا سلسلہ شروع ہوا۔ میں یہ جان کر حیران رہ گیا کہ جلد ساز میرے نام سے واقف تھا اور اسے یقین تھا کہ اس نے میری کوئی تحریر پڑھ رکھی تھی (گو نہ معلوم کیوں اس کا خیال تھا کہ میں نثر نگار ہوں) لیکن یہ بیس برس پہلے کی بات تھی۔

سچ تو یہ ہے کہ میں بے حد ممنون تھا۔ باہر ہوا سرسرا رہی تھی۔ میز پر رکھے سماوار میں چائے جوش کھا رہی تھی (عجیب و غریب قدیم عادتیں!)۔ جلد ساز کے گھر کے باغ میں ایک پرانا درخت بھی تھا، ہمارے درخت سے زیادہ بوڑھا اور پھیلا ہوا۔ اس کا تنا گٹھیلا اور گرہ دار تھا۔ سردیوں کی شفق کھڑکی سے پرے پھیکی پڑ رہی تھی۔ سرمئی آسمان میں ڈوبتے سورج کے شعلے لپک رہے تھے۔ دو وقتوں کی ملتی ہوئی سرحدیں۔ وہ میرے برابر بے حس بیٹھا تھا، بھاری ڈیل ڈول کا نوبالغ لڑکا۔ چائے کا بھرا ہوا پیالہ اس کے سامنے جوں کا توں رکھا تھا۔ کیک کو اس نے ہاتھ تک نہ لگایا تھا۔ وہ جھکا ہوا بیٹھا تھا، اس کی نظریں اندھیری ہوتی کھڑکی پر جمی تھیں۔ وہ ہماری گفتگو نہیں سن رہا تھا، اپنی ہی دنیا میں گم تھا۔ اچانک وہ اپنی جیب سے ایک کاغذ نکالتا ہے، الفاظ سے سیاہ کاغذ۔ وہ اس کو کھول کر اپنے سامنے رکھتا ہے، اس پر ایک لفظ لکھتا ہے اور تہہ کر کے دوبارہ رکھ لیتا ہے۔

ہماری گفتگو تھم جاتی ہے۔ بوڑھا جلد ساز اور اس کی بیوی اس کو حیرت سے دیکھنے لگتے ہیں۔

''یہ لکھتا ہے...'' میں مسکرانے کی کوشش کرتا ہوں۔

ان کی سمجھ میں نہیں آتا۔

''یہ شاعر ہے...''

''شاعر...'' وہ سرگوشی میں دہراتے ہیں۔

اسی لمحے باہر بارش شروع ہوگئی۔ شام کی نارنجی روشنی کمرے میں بھر گئی۔ وہ کھڑکی کے پاس بیٹھا تھا۔ لگتا تھا جیسے اس کے بالوں سے شعلے اٹھ رہے ہوں۔

وہ مجھے غیر یقینی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ اور وہ، قلم اس کی انگلیوں میں پھسلتا ہوا، ہم سب پر خاموش گمبھیر نظر ڈالتا ہے۔

''یہ نظموں کا مجموعہ چھپوائے گا۔ تم اس کی جلد بنا سکتے ہو...'' میں جلد ساز سے کہتا ہوں۔

جلد ساز کی کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ کیا میں اس کا مذاق اڑا رہا ہوں؟ بالآخر ایک شک میں لپٹی ہوئی مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل جاتی ہے۔

''یقیناً اس کی کتاب چھپے گی۔ ہم اس کی جلد بنائیں گے...''

''مفت میں؟'' میں چھیڑتا ہوں۔

''ہاں، مفت میں...''

میں اٹھتا ہوں۔

''ٹھیک ہے، وعدہ رہا۔ سنا تم نے...'' میں اس سے مخاطب ہوتا ہوں۔

اس نے نہیں سنا۔

(باہر نکلنے سے پہلے جلد ساز اور اس کی بیوی مجھے ایک کونے میں لے گئے اور یاد دلایا کہ لڑکے کی بیماری کی صورت میں وہ اس کے ذمے دار نہ ہوں گے۔ میں نے انھیں تسلی دی کہ ایسی کوئی بات نہیں ہوگی اور یہ کہ اس صورت میں انتظام کر لیا گیا ہے۔)

ہم باہر نکل آئے۔ جلد ساز ہمیں بس اسٹیشن تک نہ چھوڑ سکتا تھا کیونکہ اس کے ٹرک کی بتی خراب تھی۔ ہم نے ان دونوں کو خدا حافظ کہا، اور خاموش، برستے ہوئے آسمان کے نیچے سڑک پر چلنے لگے۔ وہ قطعی بے حسی کی حالت میں تھا۔ وہ کولتار کی سڑک پر اپنے پیر گھسیٹتا ہوا چل رہا تھا۔ ہم بس اسٹیشن پر پہنچے اور اسٹینڈ کے نیچے کھڑے ہو گئے۔ ہمارے اطراف زیرِ تعمیر رہائشی عمارتیں تھیں، ننگی چٹانیں اور خاکستر زمین۔ شہر اور ویرانے کا ملاپ۔ یروشلم کی اداس ترین صورت، ہمیشہ برباد۔ یروشلم کو جتنا بھی تعمیر کیا جائے، اس کی تباہی کی یاد باقی رہے گی۔

میں اس کی طرف مڑا اور میرے منھ سے صاف اور واضح الفاظ نکلے:

''جلد ساز اور اس کی بیوی بہت اچھے لوگ ہیں۔ لیکن تمھیں ان کے ساتھ تمیز کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔''

وہ خاموش رہا۔ ایک سائیکل سوار قریب سے گزرا۔ اس کی نظر لڑکے پر پڑی اور اس نے چہرہ فوراً موڑ لیا۔

اب بالکل اندھیرا تھا۔ رہائشی علاقوں میں بتیاں ایک ایک کر کے روشن ہو رہی تھیں۔ ہم دونوں شیڈ کے نیچے تنہا کھڑے تھے۔ اچانک میں نے کہا، ''میں نے اس صفحے پر نظر ڈالی تھی۔ اس میں ایک نظم لکھی ہوئی تھی۔ دیکھا تم نے، تم خود سے لکھ سکتے ہو۔ تمھیں میری ضرورت نہیں ہے...''

اس نے نظریں اٹھا کر مجھے دیکھا اور خاموش رہا۔

میں اس کے قریب ہو گیا، بہت قریب۔

''مجھے وہ نظم دکھاؤ۔''

''نہیں۔''

''کیوں؟''

''تم اسے پھاڑ دو گے...''

''نہیں نہیں۔ میں نہیں پھاڑوں گا۔''

اور میں نے کاغذ لینے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔ لیکن وہ پیچھے ہٹ گیا۔ میں نے زبردستی اس سے کاغذ لینے کی کوشش کی لیکن وہ مدافعت کرنے لگا۔ اس دفعہ وہ مجھے یقیناً مار سکتا تھا۔

ایک اور سائیکل قریب سے گزری۔ دور سے آتی ہوئی بس کی آواز سنائی دی۔

یہ اس کی نظم کے بارے میں ہماری آخری بات چیت تھی۔

مجھے معلوم نہ تھا۔

یہ تین دن پہلے کی بات تھی۔

یہ موسم کتنا جان لیوا ہے۔ کھڑکیوں پر برف کے ذرے چمٹے رہتے ہیں یا دھند جمی رہتی ہے۔ اتنی

شدید سردی پہلے کبھی نہیں پڑی۔ یہ کبھی نہ ختم ہونے والی سرمئی دھند، رات اور دن، صبح کے وقت مزید گہری ہوتی ہوئی۔ یہ آئینے میں کون ہے؟ میں، اب تک۔ ایک دراڑ پڑے پتھر کی طرح۔ صرف آنکھیں نمایاں ہیں، چمکتی ہوئی، حیرت انگیز طور پر زندہ۔

میں اب رخصت ہونے والا ہوں۔ ایک کشتی نکل چکی ہے۔ اس پر میں سوار نہ ہو پایا۔ دوسری کشتی میری منتظر ہے۔ مجھے صرف ضروری اشیا سوٹ کیس میں ٹھونسنی ہیں، تولیے تہہ کرنے ہیں، رقم اٹھانی ہے اور چل پڑنا ہے۔ ہمیں ان دو گدوں پر گزارا کرتے ہوئے اب دو ہفتے سے زائد ہو چلے ہیں۔ نیا مالک مکان روز آتا ہے اور ہمیں وہیں پاتا ہے۔ اب اس کے ضبط کا بندھن ٹوٹنے ہی والا ہے۔ وہ میرے گرد منڈلاتا رہتا ہے، اس انتظار میں کہ اب میں اپنا بوریا بستر باندھ کر رخصت ہو جاؤں۔ کل اس نے دھمکی بھی دی کہ وہ مجھ پر مقدمہ کر دے گا۔ اس نے اس مکان پر زندگی بھر کی جمع پونجی لگا دی ہے۔ اس کے بھی کچھ خواب ہیں۔

بس اب مجھے اپنا بوریا بستر واقعی سمیٹنا ہے۔ لڑکے کو بوڑھے جلد ساز کے پاس یروشلم روانہ کرنا ہے، سرحد کے قریب جو اس کا انتظار کر رہا ہے۔ اب اس کو مزید التوا میں نہیں ڈالنا چاہیے۔ کیونکہ لڑکے نے روز رات کو آوارہ گردی شروع کر دی ہے۔ اس نے لکھنا بند کر دیا ہے۔ کل میں نے آدھی رات تک اس کا انتظار کیا لیکن وہ اس وقت تک نہ لوٹا تھا۔ وہ پو پھٹے کے قریب واپس آیا۔ اس کے قدموں کی آہٹ سے میری آنکھ کھلی۔

بالکنی کا دروازہ میرے ہاتھوں کے نیچے چرچراتا ہے۔ فرش گیلا ہے۔ اس پر ٹوٹے ہوئے پتے اور ٹہنیاں بکھری ہوئی ہیں، گئے طوفان کے نشانات۔ آسمان سرد اور بے امید ہے۔ ہلکی ہلکی بارش اور صبح کی روشنی۔ یہ وسیع اور مانوس کائنات میرے سامنے یوں خاموشی سے قطرہ قطرہ ٹپکتی ہوئی۔ درخت کے پتے سرسراتے ہوئے۔

کیا میرے اندر لکھنے کی کوئی خواہش نہ رہی تھی؟ کیا میرا جی نہ چاہتا تھا کہ کچھ کہوں؟ لیکن کہنے کے لیے اب کیا باقی رہا تھا۔ میں بتاتا ہوں: یہ سب ایک دھوکا ہے، مایا ہے۔ دیکھو، ہمارا چنار تک گر رہا ہے۔ اس کی چھال تہہ بہ تہہ اترتی جا رہی ہے۔ باغ کے رنگ پھیکے پڑ گئے ہیں، پتھروں پر کائی جم رہی ہے۔

ایک سست رو تیر کی مانند آسمان کی جانب اٹھ جانا۔ روئی کے گالوں جیسے بادلوں میں لپٹ جانا۔

واپس زمین پر اترنا اور بے تغیر نیلاہٹ کو تکتے رہنا۔

میں شاعر ہوں جسے شاعری سے چھٹی مل گئی ہے۔ اب بارش ہو رہی ہے۔ قطرے میرے اوپر گر رہے ہیں۔ میں واپس اندر جاتا ہوں۔ مکان میں ایک اداس سی خاموشی چھائی ہوئی ہے۔ خراٹوں کی مدھم آواز اس میں تیر رہی ہے۔ میں اوپر اس کے کمرے میں جاتا ہوں، میرا گاؤن زمین پر گھسٹتا ہوا، میرا بھاری سایہ بند دروازوں پر پڑتا ہوا۔

وہ فرش پر بچھے گدے پر سو رہا ہے۔ فرش پر رکھا ایک چھوٹا سا لیمپ اس کے سرہانے روشن ہے۔ وہ اب تک بغیر اس ابدی روشنی کے نہیں سو سکتا۔ کھڑکی پہ پڑی چق سے صبح کی روشنی چھن چھن کے اندر آ رہی ہے۔

میں خاموشی سے اپنے قدموں میں اس کو سوتا ہوا دیکھتا ہوں۔ جب واپس جانے کے لیے مڑتا ہوں تو اچانک میری نظر اخبار کے چند صفحوں پر پڑتی ہے جو اس کے گدے کے پاس فرش پر بکھرے پڑے ہیں۔ مجھ پر دہشت طاری ہو جاتی ہے۔ میں فوراً جھک کر صفحے اٹھاتا ہوں۔ صفحے اب تک نم ہیں۔ ان کی سیاہی میری انگلیوں پر اتر آتی ہے۔ میں کھڑکی کے قریب جاتا ہوں جہاں صبح کی ہلکی سی روشنی ہے۔

کسی فضول سے ہفتہ وار اخبار کا ضمیمہ ہے۔ اور تاریخ... تاریخ آج کے دن کی ہے، دن جو ابھی شروع ہونے والا ہے۔ میں بے جان ہاتھوں سے صفحے پلٹتا ہوں۔ ایک صفحے کے حاشیے کے قریب ایک پاگل پنے کی نظم، بغیر آہنگ کے، سطریں جو اچانک ختم ہو جاتی ہیں، ہبکانے والی تکرار، بے طور اوقاف۔

اچانک خاموشی گہری ہو جاتی ہے۔ اس کی سانسوں کی آواز رک گئی ہے۔ وہ آنکھیں کھولتا ہے، بوجھل، سرخ، نیند میں ڈوبی آنکھیں۔ اس کے ہاتھ گدے کے قریب رکھی ہوئی عینک کو تلاش کرتے ہیں۔ وہ عینک پہنتا ہے اور کھڑکی کی طرف مجھے دیکھتا ہے۔ ایک نرم، دل رُبا، کچھ اداس سی مسکراہٹ اس کے چہرے کو جگمگا دیتی ہے۔

اب میری نظر پڑتی ہے۔ وہ میرا نام ہے جو نظم کے اوپر شکستہ خط میں لکھا ہوا ہے۔

**

ڈونلڈ بارتھیم

غبارہ

غبارے کے کھلنے کا آغاز اسٹریٹ نمبر چودہ پر ایک نقطے سے ہوا جس کے قطعی محلِ وقوع کا راز میں آشکار نہیں کرسکتا۔ اس رات، جب لوگ محوِخواب تھے، غبارہ شمال کی اور پھیلا، یہاں تک کہ وہ پارک تک پہنچ گیا۔ وہاں میں نے اس کو روک لیا۔ پو پھٹنے تک اس کا شمالی ترین کنارہ پلازا کے اوپر چھا چکا تھا۔ فضا میں آزادانہ لٹکا ہوا وہ دھیمے دھیمے ڈول رہا تھا۔ اس کے اوپر اٹھنے کے عمل میں جب کوئی شے، حتیٰ کہ درخت بھی آڑے آئے تو میری طبیعت ہلکی سی مکدّر ہوئی۔ کوئی وجہ نہ تھی کہ غبارے کو فضا میں بلند ہونے سے روکا جاتا۔ میں نے انجینئروں سے کہا کہ وہ غبارے کو فضا میں مزید بلند ہونے دیں۔ غبارے کا پھیلاؤ صبح تک جاری رہا۔ والو میں گیس مدھم سرگوشیوں میں داخل ہوتی رہی۔ غبارے نے شمالاً جنوباً پینتالیس بلاک، شرقاً غرباً بے ترتیب علاقہ اور ایونیو کے دونوں اطراف قریباً چھ بلاک اپنی لپیٹ میں لے لیے تھے۔ تو یہ صورتِ حال تھی اس وقت۔

لیکن ''صورتِ حال'' کہنا غلط ہے۔ اس سے مخصوص ''حالات'' کا تصور ذہن میں آتا ہے۔ ''حالات''، جن کا کوئی حل ہوتا ہے، ''حالات''، جن کا پیدا کردہ تناؤ کسی نتیجے پر پہنچنے کے بعد زائل ہو جاتا ہے۔ لیکن وہاں تو ایسی کوئی ''صورت حال'' نہ تھی، کوئی ایسے ''حالات'' نہ تھے۔ بس ایک غبارہ تھا جو فضا میں معلّق تھا۔ دھیمے، بوجھل خاکستری اور بادامی رنگوں میں ڈوبا ہوا، جن میں گہرے اور ہلکے زرد رنگ اُبھر رہے تھے۔ غبارے کی سطح کھردری اور ناہموار تھی، جیسے کوئی اس پر کام کرتے کرتے اس کو بھول گیا ہو۔ یہ خاصیت دانستہ طور پر پیدا کی گئی تھی اور غبارے کی پُر مہارت تنصیب نے اس خاصیت کو اور بھی

نمایاں کر دیا تھا۔ غبارے کے نیچے ترتیب سے لگے ہوئے پھسلتے ہوئے باٹوں نے اس وسیع پھیلاؤ کو کئی مقامات سے تھام رکھا تھا۔ یوں تو گیس کے غباروں کی تاریخ انوکھے خیالات، نادر نمونوں اور اہم سنگ میلوں سے بھری پڑی ہے لیکن اس لمحے وہاں صرف یہ غبارہ تھا، ٹھوس، قطعی، معلق۔

اس نے کئی ردعمل پیدا کیے۔ چند لوگوں کو غبارہ ''دلچسپ'' لگا۔ یہ ردعمل غبارے کے وسیع و عریض پھیلاؤ کو دیکھتے ہوئے کچھ ناموزوں تھا، گو کہ دیوانگی اور فکر و اندیشے کی عدم موجودگی کی بنا پر اُس کو یقیناً ایک پرسکون اور پختہ ردِعمل کہا جا سکتا ہے۔ شروع میں لوگوں کے درمیان غبارے کے معنی پر کچھ بحث ہوئی، اور تھم گئی۔ کیونکہ ہم نے مقصد کو جاننے کی کوشش کیے بغیر جینا سیکھ لیا ہے اور اب تو معنی کی جستجو خال خال ہی رہ گئی ہے، سوائے ان مظاہر کے جو انتہائی سادہ اور یقینی ہوتے ہیں۔ اس بات پر اتفاق رائے تھا کہ غبارے کے معنی حتمی طور پر معلوم نہیں ہو سکتے لہٰذا اس پر طویل بحثوں میں الجھنا فضول ہے۔ یا کم از کم یہ بحث ان لوگوں کے عمل سے کم کارآمد تھی جو سبز اور نیلے کاغذ کی بتیاں گلی کوچوں میں لگاتے ہیں، یا جو دیواروں پر پیغام لکھ لکھ کر ملاقاتوں اور غیر فطری افعال کے لیے اپنی دستیابی کا اعلان کرتے ہیں۔

چند کھلنڈرے بچے اچھل اچھل کر غبارے کو اس جگہ سے چھو لینے کی کوشش کر رہے تھے جہاں غبارہ عمارت کی سطح کے بالکل قریب تھا۔ یہاں تک کہ غبارے اور عمارت میں چند انچ کا فاصلہ رہ گیا تھا اور دونوں یکجان نظر آتے تھے۔ غبارے کی اوپری سطح اس طرح بنائی گئی تھی کہ ایک منظر سا ابھر آیا تھا۔ چھوٹی چھوٹی وادیاں، ٹیلے اور نشیب و فراز۔ غبارے کے اوپر چڑھ کر اس وادی کی سیر ممکن تھی۔ ڈھلوان سطح پر دوڑ کا لطف اٹھایا جا سکتا تھا۔ ایک ٹیلے سے دوسرے ٹیلے پر زقند بھری جا سکتی تھی۔ تنی ہوئی اس وادی میں آپ گیند کی طرح ٹپے کھا سکتے تھے یا اگر آپ کا دل چاہتا تو لڑھک سکتے تھے۔ غبارے کے اوپر مختلف حرکات کے یہ امکانات بچوں کے لیے کافی سنسنی خیز تھے، کیونکہ وہ شہر کی سخت اور چٹیل سطح کے عادی تھے، لیکن غبارے کا مقصد بچوں کی تفریحِ طبع نہ تھا۔

ان لوگوں کی تعداد، بچے اور بڑے سب ملا کر، جنھوں نے غبارے کی سطح پر حرکات کے ان مواقع کا فائدہ اٹھایا، اتنی زیادہ نہ تھی جتنی کہ ہو سکتی تھی۔ ایک خاص قسم کی جھجک، غبارے پر عدم اعتماد۔ اس کے علاوہ غبارے سے ایک طرح کا بیر۔ کیونکہ ہم نے وہ پمپ چھپا دیے تھے جن سے غبارے کے اندر ہیلیم بھری گئی تھی، اور پھر اس کا پھیلاؤ اتنا زیادہ تھا کہ حکام داخلے کے مقام کا کھوج نہ لگا سکتے تھے،

یعنی اس مقام کا جہاں سے غبارے میں گیس بھری گئی تھی۔ شہر کے حکام، جن کے دائرۂ کار میں اس غبارے کا ظہور ہوا تھا، جھنجھلاہٹ کا شکار تھے۔ غبارے کی بے مقصدیت نے انھیں بے چینی میں ڈال دیا تھا۔ (اور پھر یہ امر کہ وہ وہاں موجود تھا!) اگر ہم نے بڑے بڑے حروف میں غبارے پر لکھ دیا ہوتا: ''لیبارٹری کے نتائج اس کی تصدیق کرتے ہیں کہ...'' یا ''اٹھارہ فیصد زیادہ کارگر!'' تو یہ پریشانی پیدا نہ ہوئی ہوتی، لیکن میں غبارے پر اس قسم کی کوئی چیز لکھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ مجموعی طور پر حکام کافی متحمل نکلے، گو کہ یہ برداشت دو وجوہات کی بنا پر پیدا ہوئی تھی۔ اوّل تو یہ کہ رات کو خفیہ ٹیسٹ کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ غبارے کو نہ ہٹایا جا سکتا ہے اور نہ ہی برباد کیا جا سکتا ہے۔ دوسرا یہ کہ عام شہریوں میں غبارے کے لیے کافی گرم جوشی پائی جاتی تھی۔

جس طرح ایک غبارہ تمام غباروں کے بارے میں زندگی بھر کی سوچ کی نمائندگی کرتا ہے، اسی طرح ہر شہری کا غبارے پر ردِ عمل دراصل چند پیچیدہ رویوں کا غماز تھا۔ ہو سکتا تھا ایک شخص کے ذہن میں غبارے کا تصور آلودگی سے وابستہ ہو، جیسا کہ اس جملے سے اظہار ہوتا ہے، ''اس وسیع غبارے نے مین ہیٹن کے شفاف اور چمکتے آسمان کو آلودہ کر دیا۔'' اس شخص کے خیال میں غبارہ ایک طرح کی عیّاری تھی جو لوگوں اور ان کے ''آسمان'' کے درمیان حائل ہو گئی تھی۔ لیکن درحقیقت وہ جنوری کا مہینہ تھا، آسمان کہر سے گھرا ہوا، تاریک اور بدنما ہو رہا تھا۔ وہ آسمان ایسا نہ تھا کہ آپ کا دل چاہے کہ کھلی زمین پر لیٹ کر مسرت سے اس کو تکیں۔

غبارے کا اندرونی حصہ دل فریب تھا۔ اس کے بوجھل، سلیٹی اور خاکستری رنگ اخروٹی اور پیلے ملائم رنگوں میں اُبھر رہے تھے۔ لہٰذا گو کہ وہ شخص ''آلودگی'' کے بارے میں سوچ سکتا تھا، اس کے ذہن میں ایک پُر لطف ادراک کی آمیزش ہوتی، ایسا ادراک جو اس کے پہلے خیال سے دست و گریباں ہو رہا ہوتا۔

دوسرے شخص کے لیے غبارے کا ظہور ایک غیر متوقع انعام کی مانند ہو سکتا تھا۔ مثلاً آپ کا افسر آپ کے کمرے میں داخل ہو کر اچانک کہے: ''ہنری، یہ لو۔ اس لفافے میں تمھارے لیے روپے ہیں کیونکہ ہماری کمپنی دن رات ترقی کر رہی ہے۔ اور جس ادا سے تم گلدان میں لگے پھولوں کو مَسلتے ہو، مجھے بے حد پسند ہے۔ بلکہ میں سمجھتا ہوں اگر تم ان پھولوں کو نہ مسلو تو شاید ہمارا بزنس اتنا عمدہ نہ چلے۔'' اس

شخص کے لیے غبارہ ایک شاندار اور جرأت آمیز تجربہ تھا، گو کہ ایسا تجربہ جس کو صحیح طور پر سمجھا نہ گیا ہو۔

ایک اور شخص کہہ سکتا تھا، ''...کی مثال کے بغیر شبہ ہے کہ... موجودہ صورت میں پایا جاتا۔'' کئی لوگ اس سے متفق ہوتے اور بہت سے لوگوں کو اس کی بات سے اختلاف ہوسکتا تھا۔ ''پھیلنا'' اور ''منڈلانا''، ''خواب'' اور ''ذمے داری'' جیسے تصورات متعارف ہوے۔ کچھ لوگ طویل تخیلات کے تانے بانے بننے میں مصروف ہوگئے۔ تخیلات جن کا تعلق غبارے میں خود کو گم کردینے یا سمو دینے سے تھا۔ ان خواہشات کا ذاتی پہلو، ان کا منبع، انسانی شخصیات کی انجانی عمیق گہرائیوں میں دفن تھا، لہٰذا ان خواہشات کا برملا اظہار نہ ہو پایا۔ لیکن اس بات کے شواہد موجود تھے کہ یہ خواہشات عام تھیں۔ اس پر بھی بحث ہوئی کہ آپ غبارے کے نیچے کھڑے ہو کر جو محسوس کرتے اس احساس کی خاص اہمیت تھی۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ غبارے کے نیچے انھیں تحفظ اور گرمائی کا ایسا انوکھا احساس ہوا جو انھیں زندگی میں پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ جبکہ غبارے کے دشمنوں نے ایک طرح کی بوجھل اور جکڑے جانے کی سی کیفیت کا اظہار کیا۔ تنقیدی آرا میں اختلاف پایا جاتا تھا: ''ہولناک بوچھار''، ''بربط''، ''روحانی مسرت''، ''بڑے، چوکور کونے''، ''تاریک حصوں سے کچھ متضاد''، ''دقیانوسی انتخابیت، جواب تک غباروں کے نمونوں پر حاوی ہے''، ''غیر معمولی قوت''، ''نرم گرم خوابیدہ گزرگاہیں''، ''کیا وحدت کو وسعت پر قربان کردیا گیا ہے؟''، ''تباہی کا پیش خیمہ''، ''چباتا ہوا۔''

لوگوں نے ایک خاص طریقے سے غبارے کے ذریعے مقامات کا تعین کرنا شروع کردیا: ''میں وہاں ملوں گا جہاں وہ سنتالیسویں اسٹریٹ پر فٹ پاتھ تک اتر آیا ہے، آلامو چلی ہاؤس کے نزدیک۔'' ''ہم اس کے اوپر جا کر کیوں نہ کھڑے ہوجائیں تازہ ہوا کھانے؟ بلکہ چہل قدمی بھی کرسکتے ہیں، جہاں پر یہ ماڈرن آرٹ گیلری کے چھجے سے تنی ہوئی کمان کی طرح لگا ہوا ہے۔''

جہاں ایک سطح دوسری کو کاٹتی تھی وہاں اضافی موڑ نکل آئے تھے۔ ان مقامات پر وقتی طور پر راستے سے کھل جاتے تھے، ''نرم، گرم، خوابیدہ گزرگاہوں'' کے علاوہ۔ لیکن انھیں ''اضافی موڑ'' کہنا غلط ہے۔ ہر موڑ اپنی جگہ اہم تھا اور نظر انداز نہ کیا جاسکتا تھا۔ کسی موڑ پر غبارے کا غبارے سے اتصال تھا، کہیں غبارے کا انسان سے ملاپ اور کہیں غبارے کا عمارت سے وصل۔

خیال تھا کہ غبارے کا جو پہلو پسند کیا گیا وہ اس کی لا متناہیت تھی۔ اس کی حدیں متعین نہ تھیں۔ کبھی کبھار کوئی پھولا ہوا، آبلہ نما حصہ خود بخود تیرتا ہوا مشرق کی اور، دریا کی جانب نکل جاتا، جیسا کہ فوج کی حرکت میدانِ جنگ سے دور ہیڈ کوارٹر میں نقشے پر نظر آتی ہے۔ پھر وہ حصہ دوبارہ اپنی جگہ آجاتا گویا کہ اسے واپس دھکیل دیا گیا ہو۔ یا پھر وہ حصہ ایک نئی صورت میں ڈھل جاتا، نئی آماجگاہ تلاش کر لیتا، اور اگلی صبح غائب ہو چکا ہوتا۔ غبارے کی یہ خاصیت، اپنی ماہیت بدلنا، تبدیل ہونا، لوگوں کے لیے بے حد خوش کن تھی، کیونکہ ان کی اپنی زندگیاں بے لوچ، کڑے سانچوں میں ڈھلی ہوئی تھیں۔ ان کے لیے تغیر ایک ایسی آرزو کی مانند تھا جس کو وہ پا نہ سکتے تھے۔

بائیسویں دن، ہمارے قدموں تلے کنکریٹ کے فٹ پاتھ پر بنے ہوئے قطعی اور یکساں مستطیلوں کے برعکس، غبارے کا بے ترتیب وجود ذات کی گمشدگی کا امکان پیش کرنے لگا۔ مشینوں کی بڑھتی ہوئی اہمیت نے مخصوص تربیت کی میعاد اور طویل سپردگی کی ضرورت کا احساس بڑھا دیا ہے۔ جیسے جیسے یہ رجحان بڑھتا جا رہا ہے، زیادہ سے زیادہ لوگ ایک الجھانے والی عدم مناسبت کی بنا پر ان جوابات کی طرف مائل ہو رہے ہیں جن کا ایک نمونہ وہ غبارہ تھا۔

جب تم ناروے سے واپس آئیں تو میں تم سے غبارے کے نیچے ملا۔ تم نے پوچھا کیا وہ میرا ہے۔ میں نے اثبات میں جواب دیا۔ ''غبارہ،'' میں نے کہا، ''فطری خود نوشت کا ایک مظہر ہے۔ اور اس اضطراب، اور جنسی محرومی، کا آئینہ دار جو میں نے تمھاری عدم موجودگی میں محسوس کی۔ اب جبکہ تم ہیرگن سے واپس آچکی ہو، نہ اس کی ضرورت باقی رہی ہے اور نہ ہی یہ موزوں لگتا ہے۔''

غبارے کو ہٹانا آسان تھا۔ لحیم و شحیم اور لمبے ٹرک ہوا نکلے ہوئے غبارے کو لاد کر لے گئے۔ اب وہ مغربی ورجینیا کے ایک گودام میں پڑا کسی غمگین لمحے کا منتظر ہے، شاید ایسا لمحہ جب ہم ایک دوسرے سے خفا ہوں۔

**

کیم مونزو

جہاں گرد

اس نے اپنی زندگی کے پہلے بیس سال سرکس میں گزارے۔ آج ایک جگہ پڑاؤ ہے تو کل دوسری سمت کوچ۔ ان بیس برسوں میں اس نے کبھی ایک شہر میں دوبارہ قدم نہ رکھا۔ کیا سرکس تھا وہ بھی، دیس دیس گھومتا ہوا، جیسے کوئی آوارہ گرد بے مقصد گلیوں گلیوں پھر رہا ہو۔ بازی گروں کا بیٹا، بچپن ہی سے وہ نت نئے اور انوکھے ماحول میں مست رہا۔ بونوں اور مسخروں سے اس کی یاری تھی؛ شیر اور اس کے سدھانے والے، تار پر چلنے والے، کمندوں پر جھولنے والے، آگ اگلنے والے، گھوڑے اور ہاتھی اس کے ساتھی تھے۔ وہ ایسے تین قبائلی امریکیوں اور دو انڈین رقاصاؤں سے واقف تھا جو چھریوں کی بوچھار سے زندہ سلامت نکل آتے۔ چودہ سال کی عمر میں اسے ایک لڑکی سے محبت ہوگئی جو لگاتار تین دن دوسری قطار میں آکر بیٹھتی رہی۔ تیسرے دن جب وہ اسٹیج پر کتوں کا تماشا دکھانے والی عورت کی مدد کر رہا تھا، لڑکی نے اس کو آنکھ ماری۔ وہ شرم سے سرخ ہوگیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ جواباً کیا کرے۔ جب تک اس کو لڑکی سے بات کی ترکیب سجھائی دیتی، سرکس کے خیمے اکھڑ چکے تھے، اور ویگنوں کی قطار دوسرے شہر کی طرف رواں دواں تھی۔

جب وہ بیس سال کا ہوا تو سرکس پر زوال کا وقت شروع ہو چکا تھا۔ سب کا خیال تھا کہ سرکس سنیما اور ٹی وی کا مقابلہ نہیں کر سکے گا۔ وہ جس سرکس میں ملازم تھا، اس نے اپنے خیمے ہمیشہ کے لیے لپیٹ لیے۔ جن کو کسی دوسرے سرکس میں نوکری مل سکتی تھی، وہ وہاں چلے گئے، لیکن سب ایسے خوش نصیب نہ تھے۔ اس عمر میں گو کہ اسے کسی اور سرکس میں اچھی جگہ مل سکتی تھی، اس نے آبائی پیشے کو خیر باد کہا

اور کسی ایک جگہ پڑاؤ ڈالنے کا فیصلہ کیا۔

وہ ایک ریلوے کمپنی میں کلرک لگ گیا۔ بیس سال تک اس نے اس شہر سے باہر قدم نہ نکالا۔ وہ اپنا ہر دن ٹرینوں کی آمد و رفت کے اوقات ترتیب دینے اور ان میں تبدیلیاں کرتے ہوئے گزارتا۔ ٹکٹوں پر چھپے ہوئے شہروں کے جانے پہچانے نام دیکھ کر اس کا دل کبھی نہ مچلتا کہ وہ دوبارہ وہاں جائے۔ جس نے آدھی دنیا بیس برس کا ہونے سے پہلے ہی دیکھ لی تھی، زندگی کے اگلے بیس سال ایک خاموش، سنسان مکان اور آہنی دروازوں والے دفتر میں کاٹ دیے۔ بیس سال تک وہ ایک ہی سڑک پر چل کر دفتر جاتا رہا۔

شروع کے دنوں میں شام کے وقت، بند دروازے کے پیچھے، تنہائی سے اکتا کر اس نے باری باری ان تمام شہروں کو یاد کرنا شروع کیا جو اس نے کبھی دیکھے تھے۔ پھر اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کا ماضی دن بدن دور ہوتا جا رہا ہو۔ شاید ٹھہری ہوئی زندگی گزارنے کے لیے ایک خاص قسم کی طبیعت درکار ہوتی ہے۔ شاید وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ اس یکساں، ساکت زندگی کا عادی ہو جائے گا۔ وہ سوچتا۔ وہ اس ماحول اور یکسانیت کا جلد ہی عادی ہو گیا، جو اس کو اندر سے چاٹ چاٹ کر کھوکھلا کیے دے رہی تھی۔ نہ صرف یہ کہ وہ یکسانیت کے خلاف کسی ردِعمل کے قابل نہ رہا، بلکہ اس میں بیتے ہوئے دنوں کو یاد کرنے کی صلاحیت بھی ختم ہو گئی۔

لیکن ہر رات باقاعدگی سے، ایک کاریگر کی صناعی سے، وہ ایک متوازی زندگی خواب میں دیکھتا، وہ زندگی جو اس نے بیس سال تک دیس دیس گھوم کر گزاری تھی۔ ہر شب، ماضی کا ایک دن اس کے خواب میں جلوہ افروز ہوتا۔ اس طرح جب وہ چالیس برس کا ہوا تو اس نے خواب میں دیکھا کہ سرکس ختم ہو گیا ہے اور اس نے ایک جگہ سکونت اختیار کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ آدھی رات کو اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ پسینے میں شرابور گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ جیسے چھت کسی لمحے اس پر آ گرے گی۔ بیس سالہ خواب سے جاگنے پر اس نے اپنی ساری جمع پونجی بیچ ڈالی، اسٹیشن پہنچا اور پہلی ٹرین پکڑ لی۔

وہ شہر شہر گھومتا پھرا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ کھوئے ہوئے برسوں کا مداوا کرے گا۔ اس نے شہروں کی فہرست سے وہ نام کاٹ دیے جہاں وہ پہلے جا چکا تھا۔ پچاس برس کا ہونے تک وہ دنیا کا باقی

آدھا حصہ بھی گھوم چکا تھا جو اس نے اپنی زندگی کے اوائل میں نہ دیکھا تھا۔ ہر شہر سے نکلتے ہوئے اسے احساس ہوتا کہ وہ وہاں سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو رہا ہے۔ اس کی پہلی نظر ہی آخری نظر ہوتی۔

تمام دنیا دیکھ لینے کے بعد، اب کسی اَن جانی جگہ پر قدم رکھنا اس کے لیے ممکن نہیں رہا تھا۔ کئی دنوں سے اسے خواب بھی نظر نہیں آ رہے تھے۔ اس نے اس شہر کا نام یاد کرنے کی کوشش کی جہاں اس نے پہلی بار ایک لڑکی کو پیار کیا تھا۔ وہ لڑکی اس کی عَم زاد تھی، اور تاروں پر چلتی تھی۔ ذہن پر زور ڈالنے کے باوجود وہ یاد نہ کر سکا کہ آیا وہ شہر برلن تھا یا ڈان زِگ۔ کیا اس نے تمام چیزیں تفصیل سے دیکھی تھیں، اس نے خود سے سوال کیا۔ اگر ایسا تھا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ اسے شہر کا نام یاد نہ رہتا۔ بہت سی جگہیں ایسی تھیں جن کو یاد رکھنا اب اس کے لیے ممکن نہ رہا تھا۔ ماضی کے کچھ حصے معدوم ہوتے جا رہے تھے۔ اسے احساس ہوا کہ دریاؤں کے رخ وہ نہ تھے جو کبھی اس کو یاد تھے۔ آخر دنیا دیکھنے کا کیا مقصد تھا جبکہ بالآخر یہ تمام شبیہیں ذہن سے معدوم ہو جانی تھیں، اس نے سوچا۔ اسے اپنی زندگی ایک تنے ہوئے تار کی مانند محسوس ہوئی۔

وہ برما کی ٹرین کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ اس کی فہرست کا سب سے پہلا شہر اس کے ذہن سے بالکل معدوم ہو چکا تھا۔ یہ وہ شہر تھا جہاں وہ پیدا ہوا تھا۔ اس کو احساس ہوا کہ اب اس کے لیے یہ یاد کرنا مشکل سے مشکل تر ہوتا جا رہا تھا کہ اس کی ماں کیسی تھی۔ اسے یوں لگتا تھا جیسے اس کی ماں کی شبیہ ایک آبی آئینے میں تحریر ہو اور لہروں میں گُھل کر تحلیل ہوتی جا رہی ہو۔ لکڑی کی بنچ پر بیٹھا وہ ریل کی پٹریوں کے بیچ اُگی ہوئی خودرَو گھاس کو تکتا رہا۔ اچانک وہ چونک اٹھا۔ اس کی نظروں کے سامنے کیا چیز تھی؟ وہ کیا دیکھ رہا تھا؟ کیا وہ جنگلی گھاس تھی؟ سرکنڈے تھے؟ کیا تھا؟ درختوں، پودوں اور جڑی بوٹیوں کے نام اس کے ذہن سے غائب ہو چکے تھے۔ وہ قطار میں لگے ہوئے سبز پودے کون سے تھے، اس نے خود سے پوچھا۔

اسے لگا کہ وہ کہیں کھو گیا ہے۔ اس نے نظریں اٹھائیں۔ پٹریوں کی دوسری طرف ایک سرکس کا بڑا سا، پھٹا ہوا پوسٹر چسپاں تھا۔ لمحے بھر کے لیے اسے خوشی کا احساس ہوا۔ اسے سرکس دیکھنے کا خیال آیا۔ اتنے سال بعد اسٹیج کے بجائے تماش بینوں کی قطار میں بیٹھ کر سرکس دیکھنے کا خیال کچھ ایسا برا نہ تھا۔ اس نے تاریخ اور مقام دیکھنے کے لیے پوسٹر پر دوبارہ نظر ڈالی، لیکن اس کی نگاہیں پوسٹر پر بنے ہوئے

چہرے پر ٹِک گئیں۔ سفیدی پھرے ہوئے چہرے کی ایک آنکھ پر کانٹی کا نشان تھا، دوسری آنکھ کے نیچے ایک لکیر تھی۔ وہ مسحور ہو کر چمکتی ہوئی تکونی ٹوپی، پھولی ہوئی ناک اور موٹے موٹے ہونٹوں کو تکنے لگا۔ اس نے دیکھا کہ ہونٹ دو دفعہ ہنسی کی شکل میں کھلے اور بند ہو گئے۔

پلیٹ فارم پر سناٹا تھا۔ وہ بنچ پر نیم دراز ہو گیا اور آنکھیں موند لیں۔ جماہی لیتے ہوئے اس نے دائیں بائیں نظر دوڑائی۔ مجھے یہ تک یاد نہیں کہ وہ شہر کیسا تھا جہاں میں پیدا ہوا، اس نے تھک کر سوچا۔

اس کے کانوں میں دروازہ کھلنے کی آہٹ آئی۔ ایک عورت نے گردن نکال کر دروازے سے باہر جھانکا اور دونوں اطراف نظر ڈالی۔ پھر وہ چہرہ غائب ہو گیا۔ جب اسے دروازہ بند ہونے کی آواز آئی تو اس کا ذہن بالکل خالی تھا۔ اسے یہ بھی یاد نہیں آ رہا تھا کہ وہ دروازہ ابھی کھلا تھا، کون اندر گیا تھا، کوئی اندر گیا بھی تھا، یا یہ کہ وہاں کوئی دروازہ تھا بھی یا نہیں۔

اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اسے کیا ہو رہا ہے۔ اس کے ذہن میں ایک تصویر ابھری: ہرے بھرے بھیگے ہوئے جنگل کے کنارے رُوپہلے آسمان تلے چمکتا ہوا ایک سلیٹی تالاب۔ یہ تصویر اتنی واضح اور صاف تھی کہ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ منظر اس وقت اس کی نظر کے سامنے تھا یا وہ صرف ایک شبیہ تھی جو اس کے ذہن کے دریچوں میں ابھر آئی تھی۔ پھر اسے یادوں پر قابو نہ رہا۔ ایک ایک کر کے شبیہیں ابھرنے لگیں، جیسے ہوا نکلتے ہوئے غبارے فضا میں بلند ہوتے ہیں۔ غبار میں اَٹا ہوا ہوٹل، سفید ویران دیواریں، کیوبسٹ فرنیچر۔ اچانک تمام تصویریں غائب ہو گئیں۔ اس کا ذہن یک دم خالی ہو گیا۔ صرف ایک سیاہ مستطیل رہ گیا۔ وہ بھول گیا کہ وہ کون سے شہر جا رہا تھا۔ اس نے حیرانی کے عالم میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ اسے یاد نہ رہا کہ وہ کون سی جگہ تھی، دونوں اطراف افق میں گم ہوتی ہوئی فولاد کی متوازی پٹریاں کس لیے تھیں۔ جب ٹرین آئی تو وہ پہچان نہ سکا کہ وہ کیا شے تھی۔ نہ وہ اسے کوئی مشین لگی اور نہ کوئی عفریت۔ ان دونوں لفظوں کے معنی وہ بھول چکا تھا۔ چونکہ اسے یہ بھی یاد نہ رہا تھا کہ خوف کیا ہوتا ہے، اس نے بچنے کی کوئی کوشش نہ کی۔

❋❋

اِتالو کلوِینو

چاند کی دُوری

سر جارج ایچ ڈارون کے مطابق ایک زمانے میں چاند زمین کے بے حد قریب ہوا کرتا تھا۔ پھر سمندر کی لہروں نے اس کو بتدریج دور دھکیل دیا؛ وہ لہریں جو چاند کی اپنی کشش سے اٹھتی تھیں، پانی میں، جہاں زمین آہستہ آہستہ اپنی قوت کھو بیٹھتی ہے۔

❄

مجھے اچھی طرح معلوم ہے! بوڑھا قفوفق فرطِ جذبات سے چلایا...

تم لوگوں میں سے کسی کو بھی وہ دن یاد نہیں، لیکن مجھے وہ زمانہ اچھی طرح یاد ہے۔ اُن دنوں وہ تمام وقت ہمارے اوپر رہا کرتا تھا؛ وہ چاند، کتنا بڑا ہوا کرتا تھا اُس زمانے کا چاند! جب وہ پورا ہوتا، راتیں دن کی طرح روشن ہوتیں۔ گھلے ہوئے مکھن کی سی پیلاہٹ بھری روشنی پھیلاتا ہوا وہ آسمان پر چھا جاتا، جیسے ابھی ہم پر اتر آئے گا اور ہم سب کو کچل ڈالے گا۔ جب وہ نیا نیا طلوع ہوتا تو کھلے آسمان پر چکریاں کھاتا پھرتا، جیسے ایک سیاہ چھتری تیز ہوا میں ڈولے۔ اور جب وہ ڈوبتا، اس کی سینگ جیسی نوک اتنے نیچے اتر آتی کہ لگتا اب وہ راسِ زمین سے ٹکرا کر اس میں پھنس جائے گا۔ لیکن ان دنوں چاند کے اتار چڑھاؤ، اس کی گردش، اس کے ادوار کی کہانی بالکل مختلف تھی۔ کیونکہ تب سیاروں کے سورج سے فاصلے کچھ اور ہوا کرتے تھے، مدار اور ان کے زاویے... پتا نہیں کن چیزوں کے زاویے... اب بھلا مجھے

کہاں یاد۔ بہر حال، وہ جو کچھ بھی تھے سب مختلف ہوا کرتے تھے۔ جہاں تک گرہن کا تعلق ہے، جب چاند اور زمین ایک دوسرے سے تقریباً جڑے ہوئے تھے، تب تو ہمارے یہاں ہر منٹ پر گرہن ہوا کرتا تھا، وہ دو عفریت جس طرح مستقل ایک دوسرے کو سائے میں رکھنے کی تگ و دو میں لگے رہتے، اس کا تو یہی نتیجہ نکلنا تھا!

چاند کا مدار؟ وہ تو بیضوی تھا، ظاہر ہے۔ کچھ عرصے کے لیے وہ ہمارے نزدیک آ جاتا اور پھر دور چلا جاتا۔ جب چاند جھولتا ہوا قریب آتا تو سمندر میں طوفان سا اٹھ جاتا۔ اتنی تند و تیز لہریں ہوتیں کہ انھیں کوئی روک نہ سکتا تھا۔ چودھویں کی رات جب چاند ہمارے بالکل قریب جھکا ہوا ہوتا، سمندر کی لہریں اتنی اونچی اٹھتیں کہ چاند بال برابر فاصلے سے پانی میں بھیگتے بھیگتے رہ جاتا؛ خیر، اب اگر تم بال برابر فاصلہ نہ مانو تو چند گز کا فاصلہ تو یقیناً تھا۔

کیا ہم کبھی چاند پر چڑھے؟ کیوں نہیں، بالکل۔ چاند پر چڑھنے کے لیے کرنا ہی کیا پڑتا تھا! بس کشتی کو کھے کر اس کے بالکل نیچے پہنچ گئے، ایک سیڑھی لگائی اور چڑھ گئے۔

وہ جگہ جہاں چاند اپنی گردش کے دوران بے حد نیچے اتر آتا، جست کی چٹانوں کے قریب تھی۔ ہم وہاں تک ان کشتیوں میں جاتے جو اس زمانے میں ہوتی تھیں — گول اور چپٹی، کارک کی بنی ہوئی۔ ایک کشتی میں ہم بہت سارے لوگ سما جاتے۔ میں، کیپٹن وحد وحد، اس کی بیوی، میرا گونگا عم زاد، اور ننھی ایکس ایلتھ ایکس۔ وہ اس وقت گیارہ بارہ سال کی ہوا کرتی تھی۔ ان راتوں میں سمندر بے حد پرسکون ہوتا، روپہلا، نُقرئی، پارے کی طرح جھلملاتا ہوا۔ بنفشئی مچھلیاں چاند کی کشش سے کھنچتی ہوئی سمندر کی گہرائیوں سے نکل کر سطح پر اُبھر آتیں، سب کی سب، اور لجلجی زعفرانی مچھلیاں بھی۔ ایک ہلچل مچ جاتی۔ چھوٹی موٹی مچھلیاں، گھونگھے، کیکڑے، یہاں تک کہ آبی گھاس اور مونگے تک سمندر چھوڑ کر چاند کا رخ کرتے۔ کچھ اس سفید دودھیا چھت سے لٹک جاتے اور کچھ اس کی طرف لپکنے کی کوشش میں ہوا ہی میں معلق رہ جاتے۔ ایک جھلمل کرتا آتشیں جھنڈ سا بن جاتا، جسے ہم کیلوں کے پتوں سے ہٹانے کی کوشش کرتے اور اپنے لیے راستہ بناتے۔

کشتی میں ایک سیڑھی ہوتی تھی۔ ہم میں سے ایک اسے تھامے رکھتا، دوسرا اس پر چڑھتا اور تیسرا کشتی کو کھیتا، یہاں تک کہ ہم عین چاند کے نیچے پہنچ جاتے۔ یہی وجہ تھی کہ ہم اتنے سارے لوگ

اکٹھے نکلتے تھے۔ جیسے جیسے کشتی چاند کے قریب پہنچتی، سیڑھی پر چڑھا ہوا شخص خوف سے چلّاتا، ''روکو! ارے روکو کشتی کو! میرا سر چاند سے ٹکرا جائے گا۔'' اگر تم سیڑھی پر چڑھے ہوتے تو تم کو بھی یہی لگتا کہ اب تم اس سے ٹکرا جاؤ گے۔ چاند بالکل تمھارے سر پر ہوتا: ایک وسیع و عریض، ناہموار، کٹی پھٹی، نوک دار، کھردری سطح تمھارے اوپر چھائی ہوتی۔ ہوسکتا ہے اب چاند کی سطح مختلف ہو، لیکن اس وقت چاند کا وہ حصہ جو زمین کے بالکل قریب سے، تقریباً اس کو رگڑتا ہوا گزرتا، سخت چھلکوں کی ایک تہہ سے ڈھکا ہوا تھا اور مچھلی کے پیٹ کی طرح لگتا۔ اس کی بو، جہاں تک مجھے یاد ہے، اگر بالکل مچھلی کی بساند نہیں تو دھوئیں میں گلی ہوئی سامن مچھلی کی بو سے مشابہت ضرور رکھتی تھی۔

سیڑھی کے سب سے اونچے پائیدان پر سیدھے کھڑے ہو کر تم اگر اپنے بازو اوپر اٹھاتے تو واقعتاً چاند کو چھو سکتے تھے۔ ہم لوگوں نے چاند تک کی اونچائی کی پیمائش کر رکھی تھی۔ (اس وقت ہمیں شبہ تک نہ تھا کہ چاند آہستہ آہستہ ہم سے دور ہوتا جا رہا ہے۔) صرف ایک معاملے میں تم کو بے حد احتیاط کی ضرورت تھی؛ وہ یہ کہ چاند پر چڑھنے کے لیے تم اپنے ہاتھ اس کی سطح پر کون سے مقام پر جماتے ہو۔

میں ہمیشہ کسی ایسے چھلکے پر ہاتھ ڈالتا جو مضبوط نظر آتا۔ (ہم لوگ چار پانچ کی ٹولیوں میں اوپر چڑھتے تھے۔) میں ایک ہاتھ اس پر جماتا اور پھر دونوں ہاتھوں سے چاند کی سطح سے چمٹ جاتا۔ اچانک مجھے محسوس ہوتا میرے پیروں تلے سے سیڑھی اور کشتی دونوں کھسکتے جا رہے ہیں۔ چاند کی مقناطیسیت مجھے کششِ ثقل سے نکال لیتی۔ ہاں، چاند میں اتنی طاقت تھی کہ وہ تم کو زمین سے کھینچ کر اٹھا لیتا تھا۔ جیسے ہی تم زمین سے چاند پر قدم رکھتے، تم کو اس قوت کا اندازہ ہو جاتا، کیونکہ تم اچانک ایک لڑھکنی سی کھاتے اور چاند کے چھلکوں سے لپٹ جاتے، اور پھر قلابازی کھا کر چاند کی سطح پر پاؤں جمانے کی کوشش کرتے۔ زمین سے دیکھنے پر تم سر کے بل لٹکے ہوئے نظر آتے۔ ایک بات تمھیں عجیب محسوس ہوتی؛ وہ یہ کہ جب تم نظریں اوپر اٹھاتے تو تمھیں اپنے سر پر جھلملاتا ہوا سمندر نظر آتا، اور کشتیاں، اس میں بیٹھے لوگ الٹے لٹکے ہوئے دکھائی دیتے، جیسے انگور کا خوشہ بیل سے لٹکا ہوا ہوتا ہے۔

میرا گونگا عم زاد اس کام میں بے حد ماہر تھا۔ سب سے پہلے وہی سیڑھی سے چھلانگ لگا کر چاند پر پہنچتا۔ اس کے بے ڈھنگے، ڈھل مل ہاتھ چاند کو چھوتے ہی اچانک حساس اور سبک ہو جاتے: ان ہاتھوں کو فوراً ایک مناسب جگہ مل جاتی جہاں وہ خود کو جما سکتے، بلکہ یوں لگتا کہ صرف اپنی ہتھیلیوں کی

طاقت ہی سے وہ سیارے کی سخت اور کھردری سطح پر چپک جاتا۔ ایک دفعہ جب اس نے اپنے ہاتھ بڑھائے، مجھے یوں محسوس ہوا گویا چاند خود اس کے قریب آ گیا ہو۔

چاند سے لوٹتے وقت بھی وہ اتنی ہی پھرتی دکھاتا۔ چاند سے واپس آنا اس پر جانے سے زیادہ مشکل کام تھا۔ ہم لوگوں کو زمین پر واپس جانے کے لیے اُچھلنا پڑتا تھا، اتنا اونچا جتنا کہ ہم اچھل سکتے۔ ہم بازو اوپر اٹھا کر زقند بھرتے۔ اگر ہمیں کوئی زمین سے اس حالت میں دیکھتا تو ایسا لگتا ہم سمندر میں غوطہ لگا رہے ہیں۔ اس دفعہ ہمارے پاس سیڑھی نہ ہوتی کیونکہ چاند کی سطح پر کوئی ایسی آڑ نہ تھی جہاں سیڑھی کو ٹکایا جا سکتا۔ لیکن میرا عم زاد، بجائے اچھلنے کے، چاند کی سطح پر جھکتا، گویا قلابازی لگانے والا ہو؛ پھر اپنے بازوؤں کی قوت سے ایک جست لگاتا۔ سمندر پر کشتی میں بیٹھے ہوئے جب ہم اسے دیکھتے تو ہمیں لگتا وہ فضا میں سیدھا کھڑا ہے اور رحیم شحیم چاند کو اپنی ہتھیلیوں سے چھوتے ہوئے لٹو کی طرح پھرکیاں دے رہا ہے۔ جب اس کی ٹانگیں کشتی کے اوپر آتیں تو ہم اس کے ٹخنے پکڑ لیتے اور کھینچ کر کشتی پر اتار لیتے۔

اب تم پوچھو گے ہم بھلا چاند پر جاتے کیوں تھے؟ میں تمھیں سمجھاتا ہوں۔ ہم دودھ جمع کرنے جاتے تھے، بالٹی اور چمچوں کی مدد سے۔ چاند کا دودھ بہت گاڑھا ہوتا تھا، بالکل پگھلے ہوئے پنیر کی طرح۔ یہ دودھ چاند کی کھردری، چھلکے دار سطح کے نیچے بنتا تھا، اور عام طور پر ایک چھلکے اور دوسرے چھلکے کے درمیان خلا میں اکٹھا ہوتا۔ یہ دودھ مختلف نباتاتِ ارضی کی تخمیر سے بنتا تھا۔ جب چاند زمین کے قریب سے گزرتا، اجزاونباتات زمین کے جنگلوں، کھیتوں کھلیانوں اور دریاؤں جھیلوں سے اڑ اڑ کر چاند پر اکٹھا ہو جاتے تھے۔

یہ دودھ جن اجزا کا مرکب ہوتا وہ یہ تھے: سبزیوں کا عرق، درختوں کا لعاب، شہد، نشاستے دار ٹکڑے، دالیں، پھلوں کے بیج، پھولوں کے زیرے، مچھلیوں کے انڈے، کیڑے مکوڑے، سیاہ مرچ، کشمش، معدنی نمک، راکھ وغیرہ۔ اس کو حاصل کرنے کے لیے تم کو صرف چمچہ چھلکوں کے نیچے ڈالنا ہوتا تھا۔ جب چمچہ اوپر آتا تو وہ اس قیمتی مرکب سے بھرا ہوتا۔ ظاہر ہے کہ وہ بالکل خالص حالت میں تو نہ ہوتا تھا، اس میں غلاظت بھی شامل ہوتی۔ جب چاند گرم ریگستانوں کے اوپر سے گزرتا اور تخمیر کا عمل ہوتا تو تمام اجسام تو نہیں پگھلتے تھے، کچھ ٹھوس حالت میں اس مرکب سے چپکے رہ جاتے: ہڈیاں، ناخون،

سمندری گھوڑے، اخروٹ، برتنوں کے ٹکڑے، مچھلی پکڑنے کے کانٹے، اور کبھی تو کنگھیاں تک اس میں چپکی ہوئی نکلتیں! اس مرکب کو جمع کرنے کے بعد صاف کیا جاتا اور پھر چھانا جاتا۔ لیکن یہ سب کچھ آسانی سے ہو جاتا۔ مشکل کام تو اس مرکب کو چاند سے زمین تک لانا تھا۔ ہم یہ کرتے کہ چمچہ بھر کر نکالتے اور قوت سے فضا میں اچھالتے۔ پنیر نما مرکب کے ٹکڑے اڑتے اور چھت سے چپک جاتے— میرا مطلب ہے سمندر کی سطح سے، کیونکہ جب ہم چاند پر کھڑے ہوتے تو ہمارے اوپر سمندر ہوتا— اور اچھالے ہوئے ٹکڑے سمندر میں تیرنے لگتے۔ ان کو بالٹی کی مدد سے نکال کر کشتی میں جمع کرنا آسان ہوتا۔ اس عمل میں بھی میرا گونگا عم زاد خاص مہارت رکھتا تھا۔ ایک تو اس میں طاقت تھی، دوسرے یہ کہ اس کا نشانہ اچھا تھا۔ وہ پوری قوت سے پنیر کے ٹکڑے اس طرح زمین کی طرف اُچھالتا کہ وہ عین نشانے پر بیٹھتے۔ وہ نشانہ تھا بالٹی، جو ہم کشتی کے اندر اپنے ہاتھوں میں تھامے رکھتے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے، میں کافی اناڑی ہوا کرتا تھا۔ میں جو ٹکڑے اچھالتا، ان میں سے اکثر تو الٹے میری آنکھوں ہی پر آ گرتے۔

ابھی تک میں نے تم کو ساری باتیں نہیں بتائی ہیں۔ وہ باتیں جن میں میرا گونگا عم زاد کافی ماہر تھا۔ چاند کے چھلکوں تلے پایا جانے والا دودھ نکالنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ اکثر تو وہ چمچے کی مدد کے بغیر ہی اپنا ہاتھ چھلکوں میں ڈال کر دودھ نکال لیتا۔ یہ کام وہ کسی منظّم طریقے سے نہیں کرتا تھا۔ وہ اِدھر اُدھر کودتا گویا چاند کے ساتھ اٹھکھیلیاں کر رہا ہو، اسے گدگدا رہا ہو۔ اور جہاں کہیں وہ ہاتھ ڈالتا دودھ کے فوارے چھوٹ جاتے، گویا وہ بکری کے تھنوں سے دودھ نکال رہا ہو۔ ہم لوگ اس کے پیچھے لگے رہتے اور جیسے جیسے وہ دودھ نکالتا جاتا، ہم چمچوں کی مدد سے اکٹھا کرتے جاتے۔ وہ جہاں ہاتھ ڈالتا، یوں لگتا گویا اتفاق سے دودھ نکل آیا ہو، کیونکہ کوئی خاص قرینہ بظاہر نظر نہ آتا تھا جو دودھ کی موجودگی کی نشان دہی کرتا ہو۔ کچھ جگہیں ایسی تھیں جنھیں وہ صرف تفریح کی خاطر چھیڑتا، مثلاً دو چھلکوں کے درمیان خلا، جہاں چاند کا کھلا اور نازک حصہ ہوتا۔ نہ صرف وہ ہاتھ استعمال کرتا بلکہ کبھی کبھار زقند لگاتے ہوئے اپنے بڑے بڑے بے ہنگم پیروں سے چاند پر ہلکی ہلکی ٹھوکریں مارتا— یہ اس کے لیے تفریح کی انتہا ہوتی— اور زقندیں بھرتے وقت خوشی کے مارے اس کے حلق سے عجیب و غریب کلکاریاں سی نکلتیں۔

چاند کی سطح ہر جگہ چھلکوں سے ڈھکی ہوئی، کھردری نہ تھی۔ کہیں کہیں چکنی مٹی کے قطعے تھے۔ ان

نرم گوشوں پر میرے عم زاد کو اتنا مزہ آتا کہ وہ قلا بازیاں کھانے لگتا، یا پھر ایک پرندے کی طرح اڑان کرتا ہوا نظر آتا۔ اس طرح کی معصوم حرکتیں کرتا ہوا وہ دور نکل جاتا اور ہماری نظروں سے اوجھل ہو جاتا۔ چاند پر کئی ایسے وسیع وعریض خطے تھے جن کا کھوج لگانے کی نہ ہمیں کبھی ضرورت پڑی، اور نہ ہی کوئی تجسس تھا۔ گونگا ان ہی خطوں میں گم ہو جاتا۔ مجھے شبہ تھا کہ وہ شروع شروع میں جو کرتب دکھاتا، وہ دراصل چاند کی بے کراں وادیوں میں کسی پراسرار مہم کی ابتدا ہوتی۔

ان راتوں میں جست کی چٹانوں کے قریب، ہماری عجیب سی کیفیت ہوتی۔ خوش وخرم، لیکن سنسنی خیز، جیسے ہماری کھوپڑیوں کے اندر دماغ کی جگہ ایک مچھلی تیر رہی ہو، جو چاند کی طرف کھنچتی جا رہی ہو... اور ہم اس کیفیت میں سرشار، بہتی ہوئی کشتی میں کھیلتے، گاتے، آگے بڑھتے جاتے۔ کپتان کی بیوی بربط بجاتی۔ اس کے لمبے لمبے بازو رات میں چاندی کی مچھلیوں کی طرح چمکتے تھے، اور اس کی بغلیں سیاہ، گھنگھور، پراسرار، سمندری خار پشت کی طرح تھیں۔ بربط کی آواز رسیلی اور تیز ہوتی، بلکہ اتنی تیز کہ ناقابل برداشت ہو جاتی اور ہم اس کے ساتھ ساتھ چیخیں مارنے لگتے تا کہ ہماری سماعت اس کے اثر سے محفوظ رہ سکے۔

شفاف بجلی مچھلیاں سمندر کی سطح پر اٹھتیں، تھوڑی دیر تڑپتیں، اور پھر چاند کی طرف لپکتیں۔ ننھی ایکس ایلتھ ایکس اس نظارے سے بے حد محظوظ ہوتی اور ان مچھلیوں کو فضا میں اچھل اچھل کر پکڑنے کی کوشش کرتی، گو کہ یہ کام آسان نہ تھا۔ ایک دفعہ جب اس نے ان مچھلیوں کو پکڑنے کے لیے اپنے ننھے بازو پھیلائے تو وہ خود چاند کی طرف کھنچتی ہوئی فضا میں مچھلیوں کے ساتھ معلق ہو گئی، کیونکہ وہ دبلی پتلی سی تھی اور اس کا وزن ایک دو اونس اس وزن سے کم ہی تھا جو زمین کی کشش کے چاند کی کشش پر حاوی آکر اسے واپس کھینچ لانے کے لیے ضروری تھا۔ خوف کے مارے پہلے تو اس کی چیخ نکلی، پھر وہ بوکھلا کر ہنسنے لگی۔ تھوڑی دیر میں وہ مچھلیوں کے ساتھ کھیل میں مصروف ہو چکی تھی۔ وہ چھوٹی چھوٹی مچھلیاں پکڑنے کی کوشش کرتی اور جب کوئی مچھلی اس کے ہاتھ لگتی تو وہ منھ میں ڈال کر چبانے لگتی۔ ہم نے تیزی سے کشتی چلانی شروع کی کہ بچی کے قریب رہیں۔ چاند اپنے مدار میں تیزی سے گردش کر رہا تھا اور سمندری نباتات کا ایک جھنڈ، آبی گھاس میں لپٹا ہوا ایک لکیر کی صورت میں چاند کی طرف بھاگا جا رہا تھا، اور ننھی ایکس ایلتھ ایکس اس جھنڈ کے درمیان لٹک رہی تھی۔ اس کی دو چوٹیاں چاند کے رخ پر ہوا میں اڑ رہی

تھیں۔ وہ بل کھا رہی تھی اور فضا میں پیر چلا رہی تھی، جیسے چاند کی کشش سے لڑ رہی ہو۔ اس کے جوتے اس ساری کارروائی میں کبھی کے لاپتا ہو چکے تھے اور موزے پاؤں سے نکل کر کششِ ثقل سے کھنچتے ہوئے نیچے آ رہے تھے۔ ہم سیڑھی پر چڑھتے ہوئے اڑتے موزوں کو پکڑنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔

چھوٹی چھوٹی مچھلیاں کھانا فضا میں معلق ننھی کے لیے مفید ثابت ہوا۔ جیسے جیسے اس کے پیٹ میں غذا پہنچی اور اس کا وزن بڑھا، اس نے نیچے گرنا شروع کیا۔ اور پھر یہ کہ اس تمام جھنڈ میں ننھی ہی سب سے بڑی شے تھی۔ چھوٹے چھوٹے جاندار، گھونگھے، آبی گھاس، پودے، سب اس کے اطراف گردش کرنے لگے؛ اور تھوڑی دیر میں بچی گھونگھوں، سیپیوں، آبی نباتات اور گھاس سے ڈھک گئی۔ جیسے جیسے وہ اس انبار میں غائب ہوئی، چاند کی کشش سے آزاد ہوتی گئی، حتیٰ کہ سمندر کی سطح کے قریب آ گئی اور پانی میں ڈوب گئی۔

ہم نے جلدی جلدی کشتی چلائی اور اس کو سمندر سے نکالا۔ اس کا جسم اب تک چاند کی مقناطیسیت کے زیرِ اثر تھا۔ ہم سب نے مل کر بڑی مشکلوں سے اس پر چپکی ہوئی چیزوں کو الگ کیا۔ اس کے سر پر نرم نرم مونگوں کا ایک جال سا بن چکا تھا۔ جتنی دفعہ ہم اس کے بالوں میں کنگھی پھیرتے، چھوٹی چھوٹی سارڈینوں کی ایک جھڑی سی لگ جاتی۔ اس کے پپوٹوں پر گھونگھے پیوست ہو گئے تھے، کیکڑوں کی ٹانگیں اس کے بازوؤں میں الجھی ہوئی تھیں، اور اس کا فراک لگتا تھا جیسے آبی گھاس اور اسفنج کا بنا ہوا ہو۔ زیادہ تر اشیا تو ہم نے ننھی کے جسم سے الگ کر دیں، لیکن وہ ہفتوں اپنے جسم سے مچھلیوں کے چھلکے، گلبھڑے، سیپ اور جانے کیا الا بلا کھینچ کھینچ کر نکالتی رہی۔ ننھے ننھے آبی ذرّات اس کی کھال میں پیوست ہو کر رہ گئے تھے اور اس کی جلد ہمیشہ کے لیے داغدار ہو گئی۔

اس واقعے سے تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ زمین اور چاند کی قوتیں، جو تقریباً برابر تھیں، کس طرح کائنات میں جگہ کے لیے ایک دوسرے سے برسرِ پیکار تھیں۔ ایک بات اور بتاؤں۔ چاند پر سے جو جسم واپس زمین کو آتا، وہ کافی دیر تک قمری طاقت کے زیرِ اثر رہتا اور کششِ ثقل کو رد کرتا۔ یہاں تک کہ میں بھی، جو لحیم شحیم اور بھاری جسم کا ہوتا تھا، ہر دفعہ جب چاند سے واپس آتا، زمین پر قدم نہ جما پاتا۔ سب میرے گرد گھیرا ڈال کر مجھے پکڑے رہتے اور میرا سر جھولتا اور ٹانگیں آسمان کی طرف جا رہی ہوتیں۔

''ہمیں پکڑو! تھامو، مضبوطی سے!'' وہ سب چلاتے اور اس دھما چوکڑی میں اچانک مجھے احساس ہوتا

کہ میں مسز وحد وحد کے پستانوں کو تھامے ہوئے ہوں، جو گول گول اور کسے ہوئے تھے۔ یہ لمس مجھے بے حد اچھا لگتا۔ ایک تحفظ کا احساس ہوتا۔ اس لمس میں اتنی ہی کشش تھی جتنی کہ چاند کی مقناطیسیت میں۔ یا شاید اس سے بھی زیادہ۔ خاص طور پر اگر میں اپنے بازو اس کے کولھوں پر رکھنے میں کامیاب ہو جاتا۔ اور اس کے ساتھ ہی میں کششِ ثقل کے دائرے میں واپس آ جاتا اور بھد سے کشتی کے پیندے میں جا گرتا۔ پھر مجھے ہوش نہ رہتا۔ کپتان وحد وحد مجھ پر پانی کی بالٹی اوندھا کر مجھے ہوش میں لانے کی کوشش کرتا۔

اور اس طرح میں کپتان کی بیوی کی محبت میں گرفتار ہوا۔ اور اس دن سے میرے لیے غمگین دور شروع ہو گیا، کیونکہ مجھے یہ جاننے میں زیادہ عرصہ نہیں لگا کہ وہ خاتون کس کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھا کرتی! جب میرے عم زاد کے ہاتھ مضبوطی سے چاند کی سطح کو تھامتے، میں مسز وحد وحد کو دیکھتا۔ اس کی آنکھوں میں جھانک کر مجھے لگتا میں اس کے احساسات پڑھ رہا ہوں، وہ جذبات جو گونگے کی چاند سے وارفتگی دیکھ کر اس کے اندر جاگ رہے ہوتے۔ اور جب وہ چاند کی پراسرار وادیوں میں غائب ہو جاتا، میں کپتان کی بیوی کی بے چینی اور اضطراب دیکھتا، گویا وہ سوئیوں پر بیٹھی ہوئی ہو! پھر مجھ پر یہ بات واضح ہوگئی کہ مسز وحد وحد چاند سے جلنے لگی تھی، اور میں اپنے گونگے عم زاد سے حسد کی آگ میں خاکستر ہونا شروع ہو گیا تھا۔ رات میں اس کی آنکھیں ہیروں کی مانند چمکتیں، اور جب وہ چاند کی طرف دیکھتی تو ان میں سے شعلے سے لپکتے دکھائی دیتے، جیسے وہ چاند کو للکار رہی ہو، ''تم اس کو حاصل نہیں کر سکتے!'' اس لمحے میں خود کو بے حد تنہا محسوس کرتا۔

جو اس سارے قصے سے بالکل لاعلم تھا وہ میرا عم زاد تھا۔ جب وہ چاند سے واپس آتا اور ہم اس کو ٹانگوں سے کھینچ کر کشتی میں اتارتے، جیسا کہ میں نے پہلے تمھیں سمجھایا، مسز وحد وحد بالکل ہی ہوش کھو بیٹھتی۔ وہ اپنی سی ہر سعی کرتی کہ کسی طرح اس کا سارا وزن اپنے جسم پر سمیٹ لے۔ اس کے لمبے لمبے چمکتے ہوئے نقرئی بازو اس کے گرد گھیرا ڈال دیتے، اور میرے دل میں ایک ٹیس سی اٹھتی۔ جب میں اس سے چمٹتا تھا، اس کے جسم کو نرم اور مہربان پاتا، لیکن وہ اس والہانہ طریقے سے میری طرف نہ بڑھتا تھا جیسا کہ گونگے کے ساتھ ہوتا۔ اور گونگا... گونگا ان سب واقعات سے لاتعلق قمری سرور میں مست ہوتا۔

میں کپتان کی طرف نظر ڈالتا۔ کیا اس نے اپنی بیوی کی حرکات کو دیکھا؟ لیکن اس کے آبِ شور

کے کھلئے ہوے، باریک جھرّیوں سے بھرے چہرے پر کوئی تاثرات نہ ہوتے۔ چونکہ گونگا چاند سے لوٹنے والا آخری فرد ہوتا، اس کی واپسی پر کشتی چل پڑتی۔ اور پھر کپتان غیر معمولی مہربانی کے ساتھ کشتی کے پیندے پر پڑا ہوا بربط اٹھالاتا اور اپنی بیوی کو پکڑا دیتا۔ اس کو بربط لینا پڑتا اور وہ تھوڑی دیر اس کو بجاتی۔ صرف بربط کی آواز ہی ایسی شے تھی جو مسز وحد وحد کو گونگے سے جدا کر سکتی تھی۔ میں دھیمی آواز میں ایک اداس سا گانا گانے لگتا:

''چمک دار مچھلیاں سطح پر ہولے ہولے تیر رہی ہیں... تیر رہی ہیں...

سیاہ مچھلیاں سمندر کی گہرائیوں میں مقید ہیں... مقید ہیں...''

اور سب لوگ، سوائے گونگے کے، میرا ساتھ دینے لگتے۔

ہر ماہ جب چاند ڈوب جاتا، گونگا اپنی تنہائیوں میں واپس لوٹ جاتا۔ اسے دنیا کی کسی شے سے کوئی واسطہ، کوئی دلچسپی نہ تھی۔ صرف چودھویں کی رات آتے ہی وہ جیسے نیند سے جاگ پڑتا۔

اس دفعہ میں نے سارے انتظامات کیے تھے، لہٰذا چاند پر چڑھنے کی باری میری نہ تھی اور میں کشتی میں کپتان کی بیوی کے ساتھ رہ سکتا تھا۔ لیکن جیسے ہی گونگا سیڑھی پر چڑھا، مسز وحد وحد بولی، ''اس دفعہ میں بھی چاند پر جاؤں گی۔'' اس سے پہلے ایسا کبھی نہ ہوا تھا۔ کپتان کی بیوی آج تک چاند پر نہیں گئی تھی۔ لیکن کپتان نے اس غیر متوقع درخواست پر کوئی اعتراض نہیں کیا، بلکہ اپنی بیوی کو تقریباً دھکیل کر سیڑھی کی طرف کر دیا۔ ''بالکل، تم بھی جاؤ۔'' اور ہم سب اس کو سیڑھی پر چڑھانے لگ گئے۔ میں نے اس کو پشت سے اٹھا لیا۔ مجھے اپنے بازوؤں پر اس کے کولھوں کی نرم گولائیوں کا احساس ہوا اور اس کو اوپر اٹھانے کے لیے میں نے اپنی ہتھیلیوں اور چہرے سے اس کے جسم کو دھکا دیا۔ جب میں نے محسوس کیا کہ وہ چاند کی کشش کے دائرے میں داخل ہو گئی ہے اور اوپر اٹھنے لگی ہے، تو اس کے لمس کی جدائی سے میرا دل تڑپ اٹھا اور میں اس کے پیچھے بھاگا۔ ''میں بھی اوپر جا رہا ہوں۔ تھوڑی دیر کے لیے، اس کی مدد کو!'' پھر مجھے لگا جیسے کسی پکڑنے والے آلے نے مجھے پوری قوت سے روک لیا ہو۔ ''تم یہیں ٹھہرو۔ تمھیں کچھ کام نبٹانے ہیں،'' کپتان نے دھیمی آواز میں حکم دیا۔

اس لمحے سب کے عزائم واضح ہو چکے تھے، لیکن میں پھر بھی کچھ نہ سمجھ سکا۔ یقیناً کپتان کی بیوی کافی عرصے سے میرے عم زاد کے ساتھ اکیلے چاند پر جانے کی آرزومند تھی۔ یا کم از کم اس کو چاند کے

ساتھ اکیلے جانے سے روکنے کی خواہش مند تھی۔ لیکن غالباً اس کے ارادے اس سے زیادہ گمبھیر تھے، ایسے ارادے جو گونگے کی رضامندی ہی سے تکمیل کو پہنچائے جا سکتے تھے۔ لیکن شاید میر اعم زاد ان باتوں کو سمجھ نہیں سکا تھا، بلکہ شاید یہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ خاتون کی چاہتوں کا اکلوتا مرکز ہے۔ اور کپتان؟ وہ شاید اپنی بیوی سے چھٹکارا پانا چاہتا تھا۔ درحقیقت جیسے ہی اس کی بیوی چاند پر مقید ہوئی، اس کو جیسے کھلی چھٹی مل گئی اور وہ عیش و عشرت میں مصروف ہو گیا۔ تب ہم کو احساس ہوا کہ کپتان نے اپنی بیوی کو چاند پر جانے سے کیوں نہ روکا تھا۔ لیکن کیا اسے اس بات کا علم تھا کہ چاند کا مدار پھیلتا جا رہا ہے؟

ہم میں سے کسی کو بھی یہ گمان نہ ہو سکتا تھا۔ شاید گونگے کو ہوا ہو؛ لیکن صرف اسی کو ہوا ہو گا، جس پراسرار طریقے سے اسے انجانی، انہونی باتوں کا گمان ہو جاتا تھا۔ شاید اس کو پہلے سے معلوم تھا کہ اس رات وہ چاند کو ہمیشہ کے لیے الوداع کہے گا۔ تبھی وہ اس رات چاند پر پہنچنے کے بعد اس کی پراسرار وادیوں میں روپوش ہو گیا اور صرف اسی وقت نمودار ہوا جب زمین پر واپسی کا وقت ہوا۔ کپتان کی بیوی کے لیے گونگے کو تلاش کرنا بے سود تھا۔ ہم نے اس کو کئی دفعہ چاند کی کھردری سطح پر گشت کرتے دیکھا۔ وہ گھومتے گھومتے اچانک رک کر ہماری کشتی کی طرف دیکھتی، جیسے پوچھ رہی ہو: ''کیا تم نے اسے کہیں دیکھا ہے؟ کس سمت گیا ہے وہ؟''

یقیناً وہ رات عجیب تھی۔ سمندر کی سطح بجائے اس کے کہ تنی ہوئی ہو— بلکہ کمان کی طرح ابھری ہوئی ہو، جیسا کہ چودھویں کی راتوں میں ہوتا تھا— اس رات بالکل ڈھیلی اور بیٹھی ہوئی معلوم ہو رہی تھی، گویا چاند اپنی مقناطیسیت کھو چکا ہو۔ اور چاند کی روشنی بھی ان راتوں کی روشنی کی مانند نہ تھی۔ رات کے سائے گہرے لگ رہے تھے۔ ہمارے ساتھیوں نے یقیناً یہ تبدیلی محسوس کی ہو گی۔ درحقیقت ان سب نے ہماری طرف خوفزدہ آنکھوں سے دیکھا، اور پھر اس لمحے ہمارے اور ان کے منہ سے ایک ساتھ چیخ نکلی، ''چاند جا رہا ہے!'' اور پھر میرا عم زاد دوڑتا ہوا چاند پر نمودار ہوا۔ وہ قطعی خوفزدہ دکھائی نہیں دے رہا تھا اور نہ ہی اس کے چہرے پر تعجب کے آثار تھے۔ اس نے اپنی ہتھیلیاں چاند کی سطح پر جمائیں اور قلابازی کھانے لگا۔ لیکن اس مرتبہ قلابازی لگانے کے بعد وہ فضا میں معلق ہو گیا، بالکل اس طرح جیسے ننھی ایکس ایلتھ ایکس ہو گئی تھی۔ وہ چاند اور زمین کے درمیان، سر کے بل فضا میں لٹکا رہا، اور پھر بڑی

کوششوں سے، گویا دھارے کی مخالف سمت میں تیر رہا ہو، اپنے بازوؤں کو ہلاتا ہوا وہ غیر معمولی آہستگی سے زمین کی طرف آیا۔ چاند پر چڑھے دوسرے ملاحوں نے فوراً اس کی تقلید کی۔ کسی کو چاند کا دودھ اکٹھا کرنے کا خیال نہ رہا اور نہ ہی کپتان نے ان کو اس حرکت پر ڈانٹا۔ پہلے ہی ملاح کافی انتظار کر چکے تھے۔ اب تو چاند اور زمین کا فاصلہ اتنا بڑھ چکا تھا کہ اسے عبور کرنا مشکل تھا۔ جب ملاحوں نے گونگے کی طرح قلابازی کھا کر تیرنا چاہا تو وہ فضا میں معلق ہو کر رہ گئے۔ ''ارے، ایک دوسرے سے چمٹ جاؤ، بے وقوفو!'' کپتان چلّایا۔ اس کے حکم پر ملاحوں نے ایک دوسرے کے قریب آنے کی کوشش کی اور ایک دائرے کی صورت مل کر نیچے اترنے کے لیے زور لگانے لگے، یہاں تک کہ وہ کششِ ثقل میں آ گئے اور پھر اچانک آسمان سے انسانی جسموں کی بارش شروع ہو گئی اور وہ سب کے سب ایک زوردار چھپاکے کے ساتھ سمندر میں جا گرے۔

کشتیاں تیزی سے چلا کر ان کے قریب لائی گئیں، اور سب کو ایک ایک کر کے سمندر سے نکالا گیا۔ ''کپتان کی بیوی کہاں ہے؟ کپتان کی بیوی...'' ایک شور اٹھا۔ اور سب کی نظریں اوپر گئیں۔ مسز وحد وحد اب تک چاند سے چند گز کے فاصلے پر اپنے لمبے لمبے چاندی جیسے بازوؤں کو ہلاتی ہوئی فضا میں تیر رہی تھی۔ میں سیڑھی پر چڑھ گیا اور اس کی طرف بربط بڑھانے کی ایک بے سود کوشش کی تا کہ وہ اس کو پکڑ لے۔ ''میں اس تک نہیں پہنچ رہا۔ ہمیں اس کو لینے جانا ہوگا!'' اور میں نے چھلانگیں مارنا شروع کر دیں۔ میرے ہاتھوں میں بربط تھا۔ میرے اوپر چاند کا وسیع اور عریض طشت اب پہلے کی طرح نہ رہا تھا۔ وہ اب چھوٹا ہو گیا تھا اور بتدریج سکڑتا جا رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ میری نگاہیں اس کو پیچھے دھکیل رہی ہیں۔ خالی خالی آسمان اب ایک گہری کھائی کی طرح منھ کھولے نظر آتا تھا۔ ستارے یکے بعد دیگرے دور ہوتے چاند کے نیچے نمودار ہونا شروع ہو گئے۔ میں گہری سیاہ رات کی بے کراں تنہائیوں میں ڈوبتا جا رہا تھا۔ ''مجھے ڈر لگ رہا ہے!'' میں نے سوچا، ''مجھے کودنے سے خوف آ رہا ہے۔ میں بزدل ہوں!'' اسی لمحے میں نے چھلانگ لگا دی اور فضا میں تیرتا ہوا تیزی سے مسز وحد وحد کی طرف بڑھا اور اس کے ہاتھوں میں بربط تھما دیا۔ وہ بجائے میرے طرف بڑھنے کے وہیں پر پھرکیاں سی کھانے لگی۔ پہلے اس کا جذبات سے عاری جامد چہرہ نظر آتا اور پھر اس کی پشت۔

''مجھے مضبوطی سے پکڑو!'' میں چلّایا اور بڑھ کر اسے تھام لیا اور اپنی ٹانگیں اس کی ٹانگوں میں

پھنسا دیں۔ ''اگر ہم ایک دوسرے کے ساتھ چمٹ جائیں تو نیچے اتر سکتے ہیں۔'' میں پوری قوت سے اس کے ساتھ لپٹ گیا اور اس سے ہم آغوشی کے سرور میں ڈوب گیا۔ اس کیفیت میں میں اتنا مست ہو چکا تھا کہ مجھے اس بات کا احساس ہی نہیں ہوا کہ میں اس کو واپس چاند کی طرف دھکیل رہا ہوں۔ مجھے اس بات کا احساس کیوں نہ ہوا؟ یا میری شروع ہی سے یہ کوشش تھی؟ پیشتر اس کے کہ میں کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہوتا، میرے منھ سے یکا یک نکلا: ''میں ہوں وہ جو تمھارے ساتھ یہاں ایک ماہ تک ٹھہرے گا۔'' یا غالباً ''...تم پر...!'' میں چلایا: ''تم پر ایک ماہ تک۔'' اور اسی لمحے ہم چاند کی ٹھنڈی، کھردری سطح پر گرے اور ایک دوسرے سے الگ ہو کر مخالف سمتوں میں لڑھکنیاں کھانے لگے۔

میں نے اوپر نگاہ دوڑائی، جیسا کہ میری عادت تھی، میں جب بھی چاند کی سطح پر قدم رکھتا، سب سے پہلے اوپر زمین کی جانب دیکھتا۔ میں نے اس یقین کے ساتھ نظر اٹھائی کہ مجھے اپنا سمندر ایک بے کنار چھت کی مانند نظر آئے گا۔ ہاں، سمندر مجھے نظر آیا لیکن اس دفعہ وہ بے حد اونچائی پر تھا اور بہت تنگ۔ چٹانیں اور کٹے پھٹے، نوک دار ساحل اس کا احاطہ کیے ہوئے تھے۔ کشتیاں کتنی چھوٹی نظر آ رہی تھیں، میرے ساتھیوں کے چہرے کتنے انجانے، اور ان کی پکاریں کتنی مدھم تھیں۔ اس اثنا میں مجھے قریب سے ایک آواز آئی۔ مسز وحد وحد نے بربط اٹھالیا تھا۔ وہ آہستگی سے اس پر ہاتھ پھیر رہی تھی اور ساز میں سے ایک دردبھرا نغمہ پھوٹ رہا تھا۔

ایک طویل ماہ شروع ہوا۔ چاند آہستہ آہستہ اپنے مدار پر زمین کے گرد گھومتا رہا۔ ساکن سیارے سے ہمیں اپنا ساحل نظر نہ آیا، لیکن گہرے سمندر، وسیع صحرا، دہکتے آتش فشاں، برفیلے براعظم، سانپوں سے بھرے ہوئے جنگل، پہاڑی سلسلے، جن کی چٹانیں تندو تیز دریاؤں سے کٹی ہوئی تھیں، دلدلوں کے شہر، پتھروں کے قبرستان اور چکنی مٹی کی سلطنتیں، یہ سب مناظر ایک ایک کر کے ہماری نظروں سے گزرتے رہے۔ دوری نے ان تمام خطوں کو ایک خاص سلیٹی رنگ میں ڈبو دیا تھا۔ اجنبی تناظر نے ہماری دنیا کو کتنا اجنبی بنا دیا تھا۔ ٹڈی دل، اور ہاتھیوں کے غول میدانوں میں دوڑتے نظر آتے اور میدان اتنے وسیع اور اتنے گھنے لگتے کہ ان کے درمیان کوئی فرق نہ محسوس ہوتا۔

مجھے تو وہاں بے حد خوش ہونا چاہیے تھا، وہ خواب جو میں نے دیکھا تھا— اس کے ساتھ بالکل تنہا ہونے کا خواب— اس خواب کی تکمیل ہو چکی تھی۔ چاند کی قربت، جس کے لیے میں اپنے عم زاد

نے حسد کرتا، اور کپتان کی بیوی، اب صرف میرے اختیارِ شاہی میں تھی۔ قمری دنوں اور راتوں پر محیط ایک طویل مسلسل ماہ ہمارے سامنے تھا۔ چاند کی سطح پر پایا جانے والا ارضی نباتات کا مرکب، دودھ، ہمارا پیٹ بھرتا، وہ دودھ جس کے ترش ذائقے سے ہم پہلے ہی آشنا تھے۔ ہم اس سیارے کی طرف دیکھتے جہاں ہم پیدا ہوئے تھے، وہ دنیا جو ہمیں اپنے طول واطراف دکھا چکی تھی، اور ہم وہ مناظر دیکھ چکے تھے جو آج تک زمین کے باسیوں نے نہ دیکھے ہوں گے۔ یا پھر ہم ستاروں کو تکا کرتے۔ چاند سے دور ستارے، بڑے بڑے، روشنی کے بنے ہوئے، افق کی خم دار ٹہنیوں میں پکے ہوئے پھلوں کی طرح جھلمل کرتے۔ تمام اشیا میری جگمگاتی جاگتی امیدوں سے کہیں بڑھ کر تھیں۔ لیکن ہم جلاوطن تھے۔

میں صرف زمین کے بارے میں سوچتا۔ وہ دنیا ہی تھی جس نے ہم دونوں کو وہ بنایا تھا جو ہم تھے۔ اس زمین سے بچھڑ کر مجھے یوں لگا جیسے نہ میں میں ہوں اور نہ وہ وہ۔ میں زمین پر واپسی کا آرزومند تھا اور اس کو ہمیشہ کے لیے کھودینے کے خیال سے کانپ اٹھا کرتا۔ میری محبت کے خواب کی تکمیل صرف اسی ایک لمحے میں ہوگئی تھی جب میں اور وہ ایک ہوئے، چاند اور زمین کے درمیان، فضا میں، لٹو کی طرح گھومتے ہوئے۔ زمین کی مٹی سے جدا ہو کر میری محبت کو صرف ان چیزوں کی یاد تڑپا رہی تھی جو اب نہیں تھیں، ایک مقام، ایک ماحول، ایک ابتدا، ایک انتہا۔

یہ تھے میرے احساسات۔ اور وہ کیا محسوس کرتی تھی؟ جب میں اپنے آپ سے سوال کرتا تو خوف وابہام میں ڈوب جاتا۔ اگر وہ بھی صرف زمین کے بارے میں سوچ رہی ہوتی تو یہ میرے لیے بے حد خوش آئند بات ہوتی۔ یہ اس بات کی نشان دہی ہوتی کہ وہ اب مجھے سمجھنے لگی ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ بھی ہوسکتا تھا کہ اب سب کچھ بے سود تھا، اور اب تک اس کے دل میں صرف اور صرف میرے گونگے عم زاد کے لیے چاہت تھی۔ لیکن اس صورتِ حال کے بجائے اب وہ تمام احساسات سے بے گانہ ہوچکی تھی۔ اس نے زمین کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ زرد زردسی چاندنی میں گھلی، وہ چاند کے سنسان ریگ زاروں میں بھٹکتی پھرتی، خود سے باتیں کرتی ہوئی، بربط کے تار چھیڑتی ہوئی۔ یوں محسوس ہوتا جیسے وہ مکمل طور پر چاند کے انداز میں ڈھل چکی ہو، اس میں ڈوب چکی ہو۔ کیا اس کا مطلب تھا کہ بالآخر میں اپنے رقیب پر حاوی آچکا تھا؟ نہیں! میں سب کچھ کھو چکا تھا، اور کتنی یقینی تھی میری

شکست ! کیونکہ اب اس کو علم ہو چکا تھا کہ میرا عم زاد صرف چاند سے محبت کرتا تھا۔ سواب وہ صرف چاند میں ڈھلنا چاہتی تھی۔ اپنے محبوب کے غیر انسانی محبوب میں سرایت کر جانا چاہتی تھی۔

جب چاند نے زمین کا چکر پورا کرلیا تو ہم جست کی چٹانوں کے اوپر آ پہنچے تھے۔ گو کہ میں نے اپنے ساتھیوں کو پہچان لیا لیکن میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ چاند اور زمین کا فاصلہ اتنا بڑھ جائے گا۔ وہ چھوٹے چھوٹے ذرّوں کی مانند نظر آ رہے تھے۔ ایک جوہڑ برابر سمندر میں میرے ساتھی کشتیوں پر نکلے ہوئے تھے۔ لیکن اس دفعہ ان کے پاس سیڑھی نہ تھی، بلکہ کشتیوں پر لمبے لمبے بانسوں کا ایک جنگل سا اُگا ہوا لگ رہا تھا۔ ہر شخص ایک بانس لہرا رہا تھا؛ کسی کے سرے پر برچھی بندھی ہوئی تھی اور کسی پر کانٹا اٹکا ہوا تھا— شاید چاند سے آخری دفعہ پنیری ٹکڑے نکالنے کے لیے، یا پھر ہم دو بدنصیبوں کی مدد کے لیے۔ لیکن جلد ہی یہ اندازہ ہو گیا کہ کوئی بانس اتنا لمبا نہ تھا کہ چاند کی سطح کے قریب بھی پہنچ سکے۔ ایک ایک کر کے سارے بانس سمندر میں گر گئے۔ اس افراتفری میں چند کشتیاں الٹ گئیں۔ اچانک ایک دوسری کشتی سے ایک لمبا سا بانس نمودار ہوا۔ وہ یقیناً لاتعداد بانسوں کو جوڑ کر بنایا گیا تھا۔ اس کو فضا میں بلند کرنے کے لیے انھیں بے حد آہستگی اور احتیاط سے کام لینا پڑا۔ انتہائی قوت اور چابک دستی کے ساتھ انھوں نے وہ بے حد لمبا بانس فضا میں بالکل سیدھا اس طرح اٹھایا کہ کشتی کا توازن نہ بگڑے۔

اچانک یہ بات واضح ہو گئی کہ بانس کا سرا چاند کی سطح سے چھو جائے گا۔ پھر ہم نے دیکھا کہ بانس نے چاند کی کھردری، چھلکوں والی سطح کو چھوا۔ تھوڑی دیر ساکت رہا۔ پھر چھوٹے سے طاقتور جھٹکے سے اٹھ گیا۔ پھر دوبارہ اسی مقام پر آ ٹکا۔ اور پھر اٹھ گیا۔

میں اور کپتان کی بیوی دونوں پہچان گئے۔ یہ میرا عم زاد تھا۔ اس کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ چاند کے ساتھ آخری دفعہ اٹھکھیلیاں کر رہا تھا۔ چاند اس کے بانس کے سرے پر تھا، جیسے وہ اسے لڑھکنی دینا چاہتا ہو۔ ہمیں احساس ہوا کہ اس کھیل کا کوئی مقصد نہ تھا، نہ تو وہ چاند کا دودھ نکالنا چاہ رہا تھا، اور نہ ہی اس کو ہماری مدد سے غرض تھی۔ بلکہ تم کہہ سکتے ہو کہ وہ چاند کو دور دھکیلنے کی معصوم سی کوشش کر رہا تھا۔ اب جبکہ چاند اس سے دور جا رہا تھا، وہ اپنے محبوب کی روانگی میں اس کی مدد کر رہا تھا، گویا وہ چاند کو اس کی اگلی منزل کے مدار کا رخ دکھا رہا ہو۔ اور یہ گونگے کی فطرت کے عین مطابق تھا؛ وہ کوئی ایسی آرزو

کر ہی نہ سکتا تھا جو چاند کی طرت کے خلاف ہو، جو اس کے راستے اور اس کی منزل کے خلاف ہو۔ اور اب جبکہ چاند اس سے دور ہونا چاہتا تھا، اس کی جدائی میں بھی وہ اتنا ہی خوش تھا جتنا کہ وہ چاند کی قربت سے مسرور ہوا کرتا تھا۔

یہ حقیقت جاننے کے بعد مسز وحد وحد کیا کر سکتی تھی؟ یہی وہ لمحہ تھا جب اس نے اس بات کا ثبوت دیا کہ اس کا عشق محض دل لگی نہیں بلکہ اٹل عہد تھا، ایک کبھی نہ ٹوٹنے والا بندھن۔ اگر میرے عم زاد کو ایک دور جاتے ہوے چاند سے محبت تھی، تو وہ بھی اس کی نظروں سے دور ہو جائے گی، چاند کے ساتھ ساتھ، ہمیشہ کے لیے۔ میں نے یہ جان لیا جب میں نے دیکھا کہ بجاے بانس کی طرف بڑھنے کے اس نے بربط زمین کے رخ کیا اور اس کے تاروں کو چھیڑنے لگی۔ گو کہ میں کہہ رہا ہوں کہ میں نے دیکھا، لیکن درحقیقت میں نے اس کی صرف ایک جھلک دیکھی؛ کیونکہ جیسے ہی بانس نے چاند کی سطح کو دوبارہ چھوا، میں نے جھپٹ کر اس کو پکڑ لیا اور سانپ کی سی سرعت سے اس پر چڑھنے لگا۔ اپنے بازوؤں اور ٹخنوں کی مدد سے خود کو دھکیل دھکیل کر میں بانس پر چڑھتا گیا۔ میرے اندر ایک انجانی سی طاقت آ گئی تھی جو مجھے زمین پر لوٹنے کا حکم دے رہی تھی۔ اس مقصد سے بے نیاز جس کے لیے میں یہاں آیا تھا—— بلکہ شاید اس مقصد اور اس کے دردناک انجام سے واقف—— میں بانس پر چڑھتے چڑھتے اس مقام تک پہنچ گیا جو چاند کی مقناطیسیت کے دائرے کے باہر تھا۔ اس کے بعد مجھے کوئی کوشش نہیں کرنی پڑی۔ میں خود بخود بانس پر اوندھے منھ پھسلتا گیا، یہاں تک کہ بانس میری بے صبری سے ٹوٹ گیا۔ اس کے ہزاروں ٹکڑے اور میں، ایک چھپاکے کے ساتھ سمندر میں گر گئے۔

میری واپسی سرور انگیز تھی۔ میرا گھر، میری زمین مجھے مل چکی تھی۔ لیکن اُس کو ہمیشہ کے لیے کھو دینے کا خیال مجھے اداس کیے ہوے تھا۔ اور میری آنکھیں چاند کی طرف لگی ہوئی تھیں، وہ چاند جو اب میری پہنچ سے باہر تھا۔ میری نگاہیں اس کو تلاش کرنے لگیں۔ اور پھر میں نے اسے دیکھا۔ وہ وہیں تھی جس جگہ میں نے اسے چھوڑا تھا۔ ساحل پر لیٹی ہوئی، ہمارے سروں کے عین اوپر۔ وہ بالکل خاموش تھی۔ چاندنی میں ڈوبی ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں بربط تھا۔ اس کا ایک ہاتھ کبھی کبھی آہستہ سے اٹھتا اور دھیمے دھیمے سُر پھوٹتے۔ اس کے جسم کے خدوخال واضح تھے... اس کے پستان، بازو، رانیں—— ان کے خم مجھے آج بھی یاد ہیں۔ آج بھی، جب چاند ہم سے اتنی دور، ایک چپٹی سی ٹکیا میں تبدیل ہو گیا ہے۔

میری نگاہیں آج بھی چاند میں اس کو تلاش کرتی ہیں، جب چاند باریک کمان کی صورت میں آسمان پر نمودار ہوتا ہے۔ جیسے جیسے وہ پھیلتا جاتا ہے، مجھے لگتا ہے کہ میں اس کو واضح طور پر دیکھ سکتا ہوں۔ وہ یا اس کا سایہ۔ لیکن صرف وہی۔ ہزاروں مناظر میں، افق پر، وہ جس کی وجہ سے چاند چاند ہے۔ اور جب وہ پورا ہوتا ہے، کتے رات بھر اس کی طرف منہ کر کے بھونکتے ہیں! اور میں بھی ان کے ساتھ۔

❋❋

دانیال الارکون

مسخروں کا شہر

جب میں اس صبح اسپتال پہنچا تو میں نے اماں کو فرش پونچھتے پایا۔ میرا باپ کل مرا تھا اور اماں کے چکانے کے واسطے اسپتال کا بل چھوڑ گیا تھا۔ اسپتال میں اسے پوری رات کام کرنا پڑا تھا۔ وہ بل میں نے دفتر سے لی ہوئی پیشگی رقم سے چکایا۔ میں نے اماں کو بتایا کہ مجھے بہت افسوس ہوا ہے، اور مجھے تھا افسوس۔ اس کا چہرہ سوجا ہوا تھا اور سرخ ہو رہا تھا، لیکن اب وہ رو نہیں رہی تھی۔ ''یہ کارمیلا ہے،'' اس نے میرا تعارف ایک تھکی ہوئی افسردہ کالی عورت سے کرایا۔ ''تمھارے باپ کی دوست۔ کارمیلا میرے ساتھ فرش صاف کرا رہی ہے،'' میری ماں نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا، گویا وہ چاہتی ہو کہ مجھے اس بات سے کچھ اخذ کرنا چاہیے۔ میں نے اخذ کیا۔ مجھے معلوم تھا وہ عورت کون تھی۔

''آسکراسیتو؟ میں نے تمھیں اس وقت سے نہیں دیکھا جب تم اتنے سے تھے،'' اس نے اپنی ران کے وسط کو چھوتے ہوئے کہا اور ہاتھ آگے بڑھایا۔ میں نے بادلِ ناخواستہ اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیا۔ اس کی بات میں کوئی شے ایسی تھی جس نے مجھے بدحواس سا کر دیا۔ میں نے کیا اسے کبھی دیکھا تھا؟ میں یقین نہ کر سکتا تھا کہ وہ میرے سامنے کھڑی تھی۔

اس شبِ بیداری میں جب اس کی میت کے گرد سب جمع تھے، میں نے اپنے سوتیلے بھائیوں کو پہلی بار دیکھا۔ میں نے گنا، تین تھے۔ گذشتہ بارہ سال میں میں نے خود کو اپنے باپ کی دوسری زندگی سے الگ تھلگ کر لیا تھا؛ اس وقت سے جب اس نے ہمیں چھوڑا تھا، میری چودھویں سالگرہ کے بعد۔ کارمیلا اس کی محبوبہ تھی اور پھر عمومی قانون کے تحت اس کی بیوی بن گئی۔ بوٹے سے قد، تانبے جیسی

رنگت، زمرّدی آنکھوں والی، وہ میرے تصور سے زیادہ دلکش تھی۔ اس نے سادہ سا سیاہ لباس پہنا ہوا تھا، میری ماں کے لباس سے بہتر۔ ہم دونوں خاموش رہے۔ لیکن وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی، آنسوؤں کی اوٹ سے۔ وہ اور میری ماں باری باری رو رہی تھیں اور ایک دوسرے کو دلاسے دے رہی تھیں۔ کسی کو اس بیماری کی توقع نہ تھی جس نے میرے باپ کو اچانک ختم کر دیا۔

کارمیلا کے بیٹے میرے بھائی تھے، یہ تو واضح تھا۔ ہم سب میں دون ہیوگو کی جھلک تھی۔ گھتی ہوئی گہری سیاہ آنکھیں، لانبے بازو اور پستہ ٹانگیں۔ وہ مجھ سے چند سال چھوٹے تھے۔ جو سب سے بڑا تھا وہ غالباً سترہ سال کا ہوگا، اور سب سے چھوٹا گیارہ کا۔ میں تذبذب میں تھا کہ ان کی طرف متوجہ ہوں یا نہیں۔ میں جانتا تھا کہ سب سے بڑا ہونے کے ناتے مجھے ایسا کرنا چاہیے۔ میں نے ایسا نہیں کیا۔ بالآخر ماؤں کے اصرار پر ہم نے ایک دوسرے سے ہاتھ ملائے۔ ''اوہ، رپورٹر،'' سب سے بڑے والے نے کہا۔ اس کی مسکراہٹ میرے باپ کی طرح تھی۔ میں نے کوشش کی کہ میں ان سب پر اپنی فوقیت واضح کر دوں، غالباً عمر کی بنا پر، یا پھر اس بنیاد پر کہ وہ کالے تھے، یا پھر اس بنا پر کہ میں حقیقی بیٹا تھا۔ لیکن میں ایسا نہ کر سکا۔ میرا دل اس میں نہ تھا۔ انھوں نے میری ماں کو چھوا۔ وہ ہلکے پھلکے بے نیاز لمس جن سے ایک خاص قربت کا احساس ہوتا ہے، گویا وہ ان کی چہیتی خالہ ہو نہ کہ ان کی ماں کی سوکن۔ میری ماں بھی اب ان کی ہو چکی تھی۔ پہلوٹھی کی اولاد ہونا کوئی معنی نہ رکھتا تھا۔ اصل میں وہی لوگ دون ہیوگو کا حقیقی خاندان تھے۔

دوسرے دن اخبار کے دفتر میں میں نے کسی سے اپنے باپ کی موت کا ذکر نہ کیا، سوائے اس شخص کے جو وفات کی خبریں بناتا تھا۔ اس سے میں نے کہا، ایک موت کی اطلاع کا متن لکھ دے، میری ماں کی طرف سے۔ ''کیا کوئی رشتہ دار ہے؟'' اس نے بیگانگی سے پوچھا۔

''خاندانی دوست،'' میں نے کہا، ''یہ کام کر دو گے میرے لیے؟ کرو گے؟'' میں نے اسے کاغذ کا پرزہ تھماتے ہوئے کہا۔

> ''ہیوگو یورائب بانیگاس، سیرو دی پاسکو کا رہنے والا، گزشتہ فروری کی دو تاریخ کو، داس دی میوا سپتال، لیما میں ابدی زندگی کے سفر پر روانہ ہوا۔ ایک

اچھا دوست اور شوہر، اس نے اپنے پیچھے ڈونا ماری سول لارا دی یورائب کو
چھوڑا۔ اس کو ابدی سکون نصیب ہو۔''

میں نے خود کو اور اپنے بھائیوں کو اس خبر سے الگ رکھا۔ اور کارمیلا کو بھی۔ وہ لوگ موت کی اطلاع کا انتظام خود کر سکتے تھے، اگر وہ چاہتے، اگر وہ مقدور رکھتے۔

لیما میں وہ لوگ جو پُرتشدد، قابلِ دید انجام کو پہنچتے ہیں ان کی موت ایک ایک روپے والے اخباروں میں خونخوار سرخیوں تلے منائی جاتی ہے۔ ''ڈرائیور کا سر تربوز کی مانند پھٹ گیا۔'' ''نارکوٹک مقابلہ: راہگیر نے سیسہ چبایا۔'' میں اس قسم کے اخبار میں کام نہیں کرتا ہوں لیکن اگر کر رہا ہوتا تو میں بھی اسی قسم کی سرخیاں لکھ رہا ہوتا۔ اپنے باپ کی طرح میں کبھی کسی کام سے انکار نہیں کرتا۔ میں نے ہیروئن اور چرس کے چھاپے، پولیس مقابلے، قتل، رقص گاہوں اور بازاروں میں آتش زدگی، ٹریفک کے حادثات، شاپنگ سنٹروں میں بموں کے دھماکے، سب بھگتائے ہیں۔ میں نے رشوت خور سیاستدانوں، سابق سوکر کھلاڑیوں اور ان مصوروں کے انٹرویو کیے ہیں جو دنیا سے نفرت کرتے ہیں۔ لیکن میں نے کبھی کسی ادھیڑ عمر مزدور کی کسی سرکاری اسپتال میں موت پر کچھ نہیں لکھا جس کی موت کا سوگ اس کا بچہ، اس کی بیوی، اس کی دوسری بیوی اور دوسرے بچے منا رہے ہوں۔

میرے باپ کی موت خبر نہ تھی، مجھے معلوم تھا۔ اور کوئی وجہ نہ تھی کہ یہ موت پریشان کن یا حیرت انگیز ثابت ہو۔ دفتر میں میں اپنا مضمون ٹائپ کرتا رہا اور اس کے گزرنے نے مجھے چنداں متاثر نہ کیا۔ لیکن اس سہ پہر وِیا کورتا نے مجھے مسخروں پر تحقیق کرنے کے لیے باہر بھیج دیا۔ سڑکوں پر کھیل تماشے دکھا کر، کچھ بیچ کر پیسے کمانے والوں کے بارے میں فیچر، جو اس نے مجھے اتوار کے شمارے کے لیے چند ہفتے قبل تیار کرنے کو کہا تھا۔ شاید میں پہلے ہی اداس موڈ میں تھا لیکن اس مضمون کے خیال نے مجھے افسردہ کر دیا۔ مسخرے، اپنی احمقانہ اور بھدی مسکراہٹ کے ساتھ، اپنے بوسیدہ، بھڑکیلے لباس میں۔ میں کچھ ہی دور آیا تھا جب مجھے ایک ناقابلِ توجیہہ زیاں کے احساس نے آ گھیرا۔ شہر کی سڑکوں کا ضدی شور، ریڈیو پر اناؤنسر کی بھڑکتی آواز، سورج کی تپش۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے لیما میرا تمسخر اڑا رہا ہو، مجھے نظرانداز کر کے، اپنی لاتعلقی کو مجھ پر لادتے ہوئے۔ ایک بھاری بھرکم عورت ایک ٹھیلے پر نقلی بالوں کی ٹوپیاں بیچ رہی تھی۔ ایک تھکا ہوا مسخرہ فٹ پاتھ کی کناری سے ٹکا بیٹھا تھا۔ اس کے ہونٹوں میں سگریٹ

دبا ہوا تھا۔ اس نے مجھ سے ماچس مانگی۔ میرا دل نہ ہوا کہ میں اس کا انٹرویو کرتا۔ لگتا تھا دھوپ میرے اندر سے گزر کر پار ہو رہی ہو۔ میرا چھوٹا سا خاندان ایک دوسرے گروہ میں تحلیل ہو گیا تھا، ایک ایسے گروہ میں جس میں میرا کوئی کردار نہ تھا۔

لیما میں میرا باپ تعمیراتی کام میں لگ گیا تھا۔ اس نے دفاتر بنائے، مکانوں کو نئی شکل دی۔ اسے ہتھوڑا چلانا آتا تھا۔ وہ رنگ کر سکتا تھا۔ نقش نگاری کر سکتا تھا۔ چار گھنٹوں میں ایک دیوار کھڑی کر سکتا تھا۔ وہ پلمبر تھا، اور قفل ساز، بڑھئی اور ویلڈر۔ جب اسے کوئی کام ملتا تو وہ ہمیشہ ایک ہی جواب دیتا، ''میں یہ کام جانتا ہوں۔'' ان اوزاروں کو دیکھتے ہوئے جو اس نے زندگی میں پہلے کبھی نہ دیکھے ہوتے، وہ ٹھیکے دار سے کہتا، ''یہ کام میں کئی دفعہ کر چکا ہوں۔'' بچپن میں میں نے اسے اور اس کی محنت کو ہمیشہ سراہا۔ ترقی ہمارے محلے میں ناپی جا سکتی تھی: تمھارے اپنے گھر کی دوسری منزل کتنی تیزی کے ساتھ تعمیر ہوئی، کتنی سرعت کے ساتھ تم نے متوسط طبقے کی زندگی کا ساز و سامان حاصل کیا۔ ہفتے کے دوران وہ دوسروں کے گھروں میں کام کرتا اور چھٹی والے دنوں ہمارے گھر میں۔ محنت کا معاوضہ بھی موصول ہوتا رہا۔ ہم نے نئے اسٹیریو کا افتتاح Hector Lavoe کے ٹیپ سے کیا۔ ہم نے ۱۹۸۵ء کا 'کوپا امیریکا' میچ رنگین ٹیلی وژن پر دیکھا۔

یقیناً وہ سب کچھ اتنا واضح، اتنا شفاف نہ تھا۔ بے شک، میرا باپ لیما کی بنیادی سچائی کو بہت جلد جان چکا تھا: اگر پیسہ بنانا ہے تو اسے شہر کی کنکریٹ کی اینٹوں سے نچوڑنا ہوگا۔ کوئی ہارتا ہے، کوئی جیتتا ہے، اور کچھ طریقے ہوتے ہیں جن سے پانسا اپنی طرف جھکایا جا سکتا ہے۔ وہ پرکشش شخصیت کا حامل تھا اور اپنا کام ٹھیک کرتا تھا اور ہمیشہ اپنا خیال خود رکھتا تھا۔

اس کی بے چین فطرت نے اسے آبائی گھر میں رہنے نہ دیا۔ پاسکو، جہاں وہ، میری ماں اور میں پیدا ہوئے تھے، نہ شہر تھا نہ دیہات۔ عجب نرالی جگہ تھی۔ الگ تھلگ سی اور نادار، بے ڈھنگی جگہ، آنڈین پونا کی اونچائی پر واقع۔ لیکن ایک خاصیت اس کی شہری ہے: وقت کا میکانکی تصور۔ اور کسی کو سرمایہ دارانہ نظام کی ٹِک ٹِک سے نجات نہیں ہے۔ یہ کان کنی کا قصبہ ہے۔ پاسکو میں نہ زراعت ہے اور نہ گلہ بانی۔ مرد زمین کی تہہ میں اترتے ہیں، دس دس گھنٹوں کی شفٹوں میں۔ ان کا معمول یکساں ہے، اور اکتا دینے

والا۔ پھر زمین ان کو اگل دیتی ہے اور وہ نمودار ہوتے ہیں — صبح، دوپہر، شام — اور شراب پینا شروع کر دیتے ہیں۔ مرد جو کام کرتے ہیں وہ خطرناک ہے۔ اور وقت کے ساتھ ساتھ ان کی بر سرِ زمین زندگی زیرِ زمین زندگی کی مانند ہو جاتی ہے: وہ زندگی سے کھیلتے ہیں، شراب پیتے ہیں، کھانستے ہیں اور ایک سیاہ گاڑھا مائع تھوکتے ہیں۔ وہ اس کو 'پیسوں کا رنگ' کہتے ہیں، اور ایک اور جام خرید لیتے ہیں۔

میرا باپ ایسے لگے بندھے ضابطوں کے مطابق زندگی گزارنے کے لائق نہ تھا، لہٰذا اس نے ٹرک چلانے کا کام ڈھونڈ نکالا، ساحل اور شہر کے درمیان۔ جب اس نے میری ماں سے شادی کی وہ انتیس سال کا تھا، اپنی جواں سال بیوی سے تقریباً دس برس بڑا۔ اس نے گزشتہ کئی سال شہر میں کام کرتے ہوئے گزارے تھے۔ صرف تین چار ماہ میں ایک بار گھر آتا۔ یہ رومان کسی طرح انھی گنی چنی آمدوں میں پھلا پھولا۔ جب دونوں کی شادی ہوئی تو وہ ایک دوسرے کے ساتھ پانچ سال سے رہ رہے تھے، گوکہ زیادہ وقت ان کا ایک دوسرے سے الگ گزرا تھا۔ میں شادی کے چھ ماہ بعد پیدا ہوا۔ میرا باپ برسوں یونہی آتا جاتا رہا، لیما میں اپنا گھر بناتا رہا، سان حوان دی لوری گانچو کے محلے میں۔ جب میری ماں سے گھر میں اکیلے رہنا مزید برداشت نہ ہو سکا تو وہ ہمیں بھی شہر لے آیا۔

یہ میرے خیال میں واحد اچھا کام تھا جو اس نے ہمارے لیے کیا۔ یا میرے لیے۔ جب میں پاسکو کو یاد کرتا ہوں، اس کی خفیف ہوا اور دھنستے ہوئے گھروندوں کو، تو یہاں ہونے پر شکر ادا کرتا ہوں۔ میں لیما میں پلا بڑھا، یہیں یونیورسٹی گیا اور ایک باعزت نوکری حاصل کی۔ پاسکو میں کوئی مستقبل نہیں، بچے وہاں پڑھائی سے جی چراتے ہیں اور ویسے بھی انھیں کچھ نہیں پڑھایا جاتا۔ وہ خالی لفافوں میں لگی گوند سونگھتے ہیں یا صبح کی کمزور روشنی میں اسکول جانے سے پہلے شراب پی کر دھت ہو جاتے ہیں۔

میں آٹھ سال کا تھا جب ہم یہاں آئے۔ میرا باپ اجنبی تھا، مجھے لگتا میری ماں کے لیے بھی۔ لیما کو جانے والی بس میں بیٹھے ہوئے انھوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے رکھا تھا اور میں ماں کی گود میں سوتا رہا تھا، گوکہ اس وقت میری گود میں سونے والی عمر نہ تھی۔ وہ جنوری کا آغاز تھا۔ ہم نے برف میں لپٹے ہوئے پاسکو کو پیچھے چھوڑا۔ ٹین کی چھتوں پر ہونے والی ژالہ باری کی تیز اور دھیمی ہوتی تال سنتے ہوئے، مدھم ہوتے نارنجی روشنی کے دائروں کو پیچھے چھوڑتے ہوئے۔ اور جب میری آنکھ کھلی تو صبح کا وقت تھا اور ہم شہر کے بس اڈے کے اندر داخل ہو رہے تھے۔ ''یہاں برے لوگ رہتے ہیں،'' میرے

باپ نے مجھے خبردار کیا تھا۔ ''مرد بنو۔ اب تم بڑے ہو گئے ہو۔ تمھیں اب اپنی ماں کا خیال رکھنا ہے۔''

میں شہر آ چکا تھا، دو سال پہلے، گو کہ وہ سفر مجھے مبہم ہی سے یاد ہیں۔ میرا باپ ایک دن پاسکو آیا اور مجھے تین ہفتے کے لیے اپنے ساتھ لے گیا۔ اس نے مجھے شہر میں گھمایا۔ اہم عمارتیں دکھائیں، متحرک سڑکیں دکھائیں۔ مجھے یاد ہے میری ماں بتاتی تھی کہ چھ سال کی عمر میں میں اس سے زیادہ سفر کر چکا تھا۔ وہ میرا ہاتھ پکڑے ہوئے تھی اور ہمارے اطراف دنیا گھوم رہی تھی، اور میں نے دیکھا کہ میرا باپ مردوں کے ایک ہجوم کو دھکیلتا ہوا بس کے سامان خانے کے دروازے تک پہنچا۔ وہ ایک دوسرے کو کہنیاں مار رہے تھے، دھکے دے رہے تھے۔ ہجوم کبھی ایک سمت میں پھولتا، کبھی دوسری سمت میں، اور میرا باپ، جو کوئی زیادہ مضبوط جسم کا نہ تھا، اس ہجوم کے مرکز میں غائب ہو گیا۔ میں اور میری ماں انتظار کرتے رہے۔ میں ایک مونچھوں والے شخص کو تک رہا تھا جو ہمارے گرد ٹہل رہا تھا۔ اس کی حرص ناک نظریں میری ماں کے سرخ اونی تھیلے پر لگی ہوئی تھیں جو ماں نے اپنے اور میرے درمیان بھینچا ہوا تھا۔ پھر ایک شور مچا۔ ایک آدمی نے دوسرے کو دھکا دیا اور اس پر چوری کا الزام لگایا۔ الزام لگانے والے نے اپنا پیر مضبوطی سے اپنے بکسے کے اوپر جمایا ہوا تھا۔ اس پر ٹیپ منڈھا ہوا تھا اور نام پتا درج تھا۔

''اوئے، تم میرے سامان کو کیوں ہاتھ لگا رہے ہو؟''

''اوہ، معافی چاہتا ہوں، غلطی ہوئی۔'' دوسرا آدمی میرا باپ تھا۔ ''یہ غلطی سے ہوا تھا،'' اس نے احتجاج کیا۔ ''بکسے ایک سے لگتے ہیں۔'' میرے باپ کے لمبے بازو جھکے ہوئے تھے اور اس کی ہتھیلیاں مضحکہ خیز انداز میں اوپر اٹھی ہوئی تھیں۔ لیکن بڑی عمر کا آدمی غصے میں بپھر رہا تھا۔ ''نہیں، یہ کوئی غلطی نہیں تھی۔ تم چور ہو۔'' لوگوں نے ان دونوں کو کھینچ کر الگ کیا۔ اس دھندلاہٹ میں میں نے دیکھا کہ میرا باپ مجھے دیکھ کر مسکرایا۔ اور مجھے احساس ہوا کہ ہم لوگ صرف تھیلے لائے تھے، بکسے نہیں۔

کانگریس کے سامنے، ایوی نیدا ایبانکے کے ساتھ ساتھ، ایک مظاہرہ فٹ پاتھ تک چھلک آیا تھا اور پانچ بلاک تک ٹریفک جام ہو گیا تھا۔ مظاہرین تعمیراتی مزدور تھے یا ٹیلی فون کمپنی کے ملازمین یا ڈاکٹر۔ سماجی تحریکیں، دوسرے شکاریوں کی طرح، اپنے شکار کی کمزوری کو بھانپ لیتی ہیں۔ صدر لڑکھڑا رہا تھا۔ اس کی نصف کابینہ مستعفی ہو چکی تھی۔ لیکن سڑک پر لیما شہر اسی طرح نظر آ رہا تھا—

حسین، بے آبرو، دکھی اور تبدیلی سے عاری۔ میں شہر کے نواح میں ایک پریس کانفرنس سے ہو کر آیا تھا اور بس میں بیٹھ کر شہر لوٹ رہا تھا۔ فضا بوجھل اور کثیف تھی۔ ایک خوش اندام خاتون پولیس، خاکی یونیفارم میں گاڑیوں کو باریو آلتوز کی تنگ گلیوں سے مشرق کی طرف نکل جانے کا اشارہ کر رہی تھی، جہاں گھٹے ہوئے مکانات ایک دوسرے پر گرے پڑ رہے تھے، جہاں بچے سستے فیتوں سے بندھے ہوئے جوتوں کے ساتھ موقعے کی تلاش میں سست روٹریفک کا جائزہ لے رہے تھے۔

ایک روز قبل وہاں سرِراہ ڈکیتیاں ہوئی تھیں، کئی بسوں کو سگنل کی سرخ بتی کے دوران لوٹا گیا تھا، اور ہم سب کے اعصاب تنے ہوئے تھے۔ ہم نے اپنے اپنے تھیلے اپنے سینوں سے کس کر لگا رکھے تھے۔ وہ کارنیوال کا پہلا ہفتہ تھا اور پانچ سے پندرہ سال کی عمر کا ہر فرد (جو باریو آلتوز میں تقریباً ہر ایک تھا) پانی کے غبارے لیے سڑکوں میں موجود تھا، ہراساں کرنے کے لیے بے تاب۔ ہم مخمصے میں تھے کہ اسے کس طرح بھگتایا جائے۔

''اوئے، شیشہ بند کرو۔''

''دھیرج! گرمی بہت ہے، شیشہ کھلا رہے گا۔''

جنگ چھڑ چکی تھی؛ ایک طرف وہ لوگ تھے جو چوری یا بدتمیزی کے خدشے کو نظر انداز کر کے دم گھونٹنے والی گرمی سے نمٹنے کے لیے شیشے کھلے رکھنا چاہتے تھے، اور دوسری طرف وہ جو یہ نہیں چاہتے تھے۔ ڈرائیور اپنی گھر کی بنی سیٹ بیلٹ سے بندھا ہوا کسمسایا۔ کھڑکیاں کھلیں، بند ہوئیں۔ اوپر نیچے، دائیں بائیں، شیشے دھکیلے گئے اور فٹ پاتھ پر رال ٹپکاتے لڑکے، ہاتھوں میں بالٹیاں لیے پانی کے غباروں کو یوں مسلتے رہے گویا کہ اپنے عزیز ترین دوست کی محبوبہ کے پستانوں کو مسل رہے ہوں۔ اور پھر چاروں طرف سے یلغار شروع ہو گئی۔ ٹوٹی پھوٹی عمارتوں کے بیچ میں سے، چھتوں پر سے، بچے ہاتھ اوپر گھما کر، نیچے جھک کر، نشانہ تاک کر، دو دو غبارے ایک ساتھ پھوڑ رہے تھے۔ بس کی ٹوٹی کھڑکیوں سے پانی کی بوچھاریں آ رہی تھیں۔ بھیگے ہوئے فٹ پاتھ سرخ، سبز اور سفید پھٹے ہوئے غباروں سے اٹ گئے تھے۔ مجھے جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ شکار ہماری بس، یا بس کے اندر بیٹھا کوئی فرد نہ تھا اور نہ، جیسا کہ اکثر ہوتا تھا، سفید شفاف لباس پہنے کوئی جوان عورت، بلکہ شکار فٹ پاتھ پر پانی کی بوچھاروں اور پھٹتے ہوئے غباروں سے بچتا ہوا ایک مسخرہ تھا۔

وہ ایک خوانچہ فروش تھا، ایک غریب مسخرہ، روزی کمانے کی کوشش کرتا ہوا۔ وہ ایک بس سے اترا اور خود کو سو بچوں کے درمیان گھرا ہوا پایا۔ اس نے اپنی ٹھوڑی سینے سے لگالی تھی تا کہ اس کی پچ رنگی مصنوعی بالوں کی ٹوپی یہ حملے روک سکے۔ گلابی اور آتشی دھاریاں اس کے رخساروں اور کپڑوں پر بہہ رہی تھیں۔ وہ کہیں نہ جاسکتا تھا۔ ایک قدم آگے، ایک پیچھے، ایک قدم دیوار کی طرف، ایک قدم فٹ پاتھ کی کناری کی جانب۔ وہ اپنے بڑے بڑے جوتوں میں بھونڈے پن سے رقص کر رہا تھا۔ ہماری بس میں قہقہے گونج رہے تھے، قہقہے جو اتحاد کے جذبے کو جنم دیتے ہیں۔ بس میں بیٹھے لوگ اپنے تفکرات، اپنے خیالات کی دنیاؤں سے نکل کر اس کی طرف اشارہ کناں تھے اور تمسخر اڑا رہے تھے۔ پھر کنڈکٹر نے رحم کھا کر بس کا دروازہ کھولا اور مسخرے کو کھینچ کر اوپر چڑھالیا۔

ہم خاموش ہو گئے۔ بس کے زنگ خوردہ دھات کے فرش پر مسخرے کے لباس سے پانی ٹپک رہا تھا۔ چہرے پہ لگا ہوا سفید رنگ مٹیالا ہو کر بہہ رہا تھا اور اس کے آتشی بال اس کے رخساروں سے چپک گئے تھے۔ اس غریب مسخرے کو دیکھ کر میرا دل رونے کو چاہا۔ لیما کا باسی، عام سا شہری۔ بس ساکت تھی، اور پھر حرکت میں آگئی۔ غباروں کی بوچھاڑیں پیچھے رہ گئیں۔ اور اس بے چین خاموشی میں، اپنے بکھرے ہوئے حلیے کے ساتھ، مسخرے نے اپنا کام شروع کیا۔ لباس کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ ایک تھیلی نکالی، پودینے کی میٹھی گولیوں سے بھری۔ تھیلی سے پانی کی بوندیں رس رہی تھیں۔ ''خواتین و حضرات،'' اس نے اعلان کیا۔ ''میں آج آپ کے سامنے ایک نئی چیز پیش کرتا ہوں، ایسی چیز جو آپ نے پہلے کبھی نہ دیکھی ہوگی۔ یورپی مِنٹ بنانے کی جدید ترین ٹیکنالوجی سے تیار شدہ...''

ہم اب تک مظاہرے کا شور سن رہے تھے۔ کانگریس کی عمارت کی مغربی جانب لکڑی کی ڈوئیوں کے پتیلیوں میں بجنے کی آواز — ایک کند، بے تال شکایت — لوگوں کی گاڑھی آوازیں اور ان کا غیر واضح طیش۔ اب مسخرہ اپنی مصنوعی احمقانہ آواز میں ہمیں میٹھی گولیاں بیچنے کی کوشش کر رہا تھا — اس کی جبری مسکراہٹ، اس کی قوتِ ارادی۔

نیوز روم سرگرم تھا۔ معیشت پر ایک صدارتی اعلان نے کھلبلی سی مچادی تھی۔ افواہیں گردش میں تھیں: کابینہ کے کچھ ارکان فرار ہو گئے ہیں۔ میں نے کچھ زیادہ توجہ نہ دی۔ میں دفتر سے جلد اٹھ کھڑا ہوا

اور سان حوان اپنی ماں سے ملنے چلا گیا، اس اخبار کی ایک کاپی اٹھائے ہوئے جس میں میرے باپ کی موت کی اطلاع چھپی تھی —— میری طرف سے صلح کی پیشکش کی کوشش۔

سان حوان۔ میری پرانی سڑک۔ وہی ٹیڑھا بکولا پیڑ، شام کے دھندلکے میں اپنا سایہ لہراتا ہوا۔ میں شہر کے وسط میں چھ سال رہا تھا، لیکن چند ہی چہرے پہچانتا تھا۔ ریستوراں کا دان سیگندو جس نے ہمیں غالباً سو دفعہ کھانا کھلایا، جب ہم مشکل میں تھے۔ کونے والی سینورا نیلیدا، جو ہماری گیند کبھی نہ لوٹاتی تھی اگر وہ اس کی چھت پر چلی جاتی۔ ہماری پرانی پڑوسن ایلیزا ابھی وہاں تھی، اسی طرح لکڑی کے اسٹول پر بیٹھی ہوئی، اپنے اسٹور کے سامنے۔ اسٹول کا ایک پایہ دوسروں سے چھوٹا تھا جس کی مرمت ٹیلیفون ڈائریکٹری کو پائے اور زمین کے بیچ جما کر کی گئی تھی۔

''آنٹی،'' میں نے کہا۔

ہم نے پل بھر بات کی ہوگی۔ معمول کے مطابق۔ ہلکی پھلکی گفتگو۔ میں کیا کر رہا تھا۔ اخبار کے دفتر میں میرا کام۔ محلے میں وہ سب مجھ پر کتنا فخر کرتے ہیں جب وہ اخبار میں میرا نام چھپا ہوا دیکھتے ہیں۔ مجھے معلوم تھا یہ بات درست نہ تھی، کم از کم مجھ سے کم عمر لوگوں کے لیے۔ مجھے علم تھا کہ پرانے دوست مجھے کیسے دیکھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ میں کبھی ان کی دنیا کا حصہ تھا لیکن ایسے کسی دعوے کو کہ میں اب تک ان کی دنیا کا حصہ ہوں، وہ خاطر میں نہیں لا سکتے۔ ہم ایک دوسرے کی تاریخ کے اوجھل ہوتے ہوئے حصے تھے، رات کے سیاہ آسمان پر چمکنے والی سرعت سے پھیکی پڑتی ہوئی روشن لکیروں کی طرح۔

آخر کار ایلیزا نے کہا، ''تمھاری ماں گھر پر نہیں ہے، چینو۔''

گلیوں کے بلب جگمگا اٹھے تھے اور میں نے حیرانی سے دیکھا کہ یہ روشنیاں اب پہاڑوں کے اوپر رینگ رہی تھیں۔ محلہ ابھی تک پھیل رہا تھا۔ نئے لوگ ہر روز آتے، جیسے ایک دن ہم آئے تھے، اپنے تھیلوں، بکسوں اور امیدوں کے ساتھ۔ شہر میں ایک نئے زندگی تراشنے۔ ہم خوش قسمت تھے۔ ہمارے نئے گھر چھوٹے لیکن مضبوط بنے ہوئے تھے۔ ہمیں سب لوگوں نے خوش آمدید کہا تھا۔ ہماری گلیاں بچوں سے بھری ہوئی تھیں اور ایک ہفتے کے اندر اندر میں پاسکو کو فراموش کر چکا تھا، ان دوستوں کو بھلا چکا تھا جنھیں میں وہاں چھوڑ آیا تھا۔ میری ماں کو بطور خادمہ سان بورخا میں کام مل گیا تھا۔ ہفتے میں

چار دن، از کاراتمیں خاندان کے گھر میں۔ یہ ایک دوست نواز میاں بیوی تھے جن کا ایک بیٹا میرا ہم عمر تھا۔ وہ لوگ کچھ زیادہ ہی رحم دل، مہربان اور ہمدرد ثابت ہوے، خاص طور پر جب دون ہیوگو نے ہمیں چھوڑا۔ انھوں نے ہمیں پیسے ادھار دیے اور میری تعلیم کا خرچ برداشت کرنے میں ماں کی مدد کی، جب میرے باپ نے اس ذمے داری سے ہاتھ اٹھا لیے۔ انھوں نے کبھی میری ماں کو دیر تک کام کے لیے نہیں روکا۔ پھر وہ کہاں تھی اس وقت؟

ایلیزا نے جھینپتے ہوے کہا، ''تمھیں معلوم ہے چینو، وہ نیگرو عورت کے ساتھ رہ رہی ہے، کارمیلا کے خاندان کے ساتھ، لاوکٹوریہ میں۔''

''کب سے؟''

''جب تمھارا باپ بیمار پڑا تھا، تب سے، چینو۔'' ایلیزا نے مجھے ٹھہرنے کا اشارہ کیا اور ایک ہلکے سبز رنگ میں ملبوس عمر رسیدہ خاتون کو ایک کلو شکر تول کر دی۔ میں نے موت کی خبر والے اخبار کو موڑ کر ایک ڈنڈا سا بنا لیا تھا جس کو میں نے اپنی ران پر تھپتھپایا اور ایلیزا کی دی ہوئی خبر پر غور کیا۔ میرے لیے اس کے کیا معنی تھے؟ میری ماں کی حیران کن کمزوری، اس کے غرور کی تعجب انگیز کمی؟ یہ انتظام دونوں طرف سے کیسے کام کر رہا ہے، خاص طور پر اب جبکہ وہ مرد مر چکا ہے جس سے یہ دونوں عورتیں جڑی ہوئی تھیں؟ کارمیلا ملبوسات کی دکان چلاتی تھی، ایک چھوٹا سا کاروبار جو اس نے میرے باپ کی جمع کی ہوئی پونجی سے شروع کیا تھا — میرے پیسوں سے، وہ پیسے جنھیں شاید میری تعلیم، میری کتابوں پر صرف ہونا تھا۔ کاروبار کامیاب رہا تھا، لیکن کیا وہ دو بیواؤں اور تین بچوں کے دکھ کو سہارنے کے لیے کافی تھا جن میں سے دو اب تک اسکول میں تعلیم حاصل کر رہے تھے؟

جب گاہک نے سڑک کی راہ لی تو ایلیزا میری طرف مڑی۔

''تو کیا وہ کبھی یہاں آتی ہے؟ کبھی آئی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''تمھاری ماں؟ کبھی کبھار۔ میں نے اسے چند روز پہلے دیکھا تھا۔ میں کچھ زیادہ نہیں پوچھتی اس سے۔ تم تو جانتے ہو چینو، وہ شرمندہ ہے۔ اسے خوف ہے کہ تم کیا سوچو گے!''

''اسے معلوم ہے میں کیا سوچتا ہوں۔''

ایلیزا نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ''وہ نہیں چاہتی تھی کہ تمھیں معلوم ہو۔''

''پھر تمھیں بتانا نہیں چاہیے تھا۔''

ایلیزا دکان کے سامنے لگے ہوئے آہنی دروازے سے لگ گئی۔ ''آسکر...''

''مجھے معاف کردو، آنٹی۔'' میں نے اپنے جوتوں کی طرف دیکھا، ایک بدتمیز بچے کی طرح، اور زمین پر جمی ہوئی دھول پر اپنے جوتوں کے نشان مٹانے لگا۔ ''بہر حال، تمھارا شکریہ۔''

''میں اس کو بتادوں گی کہ تم آئے تھے جب میں اس سے ملوں گی۔ یا پھر، چینو، تم جانتے ہو، اگر تم چاہو تو تم...''

''شکریہ آنٹی۔''

شام ہو چکی تھی۔ اپنی پرانی سڑک سے میں بازار کے پیچھے میدان کو کسی بھی پہر پار کر لیتا تھا، بغیر کسی خوف کے، لیکن اب یہ غیر ضروری طور پر پُر خطر لگا۔ چرسی باہر آ چکے ہوں گے۔ کیا ہوگا اگر ماچس کی جلتی بجھتی لو میں میں کسی پرانے دوست کو پہچان گیا — راکھ ہوا، گم گشتہ دوست۔ میں طویل راستے سے ہوتا ہوا شاہراہ پر آ گیا۔

میں نے اپنی ماں کو تصور میں لانے کی کوشش کی، اس کے نئے گھر میں، مہمان خانے میں یا پھر بیٹھک میں پڑی چارپائی پر، جسے روز صبح اٹھا کر رکھنا پڑتا ہے۔ وہ اور کارمیلا آنسوؤں کے درمیان ایک دوسرے کو کہانیاں سناتی ہوئی، بوڑھے آدمی کو معاف کرتی ہوئی، بیواؤں کی بھولی بسری یادوں کا دوگانا گاتی ہوئی۔ ان دونوں میں کیا قدر مشترک تھی؟ کارمیلا ایک تاجر عورت تھی۔ اسے علم تھا کہ شہر کیسے چلتا ہے۔ میری ماں ایک کمسن لڑکی تھی جب میرے باپ سے ملی، صرف پندرہ سال کی۔ لیما میں میرے باپ نے سالسا رقص کرنا سیکھا تھا۔ سگریٹ اور شراب پینا، لڑنا جھگڑنا، عورتوں کے ساتھ سونا اور چوری کرنا سیکھا تھا۔ میری ماں نے یہ سب کچھ نہ سیکھا تھا۔ وہ ہیوگو کا انتظار کرتی رہی کہ وہ گھر آئے اور رشتہ بھیجے۔ اب تک اس کا لہجہ پہاڑی تھا۔ برسوں اسے صرف ایک بس کے بارے میں معلوم تھا — 'بڑی سبز بس' جو اس کو ازکاراتیس کے گھر تک لے جاتی تھی۔ کارمیلا اور میری ماں کا کس چیز میں ساجھا تھا سوائے ایک مشترکہ میدانِ جنگ کے؟ مجھے چکر آنے لگا۔ اُس جیسی زندگی ہی تمھیں اِس اہانت کے لیے تیار کرسکتی تھی۔

ہر سنیچر کو چھٹی والے دن، جب ہم لیما منتقل ہوے تھے، وہ مجھے از کار آتیں کے گھر لے جاتی۔ ہم اس بڑی سبز بس میں سوار ہوتے، میری ماں تنے ہوے اعصاب کے ساتھ سڑکوں کی سرمئی یکسانیت کو تکتی ہوئی، خوف میں مبتلا کہ کہیں اس کا اسٹاپ نہ نکل جائے۔ میں ایک بچے کی طرح، ملازم کی مانند نہیں، کچھ حدود کی خلاف ورزی کر سکتا تھا۔ از کار آتیں میاں بیوی میرے ساتھ بے حد فراخ دل تھے۔ میں نے کبھی ان کے گھر میں اجنبیت محسوس نہیں کی۔ میں ان کے باغ میں بچھی ہوئی میز پر اپنی کتابیں پھیلا کر اسکول کا کام کرتا، گنگناتے ہوے۔ کبھی ان کا بیٹا، سباستیئن اور میں بڑی جنگ کا انعقاد کرتے اور پلاسٹک کے ننھے ننھے سپاہیوں کے مورچے بنا کر کئی چھوٹی چھوٹی جنگیں لڑتے۔

میری ماں کو اس گھر کی ہر چیز پسند تھی۔ اس کا نظم وضبط۔ سنہری قالین کی دبیز تہہ۔ یہاں تک کہ اس کی کتابیں بھی پسند تھیں (گو کہ وہ ان کو پڑھ نہ سکتی تھی) کیونکہ کتابیں ترقی کی نشانی تھیں۔ اگر کبھی میں اسے باورچی میں تنگ کرتا تو وہ کہتی، ''جاؤ، کوئی کتاب اٹھاؤ جا کر۔ میں ابھی مصروف ہوں۔''

ایک دن میں اس کے ساتھ باورچی خانے میں بیٹھا تھا جب میں نے اس سے پوچھا کہ ہم لیما کیوں آئے تھے۔ اس آرام دہ باورچی خانے کی گرماہٹ میں مجھے علم تھا کہ 'یہ' اس سے بہتر تھا جو ہم چھوڑ آئے تھے۔ لیکن میری ماں جس طرح پاسکو کے بارے میں بات کرتی اس سے سننے والے کے ذہن میں ایک وسیع اور زرخیز وادی کا تصور ابھرتا، بجائے ایک مفلس اور پرتشدد قصبے کے جو واقعتاً وہ تھا۔ لیما سے اسے خوف آتا۔ وہ خود کو صرف دو جگہوں میں محفوظ تصور کرتی: ہمارا گھر اور از کار آتیں کا گھر۔

''ہمیں آنا ہی تھا، چینو، تمھارا باپ یہاں تھا۔'' وہ ایک کیک تیار کر رہی تھی اور ملغوبے کو لکڑی کے کفچے سے پھینٹ رہی تھی۔ ''کیا تمھیں پاسکو یاد آتا ہے؟''

مجھے اس کا جواب سوچنا نہ پڑا۔ ''نہیں،'' میں نے کہا۔ ''کیا تم کو یاد آتا ہے، ماں؟''

''بے شک۔''

''کیوں؟''

اس کا منھ اتر گیا۔ ''تمھارے نانی نانا وہاں ہیں۔ میں وہاں پلی بڑھی۔ چینو، تم ایسا سوال کیونکر کر سکتے ہو؟''

''معلوم نہیں۔'' کیونکہ واقعتاً مجھے علم نہ تھا۔ وہ میرے لیے رمز سے پر تھی، اس زندگی کو رومانوی

تصور دیتی ہوئی، اس زندگی کو جو ہم اپنے پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ ''وہاں سردی پڑتی ہے۔''

''اگر تم مجھ سے دور رہتے تو کیا تمھیں میری کمی محسوس نہ ہوتی؟''

''یقیناً ہوتی، ماں۔''

''میں بھی ایسا ہی محسوس کرتی ہوں۔''

''پاپا تو پاسکو کو یاد نہیں کرتے۔''

وہ مسکرائی تھی۔ بے شک یہ سچ تھا۔ لیما میرے باپ کے گھر کا پچھواڑا تھا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں وہ سب کچھ بن سکتا تھا جو ہمیشہ اس نے سوچا تھا۔ ''وہ مختلف ہے،'' ماں نے آخرکار کہا تھا، ''اور تم چینو، تم بالکل اپنے باپ کی طرح ہو۔''

میں ہرون میں بیٹھا لیما کو گزرتا دیکھتا رہا۔ یہ ٹریفک سے مبرا، پیدل چلنے والوں کے لیے ایک پٹا ہوا بازار تھا۔ بھنے مرغ کے اسٹال اور جلد کی گدائی کے آرائش کدے۔ چرائی ہوئی گھڑیوں اور جلی ہوئی سی ڈیوں کے کھوکھے۔ نو آبادیاتی عمارتوں پر چسپاں اشتہارات، گاہکوں اور دکانداروں کے درمیان ہوتے ہوئے سودوں کا شور، باتوں کا غل، فروخت کے لیے ڈالر، سکے ڈالنے پر چیزیں اگلتی مشینیں، گانا گاتے ہوئے اندھے موسیقار۔ سیاحوں کو تاکتے جیب کترے۔ شہر سانس لے رہا تھا۔ ایک پولیس والا عقبی دروازے کے سائے میں رشوت لیتا ہوا۔ ایک راہبہ نے میری قمیص پر ربن لگانے کی کوشش کی، خیرات بٹورنے کے چکر میں۔ میں نے ایک نرم مسکراہٹ سے اس سے پیچھا چھڑایا۔ پھر میں نے محسوس کیا کہ سڑک میں ایک برقی رو کی مانند ایک پیغام پھیل گیا۔ پلازا سان مارتن کی طرف سے پوری دنیا میری جانب دوڑتی ہوئی آئی اور مجھے پیچھے چھوڑ کر پلازا میئر کی طرف مڑ گئی۔ تمام ہرون میں آہنی گیٹ پُرشور آوازوں کے ساتھ بند ہوئے۔ دکانوں کے شٹر گرنے لگے، گاہکوں کو اندر لیے ہوئے۔ پولیس غائب ہوگئی۔ میرے تصور میں بدترین واقعہ آیا: شراب میں دھت سوکر کھیل کے تماش بین لوٹ مار کرتے ہوئے۔ میں سڑک کے کونے تک بھاگتا ہوا آیا اور دیکھا، لوگ اِدھر اُدھر منتشر ہو رہے تھے۔ ہرون خالی ہوگیا۔ اور پھر میں نے ایک عجیب ترین چیز دیکھی۔

بوٹ پالش کرنے والے پندرہ بچے!

بچے تین تین کی صف میں چل رہے تھے۔ لنڈا بازار کے کپڑوں میں ملبوس، پھٹے ہوئے فیتے والے جوتے اور ٹی شرٹیں پہنے ہوئے جن پر امریکی نعرے چھپے ہوئے تھے۔ کچھ بچے تو اتنے کم عمر تھے کہ وہ اپنے بوٹ پالش کے بکسوں کے پیچھے چھپ گئے تھے۔ ایک بچہ اپنا لکڑی کا بکسا کھینچتا ہوا لا رہا تھا، بکسا راہداری کے پتھروں پر لڑھکنیاں کھا رہا تھا۔ سب بچے لاغر اور دبلے پتلے تھے اور مسکرا رہے تھے۔ وہ میری طرف مارچ کرتے ہوئے آ رہے تھے اور ان کے آگے بانسوں پر چلتا ہوا ایک مسخرہ تھا جو قد میں بچوں سے دگنا تھا۔ پر وقار طریقے سے، آٹھ کے ہندسے بناتا ہوا، رقص کرتا ہوا، بازو کسی پرندے کے پروں کی طرح لہراتا ہوا۔

میں ششدر کھڑا مظاہرے کو گزرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ بچے سرگوشیوں میں اپنے مطالبات گنوا رہے تھے۔ اور پھر اضطراب دھیما ہوتا گیا۔ کیا یہ کوئی مشق تھی؟ کوئی مذاق تھا؟ دکاندار اور گاہک اپنی اپنی پناہ گاہوں سے نکلنا شروع ہوئے، سکون کا سانس لیتے ہوئے، سراسیمہ سے۔ لیما ان کے ساتھ پھر کوئی چال تو نہیں چل رہا؟

میں بارہ سال کا تھا جب مجھے علم ہوا کہ میرے باپ کا زاویہ کچھ اور تھا۔ وہ ترکیب کچھ یوں تھی: تم ایک نئے غسل خانے کا اضافہ کر دو۔ یا باورچی خانے کے فرش پہ ٹائلیں بچھا دو۔ یا سورکو یا لا مولینا کے کسی مکان کی تیسری منزل تعمیر کر ڈالو۔ موسیقی تیز آواز میں نہ بجاؤ۔ پیر صاف کرو اور نکلتے وقت پوری صفائی کر کے جاؤ۔ اور کام کے دوران اپنی آنکھوں سے اصل کام کرتے رہو۔ ٹیلی وژن؟ ہاں۔ اسٹیریو؟ ہے۔ کمپیوٹر؟ ہاں۔ زیورات؟ ہاں۔ بجلی کا کوئی بھی سامان بیچا جا سکتا ہے۔ باورچی خانے کے ساز و سامان، یہاں تک کہ دیوار پر ٹنگے گھڑیال بھی۔ بغیر تالے والی کھڑکیوں، کمزور دروازوں اور عقبی راہداریوں پر نظر رکھو۔ گھر کے افراد کے اوقاتِ کار کا ریکارڈ رکھو: شوہر کام پر کب جاتا ہے، بیوی بیوٹی پارلر میں کب ہوتی ہے، بچے اسکول سے کب واپس آتے ہیں، ملازمہ گھر میں اکیلی کس وقت ہوتی ہے۔

میرا باپ اور اس کا عملہ بہت ہوشیار تھا۔ وہ مہینوں یا برسوں انتظار کر سکتے تھے۔ کبھی کبھی محلے کا سکیورٹی گارڈ بھی اس میں شامل ہو جاتا، معمولی رقم کے عوض، اور بتاتا کہ خاندان شہر سے باہر کب جائے

گا۔ اور اکثر ملازمہ کو سب کچھ بھگتنا پڑتا ــــ خوف اور الزام۔

مجھے ایک شام یاد ہے جب وہ ہمارے گھر میں بیٹھے منصوبہ بنا رہے تھے۔ یا شاید کوئی جشن منا رہے تھے۔ وہ چھ تھے اور ان میں سے بعض کو میں اتنی اچھی طرح جانتا تھا کہ انھیں تم کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ وہ اکثر ہمارے گھر آیا کرتے۔ میرے باپ کے ساتھ شراب پیتے، اتوار کو سوکر بال کھیلتے۔ اس دن وہ ایک دوسرے سے جڑ کر بیٹھے، سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے اور قہقہے لگا رہے تھے۔ مجھے فرج سے بیئر کی بوتل لانے کو کہا گیا۔ میں نے اپنے باپ کو بیئر کی ٹھنڈی بوتل پکڑائی، اس کی طرف دیکھے بغیر، کیونکہ میں اس کے ساتھی فلپ کی بات سن رہا تھا۔ فلپ کہہ رہا تھا، میں نے سنا، ''میں تو ہمیشہ ملازمہ کی اچھی طرح ٹھکائی کرتا ہوں،'' فلپ نے فخر سے بتایا، ''ہمیشہ اس کی کوئی چیز توڑ دیتا ہوں، تاکہ گھر والے یہ نہ سمجھیں کہ ملازمہ کا اس میں ہاتھ تھا۔'' ہر ایک نے اس کج روفیاضی کی داد دی۔ میرے باپ نے بھی۔ مردوں کے دائرے کے کنارے پر کھڑے ہوئے میں نے تصور میں اپنی ماں کو فرش پر گرتا ہوا دیکھا۔

وِیا کورتا اپنا فیچر مانگ رہا تھا۔ میں اس سے بچتا پھر رہا تھا۔ حکومت نہیں گری تھی اور مظاہرے جاری تھے۔ بے روزگار مل مزدوروں کے ایک گروہ نے ٹائر جلائے تھے اور ال اگستینو میں لوٹ مار مچائی تھی۔ افواہیں گردش میں تھیں کہ صدر اپنے دورے سے واپس نہیں لوٹے گا۔ میں اس کہانی کے زور پکڑنے سے امید لگائے بیٹھا تھا تاکہ مسخروں پر میرا مضمون اگلے اتوار کو بھی اخبار میں جگہ نہ پاسکے۔ ایک ہفتہ اور مجھے مل جاتا تو اچھا ہوتا۔

میں کام کرتا، سوتا اور کام کرتا۔ اور کم سے کم سوچنے کی کوشش کرتا، اپنے باپ کے بارے میں، اپنی ماں کے بارے میں، کارمیلا کے بارے میں۔ میں مسخروں کے بارے میں سوچا کرتا۔ کتنی غیر متوقع بات تھی: میں سوچتا کہ وہ میرے لیے ایک پناہ گاہ بن گئے ہیں۔ میں انھیں ہر جگہ پاتا۔ انھوں نے شہر کو میرے لیے منظم کر دیا تھا: بسیں، سڑکیں، نکڑ، کونے، شاپنگ پلازا۔ وہ میرے موڈ سے ہم آہنگ تھے۔ لغویت کو اپنا کر، شرمندگی کو ہم آغوش کر کے، انھوں نے اس کی ماہیت تبدیل کر دی تھی۔ مجھ پر ہنسو، مجھے ذلیل کرو۔ تمھارا ایسا کرنا ہی میری جیت ہے۔

لیما، دراصل، اپنی روح میں، مسخروں کا شہر ہے۔

فروری کی گرمی نے شہر کو مرجھا دیا تھا۔ رات کے اندھیرے میں، بلکہ شاموں کی دھندلاہٹ میں بھی، میں سیڑھیاں اتر کر شراب خانے سے پرے نہ جا پاتا۔ چھتوں میں لگے پنکھے گھومتے اور اُمس میں ہلچل سی مچاتے۔ میں درجنوں گفتگوؤں کی بھن بھن، گلاسوں کی جھنکار اور عقبی کمرے میں پرجوش تالیوں کا شور سنتا۔ یہ آوازیں میری تنہائی کو کم کرتی تھیں۔

ایک رات، ایک مسخرہ کاؤنٹر پر میرے برابر کھڑا تھا۔ میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ سان فرانسسکو کے سامنے ان بچوں کے لیے کام کرتا تھا جو اسکول سے مطالعاتی دورے پر وہاں لائے جاتے تھے۔ میں اس کا سرخ اور نارنجی دھاریوں والا سوٹ پہچانتا تھا۔ عام طور پر اس کا ایک ساتھی بھی ہوتا تھا لیکن اس وقت وہ اکیلا تھا، تھکا ہوا۔ اس کا مخصوص لباس آدھا اتر چکا تھا۔ وہ گھر جا رہا تھا۔ شاید میری طرح اس کو نیند لانے کے لیے شراب کا ایک گلاس درکار تھا۔ مجھے اس کو جانے دینا چاہیے تھا لیکن اس سے پیشتر کہ میں ایسا سوچتا، میرے منھ سے نکل گیا، ''تم مسخرے ہو۔''

اس نے میری طرف رخ کیا، خلفشاری سے، اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا، ''تم یہ مجھ سے پوچھ رہے ہو یا مجھے بتا رہے ہو؟''

''میں پوچھ رہا ہوں، دوست۔''

''اور تم ہوتے کون ہو سالے؟'' اس کی پیشانی پر پڑی لکیریں مسخرے کی لکیریں نہ لگتی تھیں، وہ ایسی تھیں جن کو دیکھ کر بچہ خوفزدہ ہو جائے۔ اس کے دہن کے کونوں کی جھریوں پر سفید رنگ چڑھا ہوا تھا۔

''آسکر یورائب،'' میں نے کہا۔ ''میں ال کلارین اخبار کے لیے لکھتا ہوں۔''

''اخبار؟'' وہ مجھ سے منھ موڑ کر کاؤنٹر پر شراب کے گلاس کا آرڈر دینے لگا۔ میں نے ایک میز کے ساتھ دو کرسیاں کھینچیں اور اپنی خریدی ہوئی سرخ شراب کی بوتل میز پر لے گیا۔

''ماسٹر،'' میں نے بیرے کو آواز دی۔ ''ایک اور گلاس لاؤ۔'' بیرے نے مجھے حیرت سے دیکھا۔ میں نے مسخرے کی طرف نظر ڈالی اور اس کو خالی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس نے کندھے اچکائے اور بیٹھ گیا۔

اس کا نام تونیو تھا، اس نے بتایا، اور یہ کہ اس کے پاس پوری رات نہیں تھی مجھ سے گپیں مارنے کے لیے۔

لیکن میں شراب منگاتا رہا۔ میں نے اسے اپنی ماں کے بارے میں بتایا۔ اپنے باپ کے بارے میں بتایا۔ پاسکو اور سان حوان کے قصے سنائے۔ وہ سنتا رہا اور پیتا رہا۔ پھر اس نے مجھے اپنے قصبے کے بارے میں بتایا جہاں وہ پیدا ہوا تھا، شمال میں، اور یہ کہ جب وہ لیما آیا تھا اس کے پاس پھوٹی کوڑی تک نہ تھی۔ کچھ عرصہ وہ سانتا روزا پُل کے نیچے رہا۔ اور مسخرہ پن؟

''میرے بھائی، یہ کام ہے، مشقت ہے۔ کچھ کاموں سے بہتر اور کچھ کاموں سے بدتر،'' اس نے کہا۔ ''مجھے کچھ اور آتا نہیں ہے۔ چوری یا پھر مسخرہ گیری۔''

''آمین،'' میں نے کہا۔

اس نے مجھے بتایا، پیسے کمانے کے لیے کسی اور کا روپ بدلنا اسے بہت اچھا لگتا ہے۔ کسی صاف ستھرے دن، جب آسمان چمکیلا ہو، اسے سڑک پر نکلنا اچھا لگتا ہے۔ اس نے کہا، بچوں کے چہرے دلکش ہوتے ہیں اور انھیں خوش دیکھ کر اس کا دل جذبے سے بھر آتا ہے۔ اس کو شکایت تھی کہ اسے بسوں میں ٹافیاں بیچتے ہوئے ہر دوسرے بے روزگار شخص سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔

''کیا اس کمائی سے تمھارے بل ادا ہو جاتے ہیں؟''

''مجھے زیادہ نہیں چاہیے ہوتا۔ نہ بیوی ہے نہ بچے۔''

''تم اس کام میں کیسے آئے؟''

وہ مسکرایا، اتنے غیر متوقع طور پر کہ مجھے لگا کہ وہ میری بات غلط سمجھا ہے۔ وہ ایک دلکش مسکراہٹ تھی، حقیقی مسخروں والی۔ اس نے انگوٹھے سے اپنے چہرے کی جھریوں میں دبے رنگ کو مسل کر پھیلایا۔ ''نہیں، اجنبی،'' اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا، ''یہ کچھ اس طرح ہوتا ہے: تم ایک صبح اٹھتے ہو اور... بوم! تم خود کو ایک مسخرہ پاتے ہو۔''

سینور انجینئر دون ہیوبرٹ ازکاراتیں نے دروازہ کھولا۔ اس نے میرے باپ سے ہاتھ ملایا، مجھے تھپکی دی اور ہمیں اندر آنے کو کہا۔ میں نے اپنے جوتے تین دفعہ دبیز پائیدان پر صاف کیے۔ اپنے

باپ کے برخلاف، میں وہاں کئی دفعہ آچکا تھا۔ وہ میری ہر حرکت کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہاں تین زینے تھے اور آخری سیڑھی پر کمرہ ایک وسیع وعریض، ہوادار اور روشن جگہ کھلتا تھا۔ ایک صوفہ اور چمڑے کی آرام کرسی لکڑی کی میز کے قریب رکھی تھی۔ دیواروں پر بنے ہوئے شیلف کتابوں سے بھرے ہوئے تھے۔ کھڑکی باغ میں کھلتی تھی جہاں پیڑ، گھاس اور پھول نرم رنگوں میں کھل رہے تھے۔

''ماری،'' سینور ازکاراتیس نے آواز دی۔ ''تمھارا شوہر آیا ہے، چینو کے ساتھ!''

میری ماں باورچی خانے سے نمودار ہوئی۔ وہ ہمیں غیرمتوقع طور پر وہاں پاکر حیران تھی۔ اس کا ملازمہ والا لباس بے داغ سفید تھا۔ اس نے ہم دونوں کو چوما اور کچھ پریشان ہوکر پوچھا، ''تم لوگ یہاں کیا کررہے ہو؟''

سینور ازکاراتیس اپنی آرام دہ کرسی پر بیٹھ چکے تھے اور اب ہم تینوں کو رئیسانہ، مخیّر نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ ''ماری، تم فکر نہ کرو۔ تمھارا شوہر مجھ سے کچھ بات کرنا چاہتا ہے۔ کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔''

''تم باورچی خانے میں واپس جاؤ،'' میرے باپ نے ماں سے کہا، ''ہم جاتے وقت تمھیں خداحافظ کہنے آئیں گے۔''

میرا باپ بیٹھ گیا۔ اس نے سینور انجینئرَ اور ازکاراتیس خاندان کی مہربانیوں کو گنواتے ہوئے بات شروع کی — ان کی فیاضی، ان کا اخلاص، اور ان کا ہمدردانہ فہم وادراک۔ ''زندگی یوں تو کبھی آسان نہیں رہی، لیکن میں ماری کو ہر روز یاد دلاتا ہوں کہ اس دن خدا ہم پر کتنا مہربان تھا جب اسے یہاں ملازمت ملی۔''

میں نے اس سے پہلے اپنے باپ کو خدا کا ذکر کرتے نہ سنا تھا، سوائے موسم کے بارے میں رائے دیتے وقت۔

سینور ازکاراتیس نے سر ہلایا۔ ہاں، ہاں، ہاں۔ وہ میرے باپ کے تشکر سے لطف اندوز ہورہا تھا۔ وہ ایک دبلا پتلا آدمی تھا جس کی ہلکی نیلی آنکھیں اس کی پیشانی سے اوپر اڑتے ہوئے بالوں کی وجہ سے مزید نمایاں ہوگئی تھیں۔ وہ آنکھیں میچ کر دیکھتا گویا کسی دوسری سمت نکل رہا ہو اور اسے خطرہ ہو کہ ہم اس کی نظروں سے اوجھل ہوجائیں گے۔ ''پلیز، پلیز، ہیوگو، بولتے رہو۔''

''سینور، چینو کے نئے اسکول میں ہر ایک کے پاس پیسے ہوں گے۔'' میرا ایک پرائیویٹ اسکول میں داخلہ ہو چکا تھا جہاں وظیفہ دلانے میں ازکاراتیں نے مدد کی تھی۔

''کیا تمھیں اس کی فیس کی طرف سے پریشانی ہے؟'' سینور ازکاراتیں نے پوچھا۔ ''میں نے ماری کو بتا دیا تھا کہ تمام چیزیں وظیفے میں شامل ہیں سوائے یونیفارم کے۔''

''نہیں نہیں، یہ بات نہیں ہے۔'' میرے باپ مناسب الفاظ سوچنے لگا۔ ''آپ کو معلوم ہے سینور، کہ میں ایک مستری ہوں۔ میں تقریباً ہر روز کام کرتا ہوں۔ مجھے کہنا چاہیے کہ میں ہر روز کام کر سکتا ہوں...'' اس نے اپنا بازو میرے گلے میں ڈالا۔ ''ہمیں چینو پر فخر ہے۔ مجھے ہمیشہ سے علم تھا کہ یہ ذہین بچہ ہے۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ ہمیں ہر چیز کے لیے کتنی تگ و دو کرنی پڑتی ہے۔ اور کام بھی ہمیشہ نہیں ملتا۔ اصل مسئلہ تو یہی ہے۔ مجھے شرمندگی ہوتی ہے آپ سے کچھ کہتے ہوئے۔ اتنا کچھ آپ ہم لوگوں کے لیے پہلے ہی کر چکے ہیں۔''

''نہیں نہیں، کہو کہو، پلیز، ہیوگو،'' سینور ازکاراتیں میرے باپ کی طرف جھک کر بولا۔ میرے باپ کی خاموشی سوچی سمجھی تھی۔ ''ماری سول کب سے ہمارے ساتھ کام کر رہی ہے؟'' ازکاراتیں نے پوچھا۔ ''میں بتاتا ہوں۔ اتنے عرصے سے کہ اب وہ اس خاندان کا حصہ بن چکی ہے۔'' وہ مسکرایا، اور پھر مجھ سے مخاطب ہوا، اس طرح سے گویا کہ وہ کسی پانچ سالہ بچے سے بات کر رہا ہو۔ ''چینو ہمارے خاندان کا حصہ ہے۔ چینو، تمھیں معلوم ہے نا؟ اور تمھارا باپ بھی اسی خاندان کا حصہ ہے۔''

میں نے گھبراتے ہوئے سر ہلایا۔ آخر کار میرا باپ گویا ہوا، اور اس دفعہ اس نے اصل مقصد بیان کیا۔ ''میں یہ امید کر رہا تھا کہ اگر ایسا ممکن ہو کہ آپ چینو کے نئے اسکول میں بتا دیں کہ اگر کسی کو اپنے مکان میں کچھ کام کرانا ہے تو...''

''اس بارے میں میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔''

''نہیں، لیکن، اگر وہ ایسا کرنے جا رہے ہوں تو کیا آپ میرا نام لے سکتے ہیں ان کے سامنے، میرے کام کے لیے؟''

یہ دون ہیوبرٹ ازکاراتیں کی پسندیدہ عنایت تھی، ایسی عنایت جو وہ بآسانی کر سکتا تھا۔ ایسی مراعات جو اس کے ''مخیر'' کردار کی توثیق کرتی تھی۔ وہ ایک اچھا آدمی تھا— واقعتاً۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ

یہ کام کردے گا۔ میرا باپ خوشی سے مسکرایا۔ ''سینوراز کاراتمیں کا شکریہ ادا کرو چینو،'' اس نے مجھ سے کہا۔ میں نے انجینئر کا اُبھری ہوئی رگوں والا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھاما۔ پھر دونوں آدمی بغل گیر ہوے۔ ''آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ میرے لیے اس عنایت کی کیا اہمیت ہے۔''

میں تمام زندگی چینو رہا ہوں ــــ پاسکو میں، لیما میں، گھر میں، محلے میں ــــ اسی طرح جیسے کچھ لوگ چھاتو یا چولو یا نیگرو ہیں۔ میں یہ لفظ سنتا ہوں اور متوجہ ہو جاتا ہوں۔ میرے ہم نام ہزاروں ہیں، یا شاید لاکھوں۔ کوئی اور عرفیت شاید اس سے زیادہ عامیانہ نہ ہوگی۔ یہاں سوکر کے کھلاڑی اور گلوکار ہیں جو چینو کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ ہمارا ایک بدمعاش صدر زندگی بھر اور مرنے کے بعد 'سالا چینو' کہلایا۔ پھر بھی یہی میرا نام ہے اور ہمیشہ سے تھا، اور اس وقت تک رہا جب تک میں نے پیروانو بریتانکو میں داخلہ نہ لیا۔ وہاں مجھے 'پرانہا' کہہ کر بلایا گیا۔

اس وقت تک 'پرانہا' خاصے سرگرم ہو چکے تھے جب میں نے لیما میں ہائی اسکول شروع کیا۔ حکام نے تفتیش کا حکم دے دیا تھا اور پولیس چھاپے مار رہی تھی۔ اخبار میں خبریں اور کھلبلی مچانے والی تصویریں چھپ رہی تھیں۔ شہر خطرے کے دہانے پر پہنچ چکا تھا۔ پندرہ بیس کے جتھوں میں وہ گاڑی پر ہلہ بولتے اور سرعت اور بے رحمی کے ساتھ گاڑی کو ننگا کر دیتے: ہب کیپ، شیشے، بتیاں۔ رینگتا ہوا یہ جتھا شکار کو روکے رکھتا۔ گاڑی کا مالک، بے بس اور لاچار، پریشانی کے عالم میں ہارن بجاتا رہتا۔ شاید اس بات کا اسے ادراک رہتا تھا کہ عقل مندی کا تقاضا یہی ہے کہ کچھ نہ کیا جائے اور انتظار کیا جائے کہ وہ اپنا کام ختم کر کے چلتے بنیں۔ زیادہ جارح جتھا کھڑکی کے شیشے توڑنے لگتا، بریف کیس، موبائل فون، گھڑیاں، دھوپ کے چشمے، ریڈیو، سب کچھ اٹھا لے جاتا۔ 'مکمل سروس!' لوگ زہرخند سے کہتے۔ 'جرم کی ایک نئی قسم،' ماہر سماجیات کہتے۔ اور اصطلاحات کا کاروبار کرنے والے کسی زیرک مبصر نے ان کو 'پرانہا' یعنی گوشت خور مچھلی کا نام دیا تھا۔

صبح کے وقت اسکول میں رول کال کے لیے میری کلاس اسکول کے میدان میں قطار بنائے کھڑی تھی۔ میری جگہ آخری صفوں میں تھی، یورائب، سب سے پیچھے۔ یوگاز مجھ سے آگے اور میرے پیچھے ویتوسلا۔ میرا یونیفارم صاف ستھرا اور استری شدہ تھا، اور دور سے میں دوسرے بچوں کی طرح نظر

آتا تھا۔ ہمارے ٹیچر نے ہمیں اندر جانے کے لیے کہا اور ہم اپنے نئے کلاس روم میں مارچ کرتے ہوے گئے۔ میرے کلاس کے ساتھیوں نے مجھے وقفے میں آ گھیرا۔ ''اوئے، تم کھیلتے ہو؟'' بچے کے ہاتھ میں سوکر گیند تھی۔ اس نے گیند میری طرف پھینکی۔ میں نے واپس اچھالی، بہت عمدہ طریقے سے۔ اور اپنا تعارف کرایا: ''آسکر عرف چینو۔'' ''سیزر،'' اس نے جواباً کہا۔ ہم نے ایک ٹیم بنائی۔ ہم کھیلے۔ ہم نے گول کیے۔ انھوں نے بھی گول بنائے۔ ہم کھیل کے دوران چیخ چلا رہے تھے، گالیاں دے رہے تھے، پسینہ بہا رہے تھے۔ جب میں نے مخالف ٹیم کے ایک بچے سے گیند حاصل کی، اس نے فاؤل کا اعلان کیا اور زمین پر گر گیا۔ اپنے پیر پکڑ کر درد سے چلانے کی نقل کرنے لگا۔ سان حوان میں میں اس کو pussy کہہ دیتا اور بس۔ لیکن وہ چلا رہا تھا، ''اوئے، اوئے!'' اور ہم رک گئے۔ ''یہ فاؤل ہوا ہے،'' اس نے ماتھے پر لکیریں ڈالتے ہوے کہا۔ ''تم آخر ہو کہاں کے؟''

مجھے جواب دینے کی ضرورت نہ تھی لیکن میں نے جواب دیا۔ میں شہر میں کسی بھی جگہ کا نام لے سکتا تھا لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ ''سان حوان دی لوری گانچو،'' میں نے کہا۔

بے شک، ان کو پتا چلنا ہی تھا کہ میں کہاں سے آیا ہوں۔ انھوں نے مجھے ایوینیڈا اری کیپا سڑک کی طرف جاتے ہوے تو دیکھا ہی تھا جہاں میں گھر کے لیے بس پکڑتا تھا۔ ان کو معلوم ہونا ہی تھا کہ میں لا مولینا یا سور کو میں نہیں رہتا ہوں۔ لیکن اگر انھیں اس تفصیل کا پہلے دن علم نہ ہوتا، اگر وہ مجھے پہلے بہتر طریقے سے جان پاتے، تو شاید مجھے میرے محلے کی مجرمانہ شہرت سے وابستہ نہ کرتے۔

''سان حوان؟'' اس نے کہا اور ایک ظالمانہ مسکراہٹ اس کے چہرے پر کھل گئی۔ ''اوہ... ہیلا پرانہا!''

اگلی صبح ساڑھے آٹھ بجے میں تونیو سے سان فرانسسکو کے سامنے ملا۔ وہ مسخروں کے لباس اور میک اپ میں تھا۔ میں اب تک نیند کو جھٹکنے کی کوشش میں تھا اور آتشی شراب سے پیدا کردہ سر درد کو بھی۔ اس نے اپنے ساتھی سے میرا تعارف کرایا۔ وہ ایک زرد چہرے والا مسخرہ جان تھا۔

''تم رپورٹر ہو؟'' اس نے شک بھرے لہجے میں پوچھا۔

''اس کے ساتھ اچھی طرح پیش آنا،'' تونیو نے اس سے کہا۔

اس نے پولکا ڈیزائن والا ایک بڑے سائز کا سوٹ کندھے پر لٹکے جھولے سے کھینچ نکالا۔ سفید زمین میں سبز گولے۔ کوڑے کے تھیلے سے ملتا جلتا وہ لباس مجھے پورا بیٹھتا تھا۔ تو نیو نے کہا، لباس زبردست لگ رہا ہے۔ جان نے اتفاق کیا۔ پھر مجھے سبز رنگ کے جوتے دیے گئے جو میں نے اپنے پیروں میں گھسائے۔ جوتے میرے کلائی سے دگنے لمبے تھے۔ پھر تو نیو نے مجھے ایک آئینہ پکڑایا اور تین چھوٹے چھوٹے رنگوں کے کنستر۔ ''تم یہ سنبھالو،'' اس نے ایک پتلا برش تھماتے ہوئے کہا۔

مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں اپنے آپ کو اپنی ذات سے باہر نکال آیا ہوں۔ پچھلی رات کی گفتگو اتنی دھندلی اور شراب میں ڈوبی ہوئی تھی کہ میں یاد کر ہی نہ سکا کہ میں آج صبح یہاں کیونکر پہنچا اور میں نے کیا وعدہ کیا تھا۔ آئینے میں میں نے اپنی ماہیت کو تبدیل ہوتے ہوئے دیکھا۔ میں نے اپنے گالوں پر سرخ دائرے بنائے۔ جان نے ایک ناک مجھے دی۔ یہ ایک سرخ، بڑی سی، پنگ پانگ کی گیند تھی جس کو نصف کاٹ کر سرے پر ربر بینڈ سے باندھا گیا تھا۔ سب سے آخر میں تو نیو نے اپنے تھیلے کے پیندے سے ایک جوکر کا پرانا ہیٹ نکالا جس کے رنگ پھیکے پڑ چکے تھے اور جس کے نوکیلے کنارے میرے چہرے پر لٹک کر گر رہے تھے۔ اسی سے کام چلانا تھا۔

شہر میں گھومتے ہوئے تین مسخروں میں سے ایک تہائی، میں، حیران تھا کہ میں کتنا پر سکون ہوں اور سب کی نظروں سے کتنا اوجھل۔ تم سوچتے ہو گے تمام دنیا کی نظریں ہم پر مرکوز ہوں گی، ہمارے بھڑکیلے لباس پر، ہماری مصنوعی پُتی ہوئی مسکراہٹ پر۔ لیکن زیادہ تر لوگ ہمیں نظر انداز کر رہے تھے، لمحہ بھر کے لیے بھی ایک نظر ڈالے بغیر وہ چلے جا رہے تھے۔ صرف بچے تھے جو ہمیں دیکھ کر مسکراتے، ہماری طرف اشارہ کرتے یا کبھی ہمیں دیکھ کر ہاتھ ہلاتے۔ جان اور تو نیو سوکر میچ کی باتیں کر رہے تھے۔ میں دیکھ اور سن رہا تھا، جاگتے ہوئے خواب کے اندر۔

ہم نے چند بسیں گزر جانے دیں کیونکہ وہ خالی تھیں۔ ''دن کے آغاز پر یہ منحوس شگون ہے،'' تو نیو نے مجھے بتایا۔ آخر کار اس نے ہمیں ایک بھری ہوئی بس میں چڑھنے کا اشارہ کیا۔ ہم کنڈکٹر کو دھکیلتے ہوئے آگے نکل آئے۔ اچانک ہم اسٹیج پر تھے، تمام آنکھیں ہم پر تھیں۔ ''خواتین و حضرات،'' ہم قطار میں ایک دوسرے کے پیچھے کھڑے تھے۔ تو نیو وسط میں تھا، بس کے انجن کے پھٹپھٹاتے شور سے بلند آواز میں کہہ رہا تھا، ''میں یہاں آپ لوگوں سے خیرات نہیں مانگ رہا ہوں۔ در حقیقت میں ایک امیر

آدمی ہوں! یہ بس میری ہے! یہ ڈرائیور میرا ہے اور یہ... ''تونیو چلایا، کنڈکٹر کی طرف اشارہ کر کے، جو بس کے دروازے سے آدھا باہر لٹکا ہوا جھول رہا تھا''یہ میری بھاگوان شے ہے!''

جان کورس میں تونیو کی ہر بات دہرا رہا تھا، روبین بلیڈز کے گانے میں کسی شرابی کے بندھے ٹکے انداز میں۔ وہ لڑکھڑانے کی اداکاری کر رہا تھا اور تونیو جھینپے ہوئے انداز اپنے پیے ہوئے ساتھی کے رویے کی معافی مانگ رہا تھا جس نے گزشتہ رات ''سان بورخا میں ایک نئے تین منزلہ مکان کو خریدنے کا جشن منایا تھا۔''

میں نے خود کو بے کار محسوس کیا: اپنی احمقانہ مسخری مسکراہٹ دکھائی اور انگلیوں کو سینے پر بجایا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے چہرے کا روغن خشک ہو کر ایک تکلیف دہ تہہ میں تبدیل ہو رہا تھا اور میرے چہرے کے عضلات غیر فطری طور پر اکڑ گئے تھے۔ میں حواس باختہ تھا، تقریباً بحرزدگی میں مبتلا سا۔ بس تیز رفتاری سے شاہراہ پر دوڑ رہی تھی۔ تونیو اب اپنی تقریر ختم کر رہا تھا: ''میرا مسکین ساتھی — خدا اس گونگے بہرے کو اپنی حفاظت میں رکھے — آپ کی سیٹوں کے پاس سے گزر کر آپ کا کرایہ اکٹھا کرے گا۔'' وہ کورنش بجالانے کے انداز میں جھکا اور پھر میری طرف اشارہ کیا۔

ہم کچھ نہیں بیچ رہے تھے۔ یہ ایک دلیر دھوکا تھا جو تونیو نے پیسے بچانے کے لیے کیا تھا۔ وہ ہماری بس تھی۔ میں سیٹوں کے درمیان چلتا ہوا ہر ایک سے کرایہ وصول کرنے لگا۔ ''کرایہ، کرایہ، جناب!'' میں کنڈکٹر کے لہجے میں بدبدایا۔ کچھ مسافر جو نیند کے جھونکے لے رہے تھے، بغیر سوچے سمجھے میرے ہاتھ میں سکے ڈالتے گئے۔ کچھ نے ریزگاری ڈالی، چند ایک نے میرا شکریہ تک ادا کیا، ان میں وہ عورتیں اور مرد بھی شامل تھے جنھوں نے ہمارا تماشا دیکھا تھا، اور مسکرائے بھی تھے۔

میں نے کل سوا چار سول رقم جمع کی تھی۔ بس رک گئی۔ ''خواتین وحضرات، صبح بخیر!'' تونیو چلایا، ہم بس سے اتر کر صبح کے اجالے میں نکل آئے۔ اس تمام قصے میں پانچ منٹ لگے تھے۔

میں نے ٹیلی فون کے لیے سکہ ڈالا اور ایلیزا کا نمبر گھمایا۔ سہ پہر ابھی شروع ہوئی تھی۔ تونیو اور جان سڑک کی دوسری طرف کیفے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ ہم لوگ شہر کے مرکز میں واپس لوٹ آئے تھے۔ ہمیں بسوں سے دھکے دے کر اتارا گیا، سکے ہماری طرف کھینچ کر پھینکے گئے اور ہم پر تھوکا

گیا۔ لیکن ہم نے پیسے بنا لیے تھے۔ اچھا دن تھا، تونیو نے مجھے تسلی دی، گزشتہ دنوں کے مقابلے میں بہتر دن۔ وہ دونوں مطمئن نظر آرہے تھے۔

سان حوان میں فون کی گھنٹی بجے جا رہی تھی۔ اور پھر اس نے فون اٹھایا اور پوچھا کہ میں کیسا ہوں۔

میں نے بھری سڑک پر نظر ڈالی۔ لوگ گھروں کو، یا کاموں کی طرف رواں دواں تھے، اپنی اپنی زندگیوں میں گم۔ ''میں دفتر میں ہوں آنٹی۔ زیادہ دیر بات نہیں کر سکتا۔'' میں نے اس سے پوچھا آیا اس نے میری ماں کو دیکھا ہے۔

''میں نے اسے تدفین کے وقت دیکھا تھا۔ تم کیوں نہیں آئے تھے؟''

''مجھے کام تھا۔ میں نہیں آسکتا تھا۔ کیا وہ کچھ کہہ رہی تھی؟''

''چینو، وہ تمھیں یاد کر رہی تھی۔ وہ تمھاری کمی محسوس کرتی ہے،'' میں نے فون کے دوسرے سرے پر ایلیزا کو کہتے سنا۔ ''وہ کہہ رہی تھی کارمیلا بھی ٹھیک ہے اور یہ کہ شاید وہ گھر بیچ ڈالے۔''

میں خاموش رہا۔

''چینو، تم ہولائن پر؟''

''ہاں ہاں، ہوں۔''

''کیا تم اس سے ملنے جا رہے ہو؟''

تونیو اور جان جمع کی ہوئی ریزگاری سے بل چکا رہے تھے اور مزید گرم پانی کے لیے بیرے سے کہہ رہے تھے۔ انھوں نے دس سینٹ کے سکوں کی شکل میں جمع شدہ پیسے گنے۔ ویٹرس نے مسکراہٹ دبانے کی کوشش کی۔ جان نے کاؤنٹر پر جھک کر ایک پپی ہوا میں اڑائی۔ وہ کتنے دلکش مسخرے تھے۔

''شکریہ، آنٹی''، میں نے کہا اور فون رکھ دیا۔

میری نئی عرفیت نے مجھے خطرناک بنا دیا تھا اور اس عرفیت میں مجھے سمو لیا تھا۔ میں ایک مذاق تھا۔ جھونپڑپٹی میں رہنے والا ایک خبطی بچہ۔ کمزور و لاغر۔ حتیٰ کہ اگر میں اچھا کھیلتا یا تیز بھاگتا تب بھی وہ سب میرا مذاق اڑاتے، مجھ پر پھبتیاں کستے۔ سان حوان میں ہم مذاق کرتے کہ میں کسی طرح ان سب

کی پٹائی کروں گا لیکن حقیقت کچھ اور تھی۔ وہ اپنی طاقت کا اظہار لاپروائی سے کرتے، غیر شعوری طور پر۔ وہ مجھے ایک فقرے یا محض خاموشی سے کاٹ ڈالتے تھے۔

''اب وقت آ گیا ہے کہ تم کام سے لگ جاؤ'' میرے باپ نے اعلان کیا۔ وہ میرا دوسرا سال تھا، پیروآنو بریتانکو میں۔ میں چودہ سال کا ہو چلا تھا۔ ایک سال کے عرصے میں مجھے آج تک کلاس کے کسی ساتھی نے اپنے گھر مدعو نہ کیا تھا۔ روزانہ میں سان حوان سے سان امیدرو تک خاموشی سے بس میں سفر کر کے پہنچتا۔

میں نے اپنے باپ کے پیشے کے بارے میں کافی سوچا تھا، اسے اخلاقیات اور قانون کی روشنی میں جانچا تھا۔ وہ کام غلط تھا، یقیناً۔ لیکن جب اس نے کہا کہ وقت آ گیا ہے کہ میں کام سے لگوں، میرے دماغ نے سال بھر کی بکھری ہوئی ہتک اور بے عزتی کو جوڑ کر یکجا کر دیا۔ میں نے ان ذلتوں کو یاد کیا اور تصور کیا کہ کتنا لطف آئے گا جب میں ان لڑکوں میں سے کسی کے گھر جاؤں گا، مسکرا کر ہاتھ ملاؤں گا، وہاں کام کروں گا اور پھر چوری کروں گا۔ مجھے اپنا باپ سمجھ میں آنے لگا — یا میں نے سوچا کہ میں اسے سمجھنے لگا ہوں — لیکن میں یقین کرنا چاہتا تھا۔

''میں کام کرنا چاہتا ہوں،'' میں نے کہا۔

''یقیناً۔ ہر مرد کام پر لگنا چاہتا ہے۔''

''پاپا، کیا ہم اس گھر میں گھس کر چوری کریں گے؟''

وہ بیٹھ گیا۔ اس کے ماتھے پر بل پڑے ہوئے تھے۔ اس نے مجھے غلط سمجھا۔ ''کیا لوگ باتیں بناتے ہیں؟''

میں نے سر ہلایا۔

''اور تم کیا سوچتے ہو لوگوں کی باتوں کے بارے میں؟''

مجھے ایسا محسوس ہوا کہ وہ اس انتظار میں ہے کہ میں اس کی ہاں میں ہاں ملاؤں اور وہ مسکرا دے۔

''مجھے لوگوں کی باتوں پر یقین ہے۔''

''اچھا، چینو...'' اس نے کہا اور چپ ہو گیا۔

میں اپنے الفاظ واپس لینا چاہتا تھا، میں کہنا چاہتا تھا، ''لوگ جو کچھ کہتے ہیں مجھے اس پر یقین ہے، لیکن مجھے اس کی کوئی پروا نہیں۔'' میں اس کو بتانا چاہتا تھا کہ وہ بد بخت امیر زادے، اگر انھیں یہ بات پسند نہیں، خدا سے شکوہ کر سکتے ہیں، اور میامی جا کر امریکی شہریت اختیار کر سکتے ہیں۔ اور یہ کہ اگر وہ مجھے 'پرانہا' پکارنا چاہتے ہیں تو بہتر ہی ہے کہ سالے بدمعاش اس بات کے لیے تیار ہوں کہ میں ان کے گھر میں داخل ہوں اور ان کے خزانوں کو اپنی ملکیت بنالوں۔

اس نے اپنے بالوں میں انگلی پھیری۔ اس کی بڑی سیاہ آنکھیں ایک دوسرے کے قریب گتھی ہوئی تھیں، اس کا دہانہ مضحکہ خیز حد تک چھوٹا تھا۔ لیکن اس کی رخساروں تک پھیلی ہوئی مسکراہٹ اس کے بکھرے ہوئے نقوش کو ہموار کر دیتی تھی۔ وہ اپنے سیاہ بالوں کو ہمیشہ احتیاط کے ساتھ کنگھی سے سنوارے رکھتا تھا۔ جب وہ سکون سے بیٹھا ہوتا تو وہ کسی انڈین کی مضحکہ خیز شبیہ لگتا۔ قہقہہ لگاتے ہوئے وہ دوغلی نسل کا کلارک گیبل دکھائی دیتا۔ اس لیے وہ مسکراتا اور قہقہے لگاتا، اور اس خاصیت کو اس نے اپنی شخصیت کا محور بنا رکھا تھا۔ اب وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ رہا تھا۔ اپنے بیٹے کی آنکھوں میں، میرا خیال تھا اپنے اکلوتے بیٹے کی۔ ''چینو، ہم مرد ہیں جو روزی کماتے ہیں۔ تم اور میں، ہم دونوں۔ شہر میں عجیب وغریب چیزیں ہوتی ہیں۔'' اس نے اپنی انگلیاں چٹخائیں، مجھے گلے سے لگایا۔ ''ٹھیک ہے نا؟''

گھر کی مالکہ کو رنگوں کا سلیقہ تھا۔ اس نے گھر خود سجایا تھا، اس نے ہمیں بتایا اور شہر کے نواح میں واقع اپنا محل نما وسیع وعریض بنگلہ دکھایا۔ مجھے، میرے باپ اور فلپ کو۔ اپنی کی ہوئی جدت طرازیوں اور خوشنما نمونوں کی نشاندہی کرتے ہوئے۔ ایک دیوار انھوں نے گرادی تھی اور شہتیر کو رنگوادیا تھا۔ ''دیکھو، اس سے کمرے میں کتنی وسعت آ گئی ہے! اس جگہ کو نئی جہت مل گئی ہے۔ ہے نا؟'' اس نے پوچھا۔ ہم تینوں نے تائید میں سر ہلایا۔ ہماری آنکھیں پوری طرح کھلی ہوئی تھیں اور خوب مشاہدہ کر رہی تھیں۔ چھتوں سے لگے قمقمے، بالکنیاں، ہرے بھرے خوش رنگ پھولوں سے لدے پیڑوں سے آراستہ باغ۔ لیکن ہماری نگاہیں ان چیزوں پر مرکوز تھیں جن کو اٹھایا جاسکتا تھا۔ کمپیوٹر، اسٹیریو سسٹم۔ برتن دھونے کی مشین تک تھی وہاں۔ شوہر کسی بینک میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھا، سینوراز کاراتیں کا دیرینہ دوست۔ وہ

دوسری منزل کو بدلنا چاہتے تھے۔ ایک ٹی وی روم کا اضافہ کرنا تھا، اس نے بتایا۔ زیادہ کام نہیں ہوگا، بس تین چار ہفتے۔ کچھ نئی پینٹنگز، نیا قالین، ایک دو نئی کھڑکیاں اور قمقمے فانوس۔

میں سنیچر کے روز کام کرتا۔ اور ان دنوں میں اپنے باپ کو زیادہ دیکھ پاتا بہ نسبت گھر کے۔ ہفتے کے دوران وہ گھر سے غائب رہتا تھا۔ اس کا سب سے چھوٹا بیٹا ان دنوں پوتڑے باندھتا ہوگا۔ میری ماں کو کارمیلا کے بارے میں یقیناً علم ہوگیا ہوگا۔ جب وہ گھر میں ہوتا تو دونوں میں تکرار ہوتی لیکن مجھے معلوم نہ تھا کیوں۔ ہمارے اپنے گھر کی تعمیر رک چکی تھی۔ دوسری منزل کی چھت نہیں پڑی تھی اور ایک موٹے سے موم جامے کو تین دیواروں سے باندھ دیا گیا تھا۔ جب وہ لڑتے، میں چپکے سے وہاں چلا جاتا اور پہاڑیوں کو آسمان کے کنارے خطوط کھینچتے دیکھا کرتا۔

ہم جس خاندان کے لیے کام کر رہے تھے ان کا بیٹا آندرے اسکول میں مجھ سے ایک کلاس آگے تھا۔ اپنے گھر میں وہ مجھے نظرانداز کرتا۔ اسکول میں اس نے واضح کر دیا تھا کہ میں نے دہلیز کو پار کیا ہے۔ میں سب کی فیصلہ کن نظریں خود پر گڑی ہوئی محسوس کرتا۔ جب وہ سنیچر کے روز سو کر اٹھتا تب مجھے کام کرتے ہوئے تین چار گھنٹے گزر چکے ہوتے تھے۔ اس کا چھٹی کا دن ایک کبھی نہ ختم ہونے والی مسلسل جماہی کی طرح ہوتا۔ میں ہال میں ٹائلیں لگاتا اور وہ ناشتہ کرتا۔ میں کونوں کی گھسائی کرتا اور کتابوں کے شیلف ناپتا اور وہ فون پر زور زور سے بات کرتا، "ہاں، پرانہا یہاں ہے۔ تم شرط لگا سکتے ہو کہ میں بیزار آ چکا ہوں۔" اس نے اپنی حقارت چھپانے کی کبھی کوشش نہ کی۔ میں اس کی قیاس آرائیاں سنتا کہ کون سی لڑکی اس نئے کمرے میں اس کے ساتھ سوئے گی جو ہم تعمیر کر رہے تھے۔ کس طرح وہ ٹانگیں پھیلائے گی۔ ٹیلی فون کے لمبے تار کو اپنے پیچھے کھینچتا ہوا وہ اس جگہ پریڈ کرتا رہتا جہاں میں کام کرتا۔ دھول اور گرد اڑنے کی شکایت کرتا اور اپنی ماں سے کہتا کہ گھسائی کی آواز سے اس کے کانوں میں درد ہوگیا ہے۔ وہ ہر وقت اپنی طاقت، اپنی اکڑ کا مظاہرہ کرتا رہتا۔ میں ایسے موقعوں پر اپنا سر جھکا لیتا اور ایسا بن جاتا گویا میں نے کچھ سنا ہی نہ ہو۔

ایک سنیچر ہمارا کام اختتام کو پہنچ رہا تھا۔ پورا خاندان کسی شادی میں شرکت کے لیے تیاری کر رہا تھا۔ اس کی ماں اِدھر اُدھر بھاگی پھر رہی تھی۔ اس نے تین مرتبہ لباس تبدیل کر کے دیکھا تھا۔ باپ یہ بتانے کے لیے اندر آیا کہ ہمیں آج کچھ جلدی کام سمیٹنا پڑے گا کیونکہ گھر کے سب لوگ باہر جا رہے

ہیں۔ ہم اپنا کام جلدی جلدی کر رہے تھے تاکہ آج ہی کام ختم ہو جائے جب آندرے نے اپنی ماں کو آواز دی، ''ماما، پرانہا سے کہو کہ ہتھوڑی مارنا بند کرے۔ اس شور میں میں کچھ سوچ تک نہیں سکتا۔''

وہ ہال وے میں نکل آیا، سرمئی گرم سوٹ اور سرخ ٹائی میں ملبوس۔ ٹائی کی گرہ اب تک لگی نہ تھی۔ اس نے مجھے گھورا۔

''تم نے اسے کیا کہہ کر پکارا ہے، آندرے؟'' اس کی ماں نے سخت لہجے میں کہا۔ وہ کمرے میں داخل ہوگئی تھی۔ اس کے بال سخت، اپنی جگہ پر مضبوطی سے جمے ہوے، باب کٹ اسٹائل میں بنے ہوے تھے۔ وہ آندرے کے سامنے آ کھڑی ہوئی، اس کے جواب کے انتظار میں۔

''پرانہا،'' آندرے بڑبڑایا۔

''کیا؟'' اس نے حیرانی اور شرمندگی سے پوچھا، ''تم اسے اس نام سے کیوں پکارتے ہو؟'' پھر وہ میری طرف مڑی۔ ''بیٹا، کیا نام ہے تمھارا؟''

''آسکر، میڈم۔''

''تمھاری ماں ازکاراتیں کے گھر میں کام کرتی ہے، ہے نا؟''

''جی، میڈم۔'' میرا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

''اور تم کس سال میں ہو؟''

''تیسرے سال میں۔''

آندرے یہ گفتگو ناگواری سے سن رہا تھا۔ اپنے نفیس لباس میں وہ مختلف نظر آ رہا تھا۔ لیما کی ہائی سوسائٹی کے صفحات کے لیے لی جانی والی تصویر کا عکس۔ وہ قد میں مجھ سے لمبا تھا اور وجیہہ، اور اس لہجے برتری کے احساس سے نہایا ہوا، عمیق اور کرخت۔ میں کام کرنے والے لبادے میں ملبوس تھا جو کہنیوں اور ٹخنوں پر سے گھسا ہوا تھا اور رنگ میں لتھڑا ہوا۔

''آندرے،'' اس کی ماں نے کہا، ''یہ آسکر ہے۔ یہ نوجوان تمھارے اسکول میں پڑھتا ہے اور سباستیئن ازکاراتیں کا دوست ہے۔ اب تم ایک شریف آدمی کی طرح اس سے ہاتھ ملاؤ۔''

اس کی آنکھیں فولاد کی طرح سخت ہوگئی تھیں اور اس کے ہاتھ بھی۔ اس نے ہاتھ میری طرف بڑھایا۔

''آندرے،'' اس نے کہا۔

''آسکر۔''

ہم نے ہاتھ ملایا۔ نہیں، تم صحیح کہہ رہے تھے، میں نے دل میں سوچا۔ پرانہا۔ حرام زادے، یہی میرا نام ہے۔ میں نے اسے گھورا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا، شاید لمحہ بھر کے لیے، میں نے ہاتھ دبایا۔

''بس، کافی ہے، لڑکو!'' اس کی ماں بولی اور دونوں جانے کے لیے مڑے۔

''سہ پہر بخیر، میڈم،'' میں نے آواز دی۔

ہم نے سانتا انیتا، ولا ماریا اور ال اگستینو کے لیے سوار مسافروں کو تماشے دکھائے۔ ہم کوماز، راس اولیوز اور کارابیلو سے گزرے۔ تین دن۔ لیما اپنے آپ کو ظاہر کر رہا تھا، اپنی تمام شان وشوکت کے ساتھ۔ اس کا نظام مجھ پر واضح ہوتا جا رہا تھا: اس کے خلیے، اس کی شریانیں، اس کے لاتعداد دھڑکتے ہوئے دل۔ ہم قہقہے اور سکے جمع کرتے رہے حتیٰ کہ ریزگاری سے میرے سوٹ کی جیبیں بھاری ہو کر لٹک گئیں۔ میں ایک خفیہ ایجنٹ تھا۔ میں نے چھ ایسے لوگوں کو دیکھا جن کو میں جانتا تھا۔ ایک سابقہ گرل فرینڈ، سان حوان کے دو پرانے محلے دار اور یونیورسٹی کی ایک عورت۔ اخبار کا ایک ساتھی تک۔ مجھے کسی نے نہیں پہچانا۔ میں خود کو بھولتا جا رہا تھا، شہر کی سڑکوں پر گھومتا ہوا، اپنی زندگی کا کھوج لگاتا ہوا۔ میں نے کبھی ایسا محسوس نہ کیا تھا: دوسروں کی نظروں میں آتا ہوا لیکن اجنبیوں اور دوستوں، جاننے والوں کی کھبتی ہوئی نظروں سے محفوظ۔

میں نے اپنی سابقہ گرل فرینڈ کو گلابی ہونٹوں تلے ناخن چباتے ہوئے دیکھا۔ جب ہم ساتھ ہوتے تھے وہ اس کلی کی طرح لگتی تھی جس کو آنے والے دنوں کے ساتھ پھول کی طرح کھلنا تھا، اپنی شخصیت میں ابھرنا تھا، ہر سال مزید دلکش ہوتے رہنا تھا۔ لیکن اب وہ ستائیس سال کی تھی اور اب تک اس پر نکھار نہ آیا تھا۔ جب وہ مجھے سکہ تھما رہی تھی، میں نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا، اور جب اس کی انگلیاں میری کھلی ہوئی ہتھیلی سے مس ہوئیں تو مجھے ایک جھرجھری سی محسوس ہوئی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ میں کون ہوں۔

میرے باپ نے سکیورٹی گارڈ کو پیسے دیے تھے۔ اس نے ہمیں دن اور وقت بتا دیا تھا۔ پورا خاندان شہر سے باہر گیا ہوا تھا۔ میں اس موقعے کا چھ ماہ سے انتظار کر رہا تھا۔ میں پڑھائی میں تیز تھا اور وہ مجھ سے نفرت کرتے تھے۔ میں سوکر کا اچھا کھلاڑی تھا اور وہ میرا مذاق اڑاتے تھے۔ میں ان لوگوں کو کبھی نہ سمجھ پایا، یا یہ کہ وہ جیسے تھے ویسے کیوں تھے۔

ہم فلپ کی بغیر شیشے والی وین میں گئے تھے۔ انھوں نے دیوار کے اس پار اترنے میں میری مدد کی۔ میں نے گیراج کھولا اور وہ وین کو اندر لے آئے۔ باقی کام آسان تھا۔ ٹیلی وژن، وی سی آر، کمپیوٹر، اسٹیریو، ہر چیز نکالی گئی اور احتیاط کے ساتھ وین میں رکھی گئی۔ ہم اندھیرے میں ڈوبے مکان میں آہستگی سے چلتے پھرتے رہے، سامان کو احتیاط سے اٹھاتے ہوے، گویا وہ قیمتی نوادرات ہوں۔ اور وہ تھے بھی۔ ایک عمدہ بغیر تاروالے فون کا مطلب تیس سول۔ بلینڈر پندرہ کا، اگر تمھیں پتا ہو کہ کہاں بیچنا ہے۔ یہ سب کچھ ایسے طریقے اور نظم وضبط سے کیا گیا کہ معلوم ہی نہ ہوتا تھا کہ چوری ہے۔

میرے باپ نے ایک دفعہ مجھے بتایا تھا کہ لیما میں کچھ بھی خریدا اور بیچا جا سکتا ہے۔ ہم سان حوان کے بازار سے گزر رہے تھے، پھلوں کے اسٹال سے پرے، گوشت اور مچھلیوں کی دکانوں پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ ایک عورت کپڑے بیچ رہی تھی جو اس کے سامنے اونچی ڈھیریوں کی صورت میں بکھرے ہوے تھے۔ بارسیلونا کی نقلی جرسیاں، چرائے ہوے کار کے پرزے، تھیلے، بیگ اور گھڑیاں۔ ایک بوڑھا آدمی اپنے ٹھیلے کے پاس کھڑا تھا، ہتھوڑیاں، پلاس، مڑی ہوئی، زنگ خوردہ، استعمال شدہ کیلیں۔ یا خدا، کیا ہم اتنے غریب ہیں؟

میں نے مکان کا آخری چکر لگایا۔ ہم اپنا کام تقریباً پورا کر چکے تھے۔ یہ میرا پہلا موقع تھا، اور مجھے اس میں شامل کر کے میرا باپ یہ جتانا چاہتا تھا کہ اسے مجھ پر اعتماد ہے۔ میں خود بھی اس میں شامل ہونا چاہتا تھا کیونکہ مجھے اپنے باپ پر بھروسا تھا۔ اب ہمارے حالات ٹھیک ہونے جا رہے تھے۔ اب ہمارے پاس پھر سے پیسے آئیں گے۔ ہم اپنے گھر کی دوسری منزل کی تعمیر کو مکمل کرا سکیں گے اور میری ماں کی خوشیاں لوٹ آئیں گی۔ وہ دونوں خوش رہیں گے۔ مجھے اس وقت قطعاً علم نہ تھا کہ وہ ہمیں چھوڑنے کی تیاری کر رہا ہے۔

میں سیڑھیوں کے سرے پر تذبذب کے عالم میں کھڑا اس کمرے کو دیکھ رہا تھا جو ہم نے بنایا تھا۔ وہ واقعی کوئی شے تھی۔ اس بڑے سے طاق کے ساتھ جہاں ٹیلی وژن رکھا جانا تھا۔ مجھے اپنے کام پر فخر تھا۔ میں کسی خاص چیز کی تلاش میں نہ تھا۔ ہم نے پہلے ہی اس کا ڈبا اور الارم گھڑی اٹھالی تھی۔ میں نے لیمپ روشن کیا۔ الماری میں آدھی درجن جوتوں کی جوڑیاں اور سفید اور آسمانی قمیصیں تھیں۔ میں نے ان سب کو باری باری چھوا اور پھر الماری کے تختے پر ہاتھ پھیرنے لگا، اور وہ مجھے وہاں پڑا مل گیا: اس کا سرمئی گرم سوٹ۔ میں نے اسے کھینچ کر نکالا ہی تھا کہ میرا باپ کمرے میں داخل ہوا۔

''تم آخر کر کیا رہے ہو؟'' وہ پھنکارا۔ ''اس منحوس بتی کو بند کرو!''

''ہم نکل رہے ہیں۔ اس کو واپس رکھ دو،'' اس نے کہا۔ ''ہم اسے بیچ نہیں سکتے۔''

''ہم بیچ سکتے ہیں۔''

''ہم جلدی میں ہیں، چینو، چلو۔''

''یہ میرے لیے ہے،'' میں نے کہا۔

''یہ ڈپارٹمنٹ اسٹور نہیں ہے۔ تمھیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔''

وہ صحیح کہہ رہا تھا۔ مجھے اس کی ضرورت نہ تھی، اور نہ ہونے والی تھی — اس وقت تک نہیں جب تک میں نے اسے اخبار ''ال کلارن'' میں انٹرویو دیتے وقت نہ پہنا — سات سال بعد۔ مجھے پتا تھا کہ وہ سوٹ پہننے کے لیے مجھے ایک دو سال انتظار کرنا پڑے گا تا کہ وہ مجھے فٹ آئے۔ یہ ایک کند، غیر واضح حسرت تھی، لیکن بالکل حقیقی۔ ''مجھے یہ چاہیے،'' میں نے کہا، ''اپنی سالگرہ کے لیے۔''

جامنی اندھیرے میں میں اس کو بمشکل دیکھ سکتا تھا۔

''تمھاری سالگرہ؟'' میرے باپ نے کہا۔ وہ بھول گیا تھا۔ اس کی آواز نرم پڑ گئی۔ ''اچھا، لے لو پھر۔''

میں اپنے سبز اور سفید سوٹ میں ملبوس شہر میں گھومتا رہا اور اپنی ماں کے بارے میں سوچتا رہا۔ میں نے اپنا مضمون ایک لفافے میں رکھا، لفافہ بند کیا اور اسے پوسٹ بکس میں ڈال دیا۔ میں ویا کورتا سے نہیں ملا، اور نہ پھر میں نے اخبار دیکھا کہ آیا اس نے وہ مضمون چھاپا یا نہیں۔ میں تونیو اور جان سے

پھر کبھی نہیں ملا۔ میں نے انھیں بیس سول سوٹ اور جوتوں کے دیے — اور یادوں کے۔ میں نے اپنے نئی مسخری ذات کے دل کی تہوں سے ان کا شکریہ ادا کیا۔ میں نے ان کا کوئی ایکٹ، یا کوئی بھی ایکٹ، نہ کیا۔ میں نے اپنی جمع کی ہوئی رقم خرچ کر ڈالی۔ پولکا ڈیزائن والا سوٹ پہنا اور اپنے پیروں میں تکلیف دہ جوتے چڑھائے۔ ہال وے میں لگے ہوئے آئینے میں اپنے مدھم عکس کو دیکھتے ہوئے اپنے چہرے کو رنگا۔ سرخ پنگ پانگ کی گیند کو اپنی ناک پر چڑھایا اور ربر بینڈ کے کسے ہوئے فیتے کو اپنے بالوں میں محسوس کیا۔ اور میں بسوں میں بیٹھا، دوسرے مسافروں کی طرح کرایہ دے کر۔ سوائے اس کے کہ میں دوسرے مسافروں کی مانند نہ تھا۔ میں جانتا تھا کہ میں اُس سے ملوں گا۔ یہ ہمارا شہر تھا۔ میرا اور اُس کا۔ میں بس سے لاوکٹوریہ پہنچا جہاں نکڑ پر کھڑے بچوں نے مجھے دیکھا اور سوچا کہ آیا مسخرے کو زحمت دی جائے یا نہیں۔ میں تنگ گلیوں میں چلتا گیا۔ ٹوٹے پھوٹے فٹ پاتھوں پر میرے جوتے لڑکھڑاتے رہے۔ میں کارمیلا کے گھر کے سامنے ایک بنچ پر جا بیٹھا اور انتظار کرنے لگا۔ میرے کالے کلوٹے بھائی نکلے اور اپنے اپنے اسکولوں اور دفتروں کو چلے گئے۔ انھوں نے میری طرف نظر تک نہ ڈالی۔ میں اس منظر کا حصہ تھا۔ ایک پولیس والا رکا اور مجھ سے پوچھا کہ میری طبیعت خراب تو نہیں ہو رہی۔

"میں آرام کر رہا ہوں، چیف،" میں نے کہا۔

کیا میں یہاں کہیں آس پاس سے تعلق رکھتا ہوں؟

"میں دون ہیوگو کا بیٹا ہوں۔"

"کارمیلا کا ہیوگو؟" اس نے پوچھا، اور پھر آگے چلا گیا۔

کارمیلا گھر آئی، ملبوسات لیے ہوئے، اور میری طرف دیکھ کر مسکرائی — کیونکہ وہ سب کو دیکھ کر مسکراتی ہے۔ اس کے گھر کا دروازہ پورا کھل گیا اور اپنی بنچ پر بیٹھے ہوئے میں نے اس کی دنیا پر نظر ڈالی، جو میری ماں کی نئی دنیا تھی۔ اور پھر چیزیں لہروں کی مانند میری نظروں کے سامنے جھولنے لگیں۔ وہ سڑک، وہ گھر۔ "میں نے تمھیں اس وقت سے نہیں دیکھا جب تم اتنے سے تھے،" کارمیلا نے اسپتال میں مجھ سے کہا تھا۔ مجھے یاد آیا۔ میں چھ سال کا تھا۔ دون ہیوگو مجھے اپنی داشتہ سے ملانے لے گیا تھا۔ میں نے اس سے پہلے کسی کالے شخص کو نہ دیکھا تھا۔ میں رونے لگا تھا اسے دیکھ کر، اور کہا تھا کہ وہ جلی ہوئی ہے۔ میرے باپ نے مجھے تھپڑ مارا تھا اور کہا تھا کہ میں اس کے ساتھ اچھی طرح پیش آؤں۔ وہ

مسکرائی تھی اور میرے گالوں میں چٹکی لی تھی۔ اور اب مجھ میں ہمت نہیں تھی کہ میں اس دروازے کی گھنٹی بجاؤں۔ مجھے معلوم تھا وہ نیک دلی سے ملے گی مجھ سے، اس مسخرے کے لباس میں بھی، جیسی کہ وہ تھی، میری ماں کے لیے۔ وہ میرے سوالوں کا جواب دے گی اور مجھے بتائے گی کہ وہ میرے باپ سے کہاں ملی تھی اور کیسے اس کی محبت میں گرفتار ہوئی تھی، وہ ساری پیار بھری باتیں جو میرے باپ نے اس سے کی تھیں۔ کارمیلا اور میری ماں کے درمیان اس بارے میں یقیناً گفتگو ہو چکی ہوگی۔ میرے پاس انھیں بتانے کے لیے آخر کیا ہے؟ ان دونوں نے اپنے متوازی صدموں اور ٹوٹے ہوئے دلوں کی تفصیلات پہلے ہی طے کر لی ہوں گی: وہ کب کس کے ساتھ رہے گا، پہلے کون اس کے ساتھ سویا تھا، کون معصوم ہے، کون مجرم۔ اور انھوں نے اس کو معاف کر دیا — یہ سب سے زیادہ حیران کن بات تھی۔

ماں، تم ہمیشہ اسے کیوں معاف کرتی رہیں؟ اس نے پہلے کارمیلا کو تمھارے بارے میں بتایا۔ تمھارے بارے میں، میرے بارے میں، اپنے کام کے بارے میں، وہ کیا کرتا ہے اور مستقبل میں کیا کرے گا۔ اس نے تمھیں اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے کے لیے چھوڑ دیا۔ تم ویرانی کو تکتی رہیں اور خود سے پوچھتی رہیں کہ تم سے کیا غلطیاں ہوئیں۔ اور پھر اس نے ہمیں چھوڑ دیا۔ اور تم نے اسے معاف کر دیا، ماں، تم نے اسے معاف کر دیا۔

آندرے کا گھر لوٹنے کے بعد، لوٹی ہوئی چیزیں تقسیم ہو گئیں۔ لیکن میری ماں اور میں نے کوئی چیز نہ دیکھی، سوائے اس سرمئی سوٹ کے۔ اگلے ہفتے میں دوبارہ گھٹنوں کے بل بیٹھا ہوا ایک دوسرے مکان کے فرش کو چمکا رہا تھا۔ اگلا سنیچر اور پھر اس سے اگلا۔ میں اپنے باپ اور اس کے عملے کے ساتھ تین مرتبہ کام پر گیا۔ اب میں سمجھ سکتا ہوں کہ پیسوں کی کتنی قلت ہوگی ان دنوں۔ اسے چار بیٹوں کو پالنا تھا۔ ہم نے دو ہفتے والا کام ختم ہی کیا تھا کہ فلپ وین لے کر آ گیا۔ مجھے اس بات پر حیرت تھی کہ انھوں نے ابھی کیے ہوئے کام کو ٹھنڈا بھی نہ ہونے دیا تھا۔ مجھے یہ جلد بازی کچھ سمجھ میں نہ آ رہی تھی۔ میں نے اپنے باپ سے پوچھا۔

''منھ بند کرو،'' اس نے کہا، ''کوئی سوال نہ کرنا مجھ سے''۔

ہم شہر کی اندھیری سڑکوں سے گزرے۔ میں پچھلی سیٹ پر بیٹھا وین کو ڈولتے ہوئے محسوس کر رہا

تھا۔ مجھے کچھ معلوم نہ تھا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں، لیکن جب میں وین سے اترا مجھے فوراً اندازہ ہو گیا کہ میں کہاں ہوں۔ میں نے دہشت زدہ ہو کر اپنے باپ کی طرف دیکھا، کسی توجیہہ کی توقع میں، لیکن اس نے لاپروائی سے کندھے اچکا دیے۔ شہر میں عجیب وغریب چیزیں وقوع پذیر ہوتی ہیں۔ انھوں نے مجھے دیوار پر چڑھایا اور دوسری طرف دھکیل دیا — اس باغ میں جہاں میں بچپن میں کھیلا تھا۔ میں شیشے کی کھڑکی سے پرلی دیوار سے لگی کتابوں کا اونچا شیلف دیکھ سکتا تھا۔ اور چمڑے کا نفیس صوفہ۔

وہ بہت امیر تھے اور بہت بھروسا کرنے والے۔ ان کا چوکیدار ایک ٹوٹی پھوٹی لکڑی کی کرسی پر سو رہا تھا۔ میں نے گیراج کا دروازہ اندر سے کھولا، اور وہ اچانک اٹھ بیٹھا۔ میرا باپ آگے بڑھا اور اس کا جبڑا توڑ دیا۔ فلپ اسے گھسیٹ کر باغ میں لے گیا اور ایک درخت سے باندھ دیا۔ چوکیدار، آنکھوں پر بندھی پٹی، منھ میں ٹھنسے کپڑے اور بہتے ہوے خون کے ساتھ وہاں بیٹھا رہا اور ہم لوگوں نے گھر کے انجر پنجر کھول ڈالے۔ ان کی چیزیں اتنی مانوس تھیں کہ مجھے لگا گویا میں اپنے گھر سے چیزیں چرا رہا ہوں۔

وہ سب کچھ بہت خوفناک اور منطقی تھا: بے حد پرخطر۔ میں نے فلپ اور اپنے باپ کو گھر میں گھمایا، گائیڈ کی مانند۔ مائیکروویو مت بھولنا اور بلینڈر، جو میری ماں کتنا چاہتی تھی۔ اور ہاں، بوڑھے انجینئر کا کیلکولیٹر اور ٹیلی وژن، ریموٹ کنٹرول والا۔ ہماری خاموش کاریگری میں ایک حسن تھا۔ ہر شخص پر شبہ کیا جائے گا۔ مالی، میری ماں، میرا باپ، میں اور عملے کا کوئی بھی آدمی جس نے کبھی اس گھر میں کام کیا ہو۔ اور چوکیدار جو درخت کے تنے سے بندھا بیٹھا خون بہہ جانے کے باعث چیتھڑے کی مانند نظر آ رہا تھا۔ وین بھر چکی تھی۔ سٹک لینے کا وقت آ گیا تھا۔ چوکیدار کی ٹھوڑی سینے سے لگ گئی تھی اور اس کی سانسیں بھاری ہو چلی تھیں۔ مجھے اس یقین کا احساس ہوا کہ وہ بھی ہم میں سے ہے اور اس خیال نے مجھے گھناؤنے پن سے دوچار کر دیا۔ وہ کچھ بھی ہو سکتا تھا، ایک بھٹکی ہوئی کرن جس نے لمحے بھر کے لیے اس کا چہرہ روشن کر دیا، یا پھر تکلیف کی لہر جو اس کے چہرے پر دوڑی اور مجھے لگا جیسے وہ مسکرا رہا ہو۔ میں نے اسے لات رسید کی۔ وہ چوکنا ہو گیا لیکن اس کی آنکھوں پر پٹی تھی۔ اسے کچھ نظر نہ آیا اور اس نے لڑکھڑا کر درخت کا سہارا لیا۔ میں نے ایک گاڑھی گندی، مائع نما چیز اس کی پیشانی پر انڈیل دی۔ پیسے کا رنگ۔ میرے باپ نے مجھے آواز دی اور ہم غائب ہو لیے۔

وہ کارمیلا کے گھر سے نکلی اور میں اس کا پیچھا کرنے لگا۔ مانکو کاپاچ پہنچ کر وہ بس میں سوار ہوگئی۔ اس نے اپنا یونیفارم پہنا ہوا تھا — اتنا صاف ستھرا اور اتنا سپید جیسے گرمیوں میں اونچائی پر بادل ہوں۔ اس نے مجھے اپنے پیچھے بیٹھا ہوا نہیں دیکھا اور دوسری طرف کا رخ کیے معصومیت سے بیٹھی رہی، میری جانب دیکھے بغیر۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور بس کو گڑھوں والی سڑک پر ہچکولے کھاتا محسوس کرتا رہا۔ ٹکٹ کلکٹر نے اسٹاپوں کے نام گانے شروع کیے۔ لاوکٹوریہ، سان بورخا، لاوکٹوریہ، سان بورخا! کھڑے ہوے مسافروں کے درمیان میں اب تک اس کی جھلک دیکھ رہا تھا۔ میرے ساتھ والی سیٹ پر کوئی نہ بیٹھا۔ پھر وہ اٹھ کھڑی ہوئی، بس سے اتری، اور میں اس کے پیچھے چل پڑا۔

مجھے راستہ معلوم تھا، ازکاراتیس کے گھر کا، جہاں میں ماں کے ساتھ جایا کرتا تھا اور باغ میں اپنا ہوم ورک کرتا تھا۔ وہ گھر جسے میرے باپ نے اور میں نے لوٹا تھا، تقریباً میری ماں کے روزگار کی قربانی دیتے ہوے۔ لیکن وہ ہمیشہ وہاں محفوظ تھی۔ اور بدترین حقیقت یہ ہے کہ میں بھی۔ انھوں نے مجھے اپنے لٹے ہوے گھر میں خوش آمدید کہا تھا اور مجھے تسلی دی تھی جب میں رو رہا تھا۔ ''چینو، تم اب بڑے ہو چکے ہو۔ بڑے روتے نہیں۔ چینو، دیکھو، انھوں نے کتابیں تو نہیں چرائی ہیں نا،'' بوڑھا انجینئر مجھے تسلی دے رہا تھا۔

میں اس کے پیچھے آدھے بلاک تک گیا۔ اپنے بے ڈھب، بڑے جوتوں میں، خالی سڑک کے وسط میں مارچ کرتا ہوا ایک ماہر مسخرہ۔ ''ماں!'' میں چلایا۔ وہ مڑی اور پھر مجھے دیکھ کر تیزی سے واپس پلٹ گئی۔ ''ماں، ماں!'' میں پھر چیخا۔ ''میں آسکر ہوں! میں چینو ہوں!''

وہ ایک پھولوں سے لدے درخت کے نیچے رک گئی۔ ''بیٹا،'' وہ بولی، ''کیا یہ تم ہو؟''

میں نے اسے تدفین کے بعد سے نہیں دیکھا تھا۔ میں نے اسے اکیلا چھوڑ دیا تھا بوڑھے آدمی کو دفنانے کے لیے۔ میرے بغیر، میری ماں نے اس کا ہاتھ تھاما اور اسے مرتے ہوے دیکھا تھا۔ اس نے اسے زمین کے اندر لٹایا تھا اور پھر مٹی ڈالی تھی۔

''یہ میں ہوں، ماں۔''

''چینو! تم نے مجھے ڈرا ہی دیا تھا!''

''مجھے معاف کر دو۔''

''تمھاری ناک، چینو؟''

میں نے لال ناک کھینچ کر نکالی اور اسے زمین پر گرنے دیا۔

''اور تمھارے جوتے! یہ سب کیا ہے؟''

میں نے ان جوتوں سے پیر نکالے اور جوتوں کو ٹھوکر مار کر سڑک کے کنارے لڑھکا دیا۔

''ماں، میں اخبار کے لیے کہانی لکھ رہا ہوں۔''

اس نے سر ہلایا، بنا سمجھے۔

''مجھے معاف کر دو،'' میں نے دہرایا۔

''تم کہاں تھے، چینو؟''

''یہاں اور وہاں،'' میں نے کہا اور جوکر کی ٹوپی اتار دی۔ ''اب میں یہاں ہوں۔'' اس نے مجھے اپنے بازوؤں میں لے لیا اور میرے بالوں کو سہلانے لگی۔ اس نے میری پیشانی پر بوسہ دیا اور میرے رخساروں پر لگا رنگ پونچھنے لگی۔

''تم ٹھیک تو ہو؟''

''میں کارمیلا کے گھر آیا تھا لیکن میں نے دروازہ نہیں کھٹکھٹایا۔''

''تمھیں کھٹکھٹانا چاہیے تھا،'' اس نے کہا۔ ''کھٹکھٹاؤ گے؟''

''معلوم نہیں،'' میں بولا۔ ''کیا پاپا نے مجھے یاد کیا تھا؟''

یہ مذاق تھا، میری جاننے کی خواہش، لیکن پھر بھی میں نے پوچھا۔ اس نے مجھے بھینچ لیا۔ میرے چہرے کا رنگ سفید لکیروں کی شکل میں بہتا ہوا سوٹ کی آستینوں تک آ پہنچا تھا۔

''وہ تمھیں یاد کر رہا تھا، چینو۔''

میں نے اس کے گرم، نمکین رخسار کی نمی اپنے گالوں پر جذب ہوتے ہوئے محسوس کی۔ مجھے اچھا لگ رہا تھا اس کے سینے سے لگنا۔

''میں بھی تمھیں یاد کر رہی تھی،'' ماں نے کہا۔

''میں اب تمھیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا،'' میں نے کہا۔ لیکن میرے جسم میں ایک جھرجھری سی دوڑ گئی۔ اپنے دل کی گہرائیوں میں مجھے معلوم تھا کہ مسخرہ جھوٹ بول رہا ہے۔

❄❄

یوسف ادریس

الغریب

کسی کو اس بات کا گمان تک نہ ہوا ہوتا کہ سنہری بالوں، سرخ رخساروں، اور شوخ، دلکش خدوخال کے حامل شرباتی کے ماضی میں ایک ایسا غیر متوقع باب پنہاں ہوگا جس میں ایک ڈاکو، سنگین مجرم، رات کے شہنشاہ کے ساتھ اس کی ملاقاتوں کی تاریخ رقم ہوگی۔ وہ میرا ثانوی اسکول کے زمانے کا دوست تھا؛ اس نے مجھے سائیکل چلانا اور کہانیاں لکھنا سکھایا تھا، اور میری پیپر بیک ناولوں کی لت کی سرپرستی کی تھی؛ اور اس کے اپنی کہانی سنانے سے پہلے میں خود اس بات پر مشکل سے یقین کر پاتا کہ اس کی زندگی کا ایک ایسا پہلو بھی تھا جس کے بارے میں میں قطعی کچھ نہ جانتا تھا۔

ہماری ملاقاتیں ہمیشہ اتفاق سے ہوتیں، گو کہ ہم دونوں ایک ہی شہر میں رہتے تھے۔ ہر دفعہ سامنا ہونے پر جب ہم ایک دوسرے کے پتے لیتے اور ملاقات طے کرتے تو ہمیں فطری طور پر احساس ہوتا کہ ہم طے شدہ ملاقات نہ کر پائیں گے، اور یہ کہ ہم اگلی بار پھر اتفاق ہی سے ملیں گے۔ میں ایک دفعہ اس کے والد سے ملا تھا اور مجھے علم تھا کہ اس کا خاندان کس گاؤں سے تعلق رکھتا ہے؛ اور میں چند غیر ضروری تفصیلات جانتا تھا مثلاً عورتوں سے اس کی چاہ، اور اس کی شدید جھلاہٹ کہ، گو ہم بڑے ہو چکے تھے اور اسکول سے نکل چکے تھے، ہم اب تک اس کو اس کے خاندانی نام سے پکارتے تھے جیسا کہ ہمیشہ سے کرتے آئے تھے۔ اس کا اصل نام عبدالرحمٰن صالح الشرباتی تھا۔ لیکن اسکول میں، ہم سب عامیانہ ناموں سے تھک چکے تھے اور اسے شرباتی کے نام سے پکارتے تھے اور وہ نام ہمیشہ کے لیے اس کے ساتھ چپک گیا تھا، یہاں تک کہ جب اس کی بیوی نے اسے عبدالرحمٰن کے نام سے پکارا تو میں چونک گیا۔

پھر بھی مجھے قطعاً یہ گمان نہ تھا کہ ایک ایسا شخص جو مثالی عادتوں کا حامل تھا، جس کی زود حسی ایک ہی اکھڑے ہوئے لفظ سے مجروح ہو جایا کرتی تھی — اس وقت بھی جب وہ ایک بال بچوں والا آدمی ہو گیا تھا — اس کا الغریب جیسے لوگوں اور اشتہاری مجرموں کی خوں ریز دنیا سے تعلق رہا ہوگا۔ اس کا علم مجھے اتفاق سے ہوا، اتفاق ہی کہوں گا میں اسے، اور شاید اتفاق کو اس بات سے تقویت ملی کہ وہ آدھی رات کا وقت تھا اور ہم قتل اور قاتلوں کی باتیں کر رہے تھے۔ شر باقی نہ کوئی فصیح مقرّر تھا اور نہ داستان گو۔ گو کہ وہی تھا جس نے مجھے کہانی لکھنا سکھایا، لیکن اس کے اندر کے فنکار کی حس تحریر کے بجائے اس کی گفتگو میں اجاگر ہوتی۔ معلوم نہیں وہ کیا چیز تھی جس نے اس خاص موقعے پر اسے اپنی ذات کا وہ حصہ عیاں کرنے پر اکسایا۔ شاید، جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، اس کا تعلق اُس خاص لمحے اور بذاتِ خود اس کہانی سے تھا۔ لیکن غالباً اس کا تعلق اس واضح سرور سے بھی تھا جس کے ساتھ وہ اپنی ذات کی اتھاہ گہرائیوں میں اترتا اور خزانوں سے پُر لوٹتا — وہ خزانے جن کی موجودگی کا احساس خود اسے پہلی بار ہو رہا تھا۔ یہ لذت، جسے میں واضح طور پر دیکھ سکتا تھا، اس کو بولنے پر اکساتی رہی۔ وہ پوری رات بولتا رہا — اور میں سنتا رہا، اور وقتاً فوقتاً جھرجھری لیتا رہا۔ لیکن میری توجہ آخر تک مرکوز رہی۔

۱

کیا تم تصور کر سکتے ہو کہ میری زندگی میں ایسے لمحے بھی آئے ہیں جب میں سوائے اس کے کچھ نہ سوچتا تھا کہ مجھے قتل کرنا ہے — کسی کو بھی، کسی وجہ سے نہیں، ماسوائے قتل کرنے کی خواہش کے؟ اپنی طب کی کتابوں میں، یا نفسیات کی جدید موشگافیوں میں میری اس خواہش کی سائنسی توجیہات تلاش کرنے کی کوشش نہ کرو؛ میں نہ بیمار تھا اور نہ ایب نارمل۔ میں ایک عام سا اسکول کا طالبعلم تھا، چودہ سال سے زیادہ کا نہ ہوں گا۔ اور میں نے ہمیشہ یہی سمجھا کہ میری یہ خواہش بالکل فطری ہے، اور صرف مجھ تک محدود نہیں ہے۔ یقیناً کبھی کبھار ہم میں سے اکثر لوگ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ ہم مرد ہیں، غیر معمولی دعوے کرتے ہیں، اور خاص طور پر وہ لڑکے جو بلوغت کی دہلیز پر ہوں، ان غیر معمولی طریقوں کی طرف راغب ہو جاتے ہیں۔ وہ کام ڈھونڈنے کی غرض سے گھر سے نکلتے ہیں، راتیں باہر گزارتے ہیں، اپنے

باپ کی بندوقوں سے کھیلنا شروع کر دیتے ہیں؛ اگر ان کے باپ ان کاموں سے منع کریں تو خود کو یا جو بھی ان کے راستے میں حائل ہوا سے ختم کرنے کی دھمکی دیتے ہیں۔ اور اس کا مفہوم واضح ہے: وہ مردوں کے کھردرے اور خام طریقوں سے خود پر اپنی مردانگی ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مجھ میں اور میرے ساتھیوں میں صرف اتنا فرق تھا کہ میں اپنی خواہش میں کچھ زیادہ ہی آگے نکل گیا تھا اور مردوں کی دنیا میں کسی مرد کو قتل کر کے داخل ہونا چاہتا تھا۔ میں نے اس خواہش کو بہت گہرائی میں دبا رکھا تھا، یہاں تک کہ میں خود سے بھی اس کا اقرار نہیں کرنا چاہتا تھا؛ گو کہ میں اس خواہش کے وجود سے آگاہ تھا لیکن خود کو سمجھانے کوشش کرتا کہ یہ خواہش میرے اندر نہیں بلکہ باہر ہے۔ یہ اس لیے کہ مجھے خوف تھا کہ میں ایک شخص کو قتل کرنے پر اکتفانہ کروں گا، بلکہ اگر اس راہ پر چل پڑا تو ہمیشہ اسی پر چلتے رہنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔ لیکن میں اپنے آپ کو برابر تسلی دیتا رہتا اور کہتا کہ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔

اس کے ثبوت کے لیے میں بچپن میں بلیوں کے ساتھ اپنے تجربات کو یاد کرتا۔ جب میں چھوٹا تھا تو بلیوں سے بہت ڈرتا تھا، ان کی لمبی لمبی مونچھوں، غراتے ہوئے چہروں اور بدصورت پنجوں سے، اور اس دن کی آرزو کرتا جب میں اتنا بڑا ہو جاؤں کہ بلیوں کو خوفزدہ کر سکوں، اس تمام دہشت کا بدلہ لے سکوں جو ان کی وجہ سے مجھ پر طاری رہی۔ میرے ذہن میں بڑے ہونے کا خیال بلیوں کو خوفزدہ کرنے اور ان کے خوف سے آزاد ہونے کی صلاحیت سے منسلک ہو چکا تھا۔ اس مقصد کو مدنظر رکھتے ہوئے میں مستقل بلیوں کے پیچھے لگا رہتا، ان کو کونوں کھدروں میں دوڑایا کرتا، اور ان کو اذیت دے کر لذت محسوس کرتا۔ اگرچہ میں نے کتنی ہی بلیوں کا پیچھا کیا، کتنے ہی دروازے اور کھڑکیاں ان کو قید کرنے کے لیے بند کیں، لیکن میں کبھی کسی بلی کو گھیرنے میں کامیاب نہ ہو سکا، سوائے ایک دفعہ کے جب میں نے اپنے پڑوسیوں کی بلی کو اپنے گھر کے ایک کمرے میں بند کر لیا۔ ہمیں اپنے پڑوسی ناپسند تھے، اور میں نے فیصلہ کیا کہ میں بلی کو دہشت زدہ کر کے مزہ لینے پر اکتفانہ کروں گا بلکہ اس کو ختم کر کے دم لوں گا۔

میں نے بے دردی سے بلی کا پیچھا کیا، یہاں تک کہ میں اس کو ایک کوٹھری تک لانے میں کامیاب ہو گیا جہاں باہر کو کھلنے والے سارے راستے اچھی طرح بند تھے۔ پھر میں ایک پرانی کھڑکی سے اکھاڑی ہوئی لوہے کی سلاخ سے مسلح اس کے پیچھے گیا اور کوٹھری کا دروازہ بند کر لیا۔ میں نے بلی کے زمین سے چھت تک اچھلنے اور پھر واپس زمین پر کودنے کی حالتِ زار سے بے حد لذت اٹھائی؛ دہشت

زدہ، باہر نکلنے کی راہ کھوجتی، خوف سے چلاتی، غراتی بلی۔ جب میں سلاخ ہاتھوں میں اٹھائے، وار کے لیے تیار، اس کی طرف بڑھا تو اس کے جسم کا رواں رواں کھڑا ہو کر لرزنے لگا۔

میں آہستہ آہستہ اس کے قریب ہو رہا تھا؛ اس کو مفلوج کر دینے والے خوف کی لذت کے نشے میں سرشار، اس تمام دہشت کا بدلہ لیتے ہوئے جو بچپن میں بلیوں کے ہاتھوں اٹھائی تھی، اپنے آپ سے، اپنے نئے قدوقامت سے اور بدلہ لینے کے اس شاندار موقعے سے خوش اور مست۔ پھر اچانک میرے قدم تھم گئے۔ بلی نے شدید اور دیوانہ وار کوششوں کے بعد یہ جان لیا تھا، یا مجھے ایسا محسوس ہوا، کہ فرار کی تمام راہیں مسدود ہو چکی ہیں۔ اب کوئی راہ باقی نہ تھی۔ مجھے آج تک اس تاریک کونے میں گھری ہوئی بلی کی وہ یاس انگیز چیخ یاد ہے۔ پھر وہ پلٹی اور پہلی دفعہ اس نے میرا سامنا کیا۔ اس نے پنجے زمین پر گاڑ لیے اور میری طرف بڑھنا شروع کیا۔ تب میں نے اس کی طرف نگاہ کی اور اس کی آنکھوں کو دیکھا۔ میں وہ خوف کبھی نہیں بھلا سکتا؛ اتنا خالص، اتنا گمبھیر خوف، جو میں نے اس بلی کی آنکھوں میں دیکھا۔ اس کی پتلیاں پوری طرح پھیل گئی تھیں۔ اس کے دانت باہر آ گئے تھے۔ شدید خوف اس پر غالب تھا۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ اس مقام پر پہنچ چکی تھی جب وہ اچھل کر مجھ پر حملہ آور ہونے، میرا گلا دبوچنے، اپنے دانت اور ناخن میرے گوشت میں گاڑنے، میرا چہرہ پھاڑنے اور میری آنکھیں نکالنے کے لیے بالکل تیار تھی۔ وہ ایک نگاہ کافی تھی۔ لمحہ بھر کے لیے میں اسی مقام پر گڑ گیا؛ اس کے وحشیانہ، یاس بھرے خوف کے سامنے منجمد ہو گیا۔ پھر اچانک عین وقت پر میرے اندر اتنی طاقت آ گئی کہ میں کوٹھری سے بگٹٹ بھاگا۔ نہ دائیں دیکھا نہ بائیں، ماں کو ڈھونڈتا ہوا، کانپتا ہوا اس کی گود میں گر گیا، اور اپنا چہرہ اور اپنی آنکھیں اس کی گود میں چھپا لیں، اس سعی ناکام میں کہ اس کے اندر گم ہو جاؤں۔

شاید یہی رویہ جس نے مجھے بلی کو دہشت زدہ کرنے پر اکسایا— جبکہ میں خود کسی زمانے میں ان سے خوفزدہ رہتا تھا— کہ میں اس کی توثیق کر سکوں کہ میں مرد بن چکا ہوں اور جسمانی قوت کا حامل ہوں، مستقبل میں ظاہر ہونے والے رویوں میں فطری طور پر پروان چڑھا۔ کوٹھری میں پیش آنے والے واقعے کے بعد میں نے بلیوں کے ساتھ غیر ذمہ دارانہ راہ و رسم کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دیا۔ اور اگر مجھے اس کا علم ہوتا کہ اپنی مردانگی ثابت کرنے کی کوشش میں میں اس سے کہیں زیادہ مہیب

حالات کا شکار ہو جاؤں گا تو شاید میں اپنی خواہشات کو بے لگام رکھنے سے گریز کرتا۔ میں نے مخفی طور پر دل کی گہرائیوں سے اس بات کا فیصلہ کر لیا کہ ان خواہشات کا ان کے انجام تک پیچھا کروں گا۔

مجھے یقین ہے تم کہو گے کہ قتل کرنے کی خواہش میرے ان رجحانات کے تسلسل کی کڑی تھی جو بچپن سے ظاہر ہو چکے تھے۔ لیکن درحقیقت ایسا نہ تھا۔ یہ عمل برائے عمل والی کشش نہیں تھی بلکہ مجھے وہ لوگ مسحور کرتے تھے جو رات کے اندھیرے پر حکمرانی کرتے ہیں اور جو بھی ان کے راستے میں آتا ہے اسے ٹھکانے لگا دیتے ہیں۔ جس علاقے سے میرا تعلق ہے وہاں ان لوگوں کو ''رات کے فرزند'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس عمر میں وہ لوگ میرے لیے بے حد کشش رکھتے تھے۔ میں ان لوگوں کے گروہ میں شامل ہونے کے خواب دیکھا کرتا؛ وہ لوگ جن کے نام سے مفلوک الحالی میں مگن عام بشر کانپا کرتے تھے۔ میرے لیے رات کے فرزند مردانگی کا آدرش تھے، ایک تصور، جو میرے ذہن میں غیر معمولی عمل سے منسلک ہو گیا تھا اور میں اپنی شناخت ان سے وابستہ کرنا چاہتا تھا، کیونکہ وہ ہمارے گاؤں کے لوگوں کے ارضی سکون کو برہم کرتے تھے۔

مختصراً، میں ہیرو بننا چاہتا تھا، کیونکہ حقیقی مرد ہونے کا مطلب میرے لیے یہی تھا۔ لہٰذا میں اپنے ہیروؤں، اپنے مثالیوں کی نقل و حرکت کا، انتہائی غیر ضروری تفصیلات تک، مسلسل پیچھا کیا کرتا۔ اس آتش مزاجی اور تیزی کے ساتھ جو آج کے نوجوان نے فلمی ہیروؤں اور مقبول گلوکاروں کے لیے اٹھا رکھی ہے، میں ان سے واقفیت پیدا کرنا چاہتا تھا، یا ان میں کسی ایک سے واقف ہونا چاہتا تھا۔ تصور میں ہم دونوں دوست بن جاتے اور وہ مجھے اپنا فن، اپنا پیشہ سکھاتا، بتاتا کہ قتل کیسے کیا جاتا ہے، اور میں تجربے سے ایک مرد بن کر نکلتا۔

جیسا کہ میں نے کہا، میں صرف چودہ سال کا تھا؛ دبلا پتلا، زرد یایا ہوا، مطیع قسم کا۔ میں کبھی کسی سے نہ جھگڑا تھا، اور ہاتھا پائی تو زندگی میں کسی سے آج تک نہ ہوئی تھی۔ میری ماں، میرا باپ اور جو کوئی بھی مجھ سے واقف تھا، کہتا کہ میں نیک طبیعت اور اچھے کردار کا لڑکا ہوں۔ انھیں کبھی یہ نہ معلوم ہو سکا کہ اندر سے مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ میں اچانک پھٹ پڑوں گا، اور یہ کہ میں اپنے ذہن میں ایک عجیب و غریب خفیہ دنیا کے خواب سموئے ہوئے تھا — وہ دنیا جو اس بے رونق اور جامد دنیا سے جس میں میں روز جیتا تھا، بالکل مختلف تھی۔ میری دنیا میں دلیری تھی، شجاعت تھی اور داؤ او نچے تھے، اور مقابلے کا

خطرہ ہردم موجود۔ وہ تاریکی کی دنیا تھی اور صرف ہیرو، رات کا فرزند ہی اس میں اتر سکتا تھا اور زندہ رہ سکتا تھا۔

۲

میں نے ان تمام راستوں کی خاک چھانی جو مجھے ان لوگوں کے قریب لا سکتے تھے۔ میں گاؤں کے اسکول میں اپنے ہم عمر ساتھیوں سے اکتا گیا تھا؛ میں چائے خانوں اور ان گلیوں میں جہاں مرد چوری، ڈاکے یا کسی اور جرم کی خبر سننے کے لیے اکٹھے ہوتے تھے، اس امید پر پھرا کرتا کہ مجھے کوئی ایسا شخص ملے گا جس نے اپنی آنکھوں سے کچھ دیکھا ہوا ہوگا، اور اس واقعے پر بات کرنے کے لیے تیار ہو گا۔ میرا مددگار ہمیشہ سیّد خلیل نکلتا جو ایک نزدیکی جاگیر میں ٹماٹروں کی فصل کا نگہبان تھا۔ اس وقت وہ عمر رسیدہ ہو چکا تھا لیکن جوانی میں وہ ایک مجرم ہوا کرتا تھا، اور کسی حد تک شہرت کا حامل مفرور۔ شاید اس کے آجروں نے اس کی ماضی کی شہرت کو مدنظر رکھا ہوگا اور اسے دو ایکڑ کی فصل کی دیکھ بھال کے لیے خصوصی اہلیت گردانا ہوگا۔

میں اس کے لیے تمبا کو، شکر اور چائے لے جاتا، خاص طور پر چائے، کہ وہ چائے کا رسیا تھا۔ وہ تمام چائے کی پتی ایک ساتھ ابلتے ہوئے پانی میں ڈال دیتا اور پھر اس کے تین مختلف کشید تیار کرتا— پہلا شکر کے بغیر، دوسرا ہلکی شکر کے ساتھ اور تیسرا میٹھا۔ اور صرف اس آخری کشید سے مجھے چائے پینے کی اجازت تھی۔ سیّد خلیل کے ساتھ نشست میرے لیے لطف کی انتہا تھی، اور جب چائے اور تمبا کو اپنا کام دکھا چکے ہوتے، اس کی حسیات کو تیز کر دیتے اور اس کے گرد معتبری کا ہالہ کھینچ دیتے، تب وہ اپنے کارناموں کی داستان شروع کرتا— ان مشہور مجرموں کے قصے جن سے وہ واقف رہا تھا۔ ان مویشیوں کا ذکر جو انھوں نے چرائے تھے، ان دیواروں کی باتیں جن میں انھوں نے سیندھ لگائی تھی، ان گھرانوں کا تذکرہ جہاں انھوں نے ڈاکے ڈالے تھے۔ مجھے یہ بات اچھی لگتی تھی کہ اس نے کبھی خود کو ہیرو بنا کے پیش نہ کیا۔ وہ ان قصوں میں اپنے کردار کو بڑھا چڑھا کر بیان نہ کرتا۔ جس کسی کے ساتھ بھی اس نے کام کیا، اس کا کردار ہمیشہ نگراں کا ہوتا— پیچھے رہ کر خطرے سے مطلع کرنے کا کام۔

میرا خیال ہے اسے بھی میری رفاقت میں مزہ آتا تھا۔ وہ بوڑھا اور تنہا تھا، اور دن رات اس کٹیا میں بیٹھا رہتا جو اس نے اپنے لیے ٹماٹر کے کھیت کے بالائی سرے پر بنائی تھی۔ اس کی صرف ایک آنکھ تھی۔ دوسری آنکھ کی جگہ پر وہ ایک بھدا سا، مقامی نمونے کا رومال باندھے رکھتا تھا، اس طرح سے کہ معلوم نہ ہوتا تھا کہ کوئی نقص چھپانے کے لیے ڈالا ہوا ہے۔ اس کو باتیں کرنے میں لطف آتا تھا، اور میں بہترین سامع تھا۔ وہ گھنٹوں باتیں کرتا، بے تکان بولتا، اور میرے تخیلات سلگ اٹھتے اور میں اس آرزو میں بھسم ہونے لگتا کہ میں بھی کچھ کر گزروں؛ کسی گروہ میں شامل ہو جاؤں اور انھیں عمل میں دیکھوں۔ لہٰذا میں اس سے پوچھتا کہ کیا وہ دورِ حاضر کے کسی اپنے جیسے شخص کو جانتا ہے جن کے کارنامے ہم چھوٹی موٹی خبروں میں سنا کرتے تھے۔ اور وہ نفرت بھرے لہجے میں جواب دیتا، یاس بھرے اشارے میں کہتا، ''یہ تو لونڈے ہیں... میں تو پرانے وقتوں کی بات کر رہا ہوں۔ یہ کیا جانیں کہ کیا کر رہے ہیں۔''

مجھے اس پر یقین کرنا پڑتا کیونکہ، ان کہانیوں کے بارے میں رائے قائم کرتے ہوئے جو میں نے اس سے سنی تھیں، یہ واضح تھا کہ وہ لوگ اور وہ وقت جن کی وہ داستانیں سنایا کرتا، ایک جلیل القدر دنیا سے تعلق رکھتے تھے —— وہ دنیا جو اَب معدوم ہو چکی ہے۔ میں ہمیشہ اس بات کا افسوس کرتا کہ میں پہلے نہ پیدا ہوا، اس پر کڑھتا کہ اُس شاندار اور بھرپور زمانے کو میں نے کیوں نہ دیکھا۔ صرف ایک نام ایسا تھا جس کو سیّد خلیل نے ہاتھ کے اشارے سے مکھی کی طرح نہ اڑا دیا۔ جب میں اس کے بارے میں پوچھتا تو وہ افسردہ ہو جاتا اور کہتا، ''آہ! الغریب ابو محمد۔ وہ اصل معنوں میں مرد ہے۔ پرانے وقتوں کا صرف وہی ایک باقی بچا ہے۔'' وہ اس لیے کہ الغریب کی شہرت دور دور تک تھی؛ وہ ایک ایسے شخص کی حیثیت سے مشہور تھا جس نے پولیس کو ناکوں چنے چبوا دیے تھے، اور پولیس اس کے پیچھے دائروں میں گھوما کرتی تھی۔ اور چونکہ الغریب کا تعلق اس نسل سے نہ تھا جس سے سیّد خلیل واقف رہا تھا، میں نے اپنی کم سنی کے باوجود محسوس کیا کہ وہ الغریب کے مقام سے انکار نہ کر سکتا تھا، بلکہ اس کی دلیری اور جرأت کا یہ کہہ کر اعتراف کیا کرتا کہ وہ پرانے وقتوں کا ہے۔

میں نے اس سے کئی دفعہ پوچھا کہ کیا وہ الغریب سے میری ملاقات کرا سکتا ہے، اس سے درخواست کی کہ مجھے اس سے صرف ایک دفعہ ملوا دے۔ اور وہ مجھے ہر بار اس خواہش سے باز رہنے کی تلقین کرتا، یہ جتاتا کہ اس کے خیال میں میں اس سے کچھ زیادہ ہی بے تکلف ہو گیا ہوں۔ ''ہمیں ایسے

لوگوں سے رابطہ نہیں رکھنا چاہیے۔ وہ خراب لوگ ہیں۔ تمھاری بہتری اسی میں ہے کہ ان سے دور رہو۔''

اس کا یہ جواب سن کر میں کبھی دل برداشتہ نہ ہوتا۔ یقیناً وہ خود سے اس بات کا اقرار نہیں کرنا چاہتا تھا کہ کچھ ہی دیر پہلے وہ خودرات کے فرزندوں کی تعریف کے راگ الاپ رہا تھا اور ان کی زندگی کو عظیم الشان بنا کے پیش کر رہا تھا اور ان کے سرداروں سے ہیرو کا سلوک کر رہا تھا۔ اور جب اس کی اپنی بات آتی کہ وہ بھی کبھی ان لوگوں میں سے تھا تو وہ خوف بھری آواز میں کہتا کہ اللہ نے اس پر بڑا کرم کیا اور یہ سب بہت پہلے کا واقعہ ہے؛ اب اس نے توبہ کر لی ہے، اور وہ نمازیں بھی پڑھتا ہے، اور، شکر خدا کا، رمضان میں روزے بھی رکھتا ہے۔ ان میں سے کوئی بات بھی سچ نہ تھی، اور میں نے اپنی آنکھوں سے آدمیوں کو اس کی جھونپڑی میں مال چھپاتے اور پھر چند دنوں بعد لوٹ کر آتے دیکھا تھا۔ میں انھیں رازداری سے اس کی جیب میں نوٹ ڈالتے بھی دیکھ چکا تھا۔ اور میں اس کے پاس ہوتا تھا جب اس کو طلب کیا جاتا؛ اور وہ تھوڑی دیر بعد پریشان اور الجھا ہوا سا واپس آتا اور مجھ سے کھوئی کھوئی آواز میں کہتا،

''آہ! ہاں... تو ہم لوگ کیا باتیں کر رہے تھے؟''

اور پھر وہ ایک کہانی شروع کرتا جو میں نے پہلے سنی ہوئی ہوتی تھی۔ میں کچھ دیر توجہ سے سنتا، اس امید پر کہ شاید یہ داستان مختلف ہوگی۔ لیکن جب اس کی تفصیات یکساں نکلتیں تو میں اسے ٹوکتا اور وہ دوسرا قصہ سنانے لگتا، اور وہ بھی میرا سنا ہوا ہوتا۔ مگر جب میں نے یہ جان لیا کہ اب اس کے پاس سنانے کے لیے کوئی نئی داستان نہیں رہی، تب بھی اس کی جھونپڑی میں جانا نہ چھوڑا (وہ اس کو ''ہوائی جہاز'' کہتا تھا اور وہاں سے اپنی ایک کمزور آنکھ سے ٹماٹروں کی پھیلی ہوئی فصل پر نظر رکھتا تھا)۔ میں نے اس کے پاس جانا اس لیے ختم نہ کیا کہ دل ہی دل میں میں اس کو الغریب سے رابطے کا وسیلہ سمجھتا تھا، اور یہی ایک وسیلہ تھا جس سے میں واقف تھا۔ میں اب تک اس امید پر بیٹھا تھا کہ ایک نہ ایک دن الغریب سے ملاقات ہوگی، حالانکہ گرمیوں کی چھٹیاں ختم ہونے کو تھیں اور دن تیزی سے گزرتے جا رہے تھے۔ اور گو کہ میرا تجسس اور شوق بڑھتا جا رہا تھا، میری امیدیں ختم ہو چلی تھیں۔

میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ چھٹیاں ختم ہونے سے پہلے ہی میں الغریب سے ٹکرا جاؤں گا، اور یہ ملاقات کس طرح ہوگی میرے تصور میں بھی نہ آ سکتا تھا۔

۳

دوسری جنگِ عظیم اپنے عروج پر تھی، اور رومیل العالمین میں تھا۔ لوگ 'حاجی محمد ہٹلر' اور اس کے اسلام قبول کرنے کے اعلان کی باتیں کررہے تھے۔ لوگوں کا خیال تھا وہ ایک دن آپہنچے گا اور انگریزوں کو ہماری سرزمین سے نکال باہر کرے گا۔ لیکن ہمارے ضلعے میں جرائم کی دنیا ان مسائل میں الجھی ہوئی تھی جن کا تعلق نہ ہٹلر سے تھا اور نہ رومیل سے۔ ایک فوجی فرمان کے ذریعے مجرموں کو صحرائے سینا کی جیل میں منتقل کرنے کا حکم جاری کردیا گیا تھا۔ وہ لوگ جنھیں کسی دشمنی کا حساب چکانا تھا بہتان تراشی کی جنگ میں مصروف ہوگئے تھے۔ ہر ضلعے کے کمشنر اور ہر گاؤں کے مکھیا نے کینہ پرور لوگوں کی مدد سے اپنا اپنا کام تیار کرلیا تھا۔ ہر چند روز بعد ہتھکڑیاں پہنے اور زنجیروں میں گھسٹتے لوگوں کے ایک دستے کو سینا روانہ کیا جاتا۔ ان میں کچھ حقیقی مجرم ہوتے، کچھ محض منافع خور، اور کچھ بے گناہ جن کے سر جھوٹا الزام تھوپا گیا ہوتا۔

ہمارے ضلعے کی قسمت میں ایک ایسا کمشنر آیا تھا جو بادشاہ کے آدمیوں میں سے کسی کا رشتے دار تھا، جو اخبارات کی توجہ کا مرکز تھے، لہٰذا اس نے سوچا کہ فوجی فرمان کی وہ جس طرح چاہے توضیح کرسکتا ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ اس تمام کارروائی کو مناسب طریقے پر منظّم کرنے کی خود کو تکلیف دیتا، اس نے تمام مشکوک لوگوں کو منتقل کرنے کے انتظامات شروع کردیے: سینا میں نہیں بلکہ دوسری دنیا میں۔ اس نے یہ کام بڑی عمدہ سادگی سے کرنا شروع کیا جس میں نہ ہتھکڑی کی ضرورت پڑتی اور نہ آہنی زنجیروں کی۔ اگر وہ کسی مجرم یا ملزم پر ہاتھ ڈالنے میں کامیاب ہوجاتا تو بجائے جیل پہنچانے کے اسے اپنے کمرے میں بلاتا اور اس سے باتیں کرتا، چائے اور سگریٹ پیش کرتا اور اس کو پُرسکون کرنے میں کامیاب ہوجاتا۔ جب رات آتی تو وہ اس کو اپنے ساتھ فورڈ ٹرک میں سیر کی دعوت دیتا اور وہاں جھیل کے کنارے یا جھیل میں گرنے والی کسی تاریک نہر کے پاس ٹرک روک کر مہمان کو اترنے کی دعوت دیتا اور پھر چند گولیوں سے اس کا خاتمہ کرکے جھیل میں دھکیل دیتا۔ اور پھر لاش کنارے لگے یا نہ لگے اس سے کوئی فرق نہ پڑتا تھا، کیونکہ کسی نے کچھ نہ دیکھا ہوتا، اور نہ کسی کو یہ معلوم ہوتا کہ کیا ہورہا ہے، خاص طور پر حکومت کو جس نے اپنے فرمان میں اس بات پر زور نہیں دیا تھا کہ مجرم یا ملزم کو لازماً زندہ ہی رہنا ہے۔ یہ کسی بھی سرکاری تفتیش کے دائرے سے باہر تھا کہ ان آدمیوں کی

بابت ذمے داریوں کی حد مقرر کی جائے جو پولیس کی تحویل میں ہوں۔

اس بدنام سیر سپاٹے کے واقعات خطرناک حد تک بڑھ گئے اور لوگوں کے علم میں آنے لگے۔ اس طریقے کی بدولت سرگرم کمشنر اس قابل ہو گیا کہ جتنے مجرموں سے چاہے چھٹکارا حاصل کر لے، خواہ وہ کوئی بھی ہوں؛ بس اتنا کافی تھا کہ ان کا کوئی ریکارڈ رہا ہو۔ یہاں تک کہ اس کی خوں ریز مہمات پر اتنی باتیں ہونے لگیں کہ بدنام سے بدنام ڈاکو کے کارناموں پر بھی نہ ہوتی ہوں گی۔ لوگوں کی باتیں اس کے کانوں تک پہنچتیں تو وہ دل کھول کر قہقہے لگاتا، اتنی اونچی آواز میں کہ ضلعے کے صدر دفتر کی کھڑکیوں کے باہر اس کے بھاری قہقہے گونجا کرتے۔ غالباً اس کو بھی قانون نافذ کرنے کے بجائے قانون کی حدیں توڑنے میں زیادہ لذت ملتی تھی۔

ذاتی گفتگو کے دوران، یا جب وہ اپنے ماتحتوں سے بات کرتا، اسے بار بار یہ کہنے کا بہت شوق تھا کہ اب تک جو ہوا اس کی کوئی اہمیت نہیں، اور یہ کہ وہ اس وقت تک چین سے نہ بیٹھے گا جب تک الغریب ابو محمد کو ٹرک میں سیر کو نہ لے جائے؛ الغریب جو تمام زیریں مصر کا نہ سہی، ہمارے ضلعے کی جرائم کی دنیا کا مشہور سردار تھا۔ کمشنر مقامی حفاظتی اداروں کی کارگذاری سے بالکل مطمئن نہ تھا اور ہر روز ان کی نااہلی پر ان کو ڈانٹتا پھٹکارتا۔ کہا جاتا تھا کہ ان موقعوں پر وہ ایسی ناشائستہ زبان استعمال کرتا جو گھٹیا لوگ بھی نہ سوچ سکتے ہوں گے۔ ایسے شخص کے لیے جس کے محل میں روابط ہوں یہ بات کافی حیرت انگیز معلوم ہوتی تھی۔

ان تمام تدابیر کے باوجود الغریب دیہی علاقوں میں آزادانہ گھومتا رہا اور اس بات نے قانون کے اصولی نفاذ کی حد سے گزر کر کمشنر کے لیے ذاتی چیلنج کی حیثیت اختیار کر لی۔ کمشنر نے اس کارروائی میں اپنی رقمیں لگانی شروع کر دیں — یا شاید وہ اس کی ذاتی رقمیں نہ تھیں۔ چھاپے کی پیش بینی پر انعامات کا اعلان ہوا، اس نے جاسوس ملازم رکھے، اور شلابی کے ساتھ ساز باز کی جو الغریب کا دایاں بازو سمجھا جاتا تھا۔ یہ آخری چال آخر کار کامیاب ثابت ہوئی اور ایک دن مقامی لوگوں نے حیرت سے یہ خبر سنی کہ الغریب کو گرفتار کر لیا گیا ہے اور وہ اپنی تقدیر کا منتظر ہے، اور یہ کہ یہ سب کچھ شلابی کے ساتھ حکام کے جوڑ توڑ سے ہوا ہے جسے کچھ عرصہ پہلے گرفتار کیا گیا تھا۔

مزید تعجب اس وقت ہوا جب حکام نے مغرب کے وقت اعلان کیا کہ الغریب دن دہاڑے

فرار ہو گیا ہے اور وہ اس کی تلاش میں ہیں اور یہ کہ جس کسی نے بھی اس کو پناہ دی یا اس سلسلے میں کوئی معلومات چھپائیں اس کا انجام اچھا نہ ہوگا۔

مقامی لوگ اس خبر کے اثر سے باہر نہ آسکے اور کئی دنوں تک اس پر چہ میگوئیاں کرتے اور پولیس اور ڈاکوؤں کے اس کھیل کو تماش بینوں کی طرح دیکھتے رہے۔ لیکن یہ ایک خطرناک کھیل تھا، اس لیے وہ چوری چھپے اس کو دیکھتے اور خفیہ ملاقاتوں میں سرگوشیوں میں اس پر بحث کرتے۔ پڑوسی پڑوسی کو تنبیہ کرتا اور دوست دوست کو خبردار کرتا؛ وہ ایک دوسرے کو کمشنر کے چھوڑے ہوئے جاسوسوں اور مخبروں کی موجودگی کی یاددہانی کراتے جو لوگوں کی ایک ایک حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھے اور الغریب کی بو سونگھتے پھر رہے تھے۔

ہم اسکول کی لڑکے ایک رات ٹولی بنائے پل کی دیوار پر بیٹھے شکار کی اس عظیم الشان مہم پر بحث کر رہے تھے۔ ہمیں پورا یقین تھا کہ ہمارے درمیان کوئی جاسوس یا خفیہ پولیس کا آدمی نہ تھا لیکن پھر بھی ہم خوفزدہ تھے اور سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ اور جب ہم دنیا و مافیہا کو بھول کر اس قصے میں کھوئے ہوئے تھے تو ہم میں سے ایک نے تنبیہ کی، ''رات کے بھی کان ہوتے ہیں۔ اب ہمیں اپنی زبان بند کر لینی چاہیے۔'' تب ہم غفلت کی کیفیت سے نکل آئے اور خاموش ہو گئے۔

خاموشی میں سے خوف سر اٹھانے لگا۔ ہر ایک کو معلوم تھا کہ الغریب نے وہ علاقہ چھوڑا نہیں ہے اور کمشنر سے مقابلے کی تیاریاں تیز تر کر دی ہیں؛ وہ گرمیوں میں گیہوں کی لمبی لمبی بالیوں کی موجودگی سے فائدہ اٹھا رہا ہے جن کے قد آور خوشے اپنے اندر ہاتھی کو بھی چھپا سکتے ہیں۔ باتیں کرتے وقت ہمیں دونوں طرف سے خطرہ تھا: کمشنر اور اس کے مخبروں سے، اور خود الغریب کی طرف سے۔ اس بات کی کون ضمانت دے سکتا تھا کہ ہمارے منھ سے کمشنر اور اس کے مخبروں کے بارے میں یا الغریب کے بارے میں ایک لفظ نکلے، اور ہم کمشنر اور اس کے مخبروں کے عتاب کا نشانہ بن جائیں یا الغریب کو غصہ آجائے جو کہا جاتا تھا کہ ٹانگ میں چاقو اُڑس کر رکھتا ہے۔

وہاں بیٹھ کر اس موضوع پر صرف باتیں کرنا ہی ایک قسم کی دیدہ دلیری تھی جس کا نتیجہ یقیناً والدین کی جانب سے ڈانٹ پھٹکار اور مار پیٹ کی صورت میں نکلتا، کیونکہ جب سے انھیں معلوم ہوا تھا کہ الغریب کھیتوں میں چھپا ہوا ہے، اور یہ کہ وہ کبھی کبھار کھانے اور رقم کی تلاش میں نکلتا ہے، وہ ہر ایک

کی طرح شدید دہشت کا شکار تھے۔ لیکن ان کا خوف دو دھاری تلوار کی طرح تھا۔ وہ اس بات سے بھی خوفزدہ تھے کہ کہیں ان پر یہ الزام نہ لگ جائے کہ وہ الغریب کو پناہ دے رہے ہیں یا اس کی حفاظت کر رہے ہیں۔ یہاں تک کہ انھوں نے مغرب کی نماز تک باہر پڑھنا چھوڑ دی تھی اور وہ مویشیوں کو ہنکا کر سورج ڈوبنے سے پہلے ہی گھر لوٹ آتے۔ گلیاں اور کھیت کھلیان مغرب کے بعد ایک ہولناک ویرانے میں تبدیل ہو جاتے جہاں ایک پتا بھی نہ کھڑکتا، سوائے ان ڈراؤنی بکتر بند گاڑیوں کے جو چھپے ہوئے بھیڑیے کی تلاش میں رات کے ویران سایوں کے گرد چکر لگاتیں۔

چونکہ ہمارے خاموش ہوتے ہی یہ تمام خیالات طوفان کی سی تیزی سے ہمارے ذہنوں میں امنڈنے لگتے، ہم زیادہ دیر خاموش نہ رہ پاتے۔ جلد ہی کوئی نہ کوئی کچھ بول پڑتا اور دوسرے فوراً ہی شامل ہو جاتے اور ہماری کوششوں کے باوجود گفتگو وہی رخ اختیار کر لیتی۔ ایک سوال جو ہم ایک دوسرے سے پوچھتے، جو درحقیقت ہم اپنے آپ سے پوچھ رہے ہوتے تھے، یہ تھا: ''اگر الغریب تمھیں راستے میں مل جائے تو تم کیا کرو گے؟'' خوف کی ایک سرد لہر ہمارے جسموں میں دوڑ جاتی، گو کہ شاید ہم دل ہی دل میں یہ آرزو کر رہے ہوتے کہ کاش ایسا ہو جائے۔ یہ معصوم سرگوشی فوراً ہی ہمارے اندر اٹھنے والی ہزاروں آوازوں تلے دب کے رہ جاتی؛ اور پھر بزدلی کا مدافعتی عمل سر اٹھاتا اور شجاعت کی تمام گھاتوں کو اپنے قابو میں کر لیتا اور دلیری کا خیال جلد بازی، دیوانگی، یہاں تک کہ حماقت نظر آنے لگتا۔

پھر ہمارا خوف بڑھنے لگا؛ وہی خوف جس نے ہمیں پہلے وہاں اکٹھا کیا تھا جہاں ہم سل کی طرح جمے ہوئے بیٹھے تھے، اب ہماری نشست کے برخاست ہونے کا باعث بنا۔ کچھ لڑکوں نے تعداد میں پناہ ڈھونڈی اور ایک دوسرے کے ساتھ ہو لیے؛ کوئی گڑگڑا کر دوسرے سے کہنے لگا کہ گھر کے دروازے تک اس کے ساتھ چلے۔ اور باقیوں نے اس راستے سے جانے کا فیصلہ کیا جہاں آبادی تھی، مکانات تھے۔ لیکن جہاں تک میرا تعلق ہے جب میں جانے کے لیے کھڑا ہوا، تو کیا وہ کوئی پیش آگہی تھی کہ میرے ساتھ کیا واقعہ پیش آنے والا ہے، جس کی وجہ سے میں خود کو تقریباً ہلکا محسوس کرنے لگا تھا؟

۴

میں یہ قطعی طور پر تو نہیں کہہ سکتا کہ مجھے کوئی ایسی پیش آ گہی ہوئی تھی، لیکن یہ کوئی چھٹی حس، کوئی الہام وغیرہ کی کیفیت نہ تھی بلکہ کنارہ گیری کی ایک تباہ کن سی کیفیت تھی جو مجھ پر غالب آ گئی تھی اور جس کی وجہ سے میں سوچنے لگا تھا کہ حالات وہی رہیں گے چاہے اُس سے میری ملاقات ہو یا نہ ہو۔

مجھے گھر پہنچنے کے لیے ساتھیوں کے ہمراہ نہر کے کنارے والا راستہ اختیار کرنا پڑا۔ لیکن جوں ہی وہ گاؤں کی طرف مڑے، میں ان کا ساتھ چھوڑ کر ایک تنگ سی پگڈنڈی پر ہولیا جو گاؤں کے باہر سے گھوم کر جاتی تھی اور جس کے ایک طرف آبادی تھی اور دوسری طرف کھیت۔ ایک عجب بات یہ تھی کہ مجھے صرف اس وقت خوف محسوس ہوتا تھا جب میں دوسروں کے ساتھ ہوتا؛ جیسے ہی میں خود کو تنہا پاتا، خوف اچانک ہوا میں تحلیل ہو جاتا۔ لیکن پھر مجھے بے چینی گھیر لیتی، گویا خوف اس مقام پر پہنچ چکا ہو جہاں میں شعوری طور پر اس پر ردعمل نہ کر سکوں۔ لیکن پھر بھی میری تمام حسیں بیدار رہتیں، اپنی ذات کے تحفظ کے لیے ایک دم تیار۔ ایک احمقانہ طریقے سے مدھم سی آواز پر بھی میرے کان کھڑے ہو جاتے، اور میرا تپ زدہ تخیل ہر سفیدی کو عبا میں، ہر سیاہی کو سائے میں اور ہر سرسراہٹ کو لہراتے ہوئے چاقو میں بدل دیتا۔

مجھے مکئی کے کھیت کے ساتھ ساتھ چند ہی گز کا فاصلہ طے کرنا تھا، اس کے بعد میں گندم کی چھوٹی بالیوں والے کھیت تک پہنچ جاتا جہاں کسی کے چھپنے کی گنجائش نہ تھی، اور وہ راستہ میرے لیے اطمینان بخش ہوتا۔ رات کے اندھیرے میں کھردری سطح اور بلیڈ کی دھار جیسے تیز کناروں والے مکئی کے پتے آپس میں سرسراتے، چہرے کو چھوتے، ہاتھوں کو زخمی کرتے؛ لیکن میں اپنی رفتار کم نہ کر سکتا تھا، اس خوف سے کہ آنے والا لمحہ اپنے ساتھ نہ معلوم کیا افتاد لائے۔ تب میں نے اپنے پیچھے ایک آواز سنی۔ پہلے مجھے لگا کہ کتا بھونک رہا ہے، لیکن نہیں، وہ ایک آواز تھی: ”لڑکے!“

حکم تھا کسی انسان کا۔ میں نے ایک قدم آگے بڑھایا۔ اس دفعہ سرسراتے پتوں اور جھینگروں کی مسلسل ٹرٹر کو خاموش کرتی ہوئی وہ آواز صاف سنائی دی۔

”لڑکے!“

یہ تحکمانہ اور بریدہ آواز میرے احساسات کو چیر گئی۔ اور پھر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے کانوں میں کھولتا ہوا پانی انڈیل دیا گیا ہو: مجھے بے دست و پا ہونے کا جلتا ہوا احساس ہوا، کہ نہ میں کچھ سن سکتا ہوں نہ ہل سکتا ہوں اور نہ سانس لے سکتا ہوں۔ لیکن ایک خیال میرے ذہن میں ہتھوڑے کی طرح برسنے لگا: ''یہ واقعہ ہو گیا ہے... ہو گیا ہے... ہو گیا ہے...''

اس میں صرف ایک لحہ لگا، لیکن بعد میں بیٹھ کر اسے منطقی طریقے سے پرکھنے اور غور کرنے پر گھنٹوں صرف ہوئے ہوں گے، کہ میں بھاگا نہیں، گو کہ میں آسانی سے ایسا کر سکتا تھا۔ میں نے اپنے خشک ہوتے ہوئے گلے سے نکلنے والی چیخ کو بمشکل دبایا، سانس روک لی اور خوفزدہ جھٹکے سے اچانک پیچھے مڑا۔ اور جب میں بولا تو میری نوبالغ آواز کے مہین بھاری پن نے کم و بیش مرد کا سا درشت لہجہ اپنا لیا:

''ہاں، کیا چاہتے ہو؟''

''بیٹے، خوفزدہ مت ہو۔''

کیا یہ ایک معقول تجویز تھی؟ کیا ایسا ممکن ہے کہ کسی حکم کی تعمیل میں ــــ اگر وہ کسی مخصوص شخص کی طرف سے آئے ــــ تم واقعتاً خود کو خوف سے آزاد پاؤ؟ اگر نہیں تو میں نے اس موقعے پر کس طرح اپنے خوف پر قابو پایا؟ میرا جسم کانپ رہا تھا لیکن اس کے ساتھ دوسری کیفیات نہ تھیں، گویا خوف میرے ذہن، میرے دل سے نکل کر ٹانگوں میں چلا گیا ہو۔

میری پہلی کوشش یہ تھی کہ اپنی قوتِ ارادی سے خوف کے اس بے ارادہ اظہار پر قابو پا سکوں۔ لیکن میں جتنی کوشش کرتا اتنے ہی غضبناک طور پر میری کپکپاہٹ میں اضافہ ہو جاتا۔ مجھے صرف ایک بات کا علم تھا کہ مجھے اپنا خوف ہرگز اس پر ظاہر نہیں ہونے دینا ہے۔ اور غیر متوقع طور پر میرے منہ سے، بے اختیار، ایک سوال نکلا۔ اس کے پیچھے صرف یہ خیال کارفرما تھا کہ کسی طرح میرے دانت بجنا بند ہو جائیں اور میرے گھٹنے بے جان ہو کے نہ رہ جائیں؛ کسی طرح، کسی بھی قیمت پر، اگلے چند لمحے گزر جائیں۔ مجھے یہ خیال تھا کہ اگر ایسا ہو گیا تو میں اپنے حواس پر قابو پانے میں کامیاب ہو جاؤں گا اور مناسب طرزِ عمل اختیار کر سکوں گا۔

''کون ہے؟''

میں نے زوردار آواز میں پوچھا، ایسی آواز میں جو کمشنر یا الغریب خود نکالتا اگر ان کی اچانک یوں مڈبھیڑ ہوئی ہوتی۔ اور پھر تیزی سے، اس سے پیشتر کہ میرے دانت پھر بجنے لگیں، میں نے اپنا سوال دہرایا۔

''کون ہو تم؟''

اور جواب آیا۔ اس وقت تک مجھے یقین نہ تھا کہ وہ آواز میری پشت سے آئی ہے، یا میرے سامنے سے، یا زمین کی تہوں سے نکلی ہے۔

''میں ایک اجنبی ہوں، غریب۔''

ایک ایسے خوفزدہ آدمی کی طرح جو اندھا دھند گولیاں چلاتا ہے یہاں تک کہ گولیاں ختم ہو جاتی ہیں، میں یکدم پھر بول پڑا۔ میں کہنے والا تھا، ''غریب، یا الغریب؟'' لیکن میں نے یہ سوال منہ سے نکلنے سے پیشتر ہی روک لیا۔ اور بولا:

''تم ہو؟ تم یہ لڑکے کیا چیخ رہے ہو؟ سلام کیوں نہیں کرتے؟ دوست؟ تم خوش آمدید کیوں نہیں کہتے؟''

میرا اسلحہ ختم ہو چکا تھا اور میں چپ ہو گیا۔ اس آواز نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں اب بہرا نہ رہا تھا۔ رات کی آوازیں مجھے سنائی دینے لگی تھیں اور میری سانس ہموار ہو گئی تھی۔ میں سوچنے لگا کہ دم دبا کر بھاگوں، یا مدد کے لیے پکاروں۔ لیکن مجھے معلوم تھا کہ میں ایسی کوئی حرکت نہ کروں گا، اور یہ کہ اگر میں چاہوں بھی تو اپنی جگہ سے ایک انچ نہیں سرک سکتا۔ مجھے لگا کہ خاموشی بے حد طویل ہو گئی ہے، اور میں نے سوچا کہ سب کچھ ختم ہوا اور جس کی آواز آئی تھی وہ جا چکا ہے۔ لیکن پھر مجھے یقین ہو گیا کہ دو مخفی آنکھیں میرا معائنہ کر رہی ہیں، اور یہ کہ میری کم عمری اور میری ذہنی کیفیت کا پتا چلا لیا گیا ہے۔ یہ میرے لیے سچائی کا لمحہ تھا؛ اور اس خیال نے مجھے کیسا مضطرب کیا جب میں وہاں ننگے پاؤں اور ننگے سر کھڑا تھا، ایک ایسے آسمان کے نیچے جس کا سرد چاند آہستہ آہستہ معدوم ہو رہا تھا اور پھیلتی ہوئی تاریکی میرا دم گھونٹے دیتی تھی۔ میں اپنے مقام پر کھڑا ہوا تھا اور وہ نظر نہ آنے والی آنکھیں گھنی جھاڑیوں کے اندر سے میرا اچھی طرح جائزہ لے رہی تھیں۔ یہ دہشت نہ تھی جس نے مجھے بے جان کر دیا تھا بلکہ دہشت کے بعد آنے والی تباہی تھی، وہی کیفیت جو چوہے کو چوہے دان کے اندر مردے کی طرح

ساکت رکھتی ہے یہاں تک کہ اگر چوہے دان کھل بھی جائے تو وہ وہیں دبکا پڑا رہے۔

اس تاریکی میں سے جو جھاڑیوں کے سایوں کے باعث ملائم پڑ چکی تھی، میں نے ایک قہقہہ سنا۔ وہ ایسا قہقہہ نہ تھا جس کو پرکھا جا سکے: اصل کے مقابلے میں وہ تسبیح کا صرف ایک دانہ تھا، پانی کی ایک ننھی سی بوند تھی، تھان کی ایک دھجی تھی جو سیلز مین گاہک کو بطور نمونے کے دیتا ہے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اس قہقہے نے مجھے غصہ دلا دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کر رہا ہوں، لیکن میں خاموش رہا۔

''تمھارا باپ کون ہے، میرے چاند؟''

اس سوال نے مجھے بھڑ کی طرح کاٹ کھایا۔ لیکن میں حیران کن طور پر پُرسکون رہا۔ میرا جواب سن کر اس نے بولنا شروع کیا: ''تمھارا باپ نیک آدمی ہے...'' لیکن میں نے باقی جملہ نہ سنا۔ جھاڑیوں میں سرسراہٹ ہوئی اور ان میں سے ایک دبلے پتلے جسم کی عورت نمودار ہوئی۔ اس نے سیاہ لبادہ پہن رکھا تھا، سر پر اوڑھنی تھی، اور وہ ایک بڑی سی چادر میں لپٹی ہوئی تھی جس کا سنہرا کنارہ چاند کی زرد روشنی میں ہلکے سے چمکا۔

۵

کچھ لوگ شاید سوچیں کہ اس لباس میں وہ کسی حقیر یا مضحک شے میں بدل گیا ہوگا۔ لیکن حقیقت اس کے برعکس تھی۔ میں نے اپنے جسم کا ایک ایک رواں کھڑا ہوتا ہوا محسوس کیا اور میری کھوپڑی میں سنسناہٹ دوڑ گئی جب میں نے دیکھا کہ الغریب — بدنامِ زمانہ قاتل جس نے صوبے بھر میں آفت ڈھا رکھی تھی — ایک سیاہ لباس میں خود کو ایک عورت کی چادر میں لپٹے ہوئے ہے۔ شر اپنی مروجہ صورت میں بھی خوف پیدا کرتا ہے، لیکن جب وہ کسی حقیر شے کا روپ دھار لے مثلاً درختوں کے نیچے اگنے والی خودرو جڑی بوٹیوں کا، تو وہ اَور منحوس اور خوفناک ہو جاتا ہے، اَور زیادہ دہشت کو جنم دیتا ہے۔

اس نے میری جانب چند قدم اٹھائے اور میرے اندر کی آواز کہتی رہی، ''بھاگو!'' لیکن اچانک وہ بیٹھ گیا اور مجھے بھی بیٹھنے کی دعوت دی۔ میں بیٹھ گیا لیکن سوچ سوچ کے اور کچھ زیادہ آہستگی سے۔ نہر کا

کنارہ بیٹھنے کے لیے اتنی آرام دہ جگہ نہ تھی، لیکن مجھے الغریب کے ارادے کی زیادہ فکر تھی۔ جہاں تک مجھے علم تھا وہ لوگوں سے صرف اُس وقت ملتا تھا جب اسے رقم درکار ہوتی یا وہ انھیں قتل کرنے جا رہا ہوتا۔ لٰہذا میں حیران ہوا کہ وہ مجھ سے کیا چاہتا ہے، کیونکہ اس نے مجھے ابھی تک ختم نہیں کیا تھا اور نہ ہی وہ سوچ سکتا ہوگا کہ میرے پاس کوئی رقم ہے۔

میں کچھ کہے بغیر بیٹھ گیا۔ میں بات کرنا چاہتا تھا، لیکن فطری احتیاط نے مجھے بولنے سے باز رکھا۔ وہ احتیاط جو اس وقت آڑے آتی ہے جب ہمیں سامنے والے کی نیت کا پتا نہیں ہوتا۔ اس لمحے تک مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میں نے اسے صحیح طور پر دیکھا بھی نہیں، گو کہ مجھے اپنے پہلو میں اس کی موجودگی کا علم پوری شدت سے تھا۔ وہ ناقابلِ تسخیر معلوم ہوتا تھا، کہانیوں اور روایتوں کے جال کے اندر محفوظ جو ایک طویل عرصے میں اس کی ذات کے اردگرد بُنا جا چکا تھا: اس کے ہاتھوں قتل ہونے والوں کی کہانیاں، خود اس کے تعاقب کے قصے، شکاری اور شکار، ایک دلیر سرغنہ اور اشتہاری مجرم کی متضاد تصویر۔ ان تمام کہانیوں کے باوجود، یا غالباً انھی کی وجہ سے، میں اس کو دیکھ نہ سکا۔ عورت کے لباس نے اس مسئلے کو مزید الجھا دیا تھا؛ یہ لباس اس شخص تک رسائی پانے میں جس کی تصویر میرے ذہن میں تھی، ایک حقیقی رکاوٹ بن گیا تھا۔ اور مجھے محسوس ہوا جیسے وہ وہاں ہے بھی اور نہیں بھی ہے۔ اس کے وجود اور آواز کے اردگرد ایک سراب کا ہالہ لپٹا ہوا تھا۔

مجھے محسوس ہوا کہ یہ سیاہ ہیولا جو میرے پہلو میں بیٹھا ہے، میرے تخیل کے دیو پیکر شخص کا صرف سایہ ہے، اور وہ خود گندم کی بالیوں میں چھپا بیٹھا ہے؛ یا یہ کہ لبادہ خالی ہے اور الغریب اس لباس کے اندر پارے کے ایک ذرّے بھر سے زیادہ نہیں جس کو چھونا اور پکڑنا ناممکن ہے۔

اس نے جیب سے سگریٹ کا ڈبا نکالا، یا میں نے امید کی کہ اس نے یہی کیا ہوگا، کیونکہ وہ جب بھی جنبش کرتا، میں اپنی جگہ سے اچھل پڑتا، اس خوف سے کہ شاید وہ ٹانگ سے چاقو نکال کر میرے سینے میں پیوست کرنے جا رہا ہے۔

"سگریٹ پیو گے؟"

"نہیں، بہت شکریہ۔"

اُن دنوں میں چوری چھپے سگریٹ پینے لگا تھا، دن بھر میں ایک یا دو، لیکن میں نے بناوٹی نرمی

سے کہا، ''میں سگریٹ نہیں پیتا۔''

اس نے میرا مذاق اڑاتے ہوئے سر ہلایا۔ ''اوہ، ہاں۔ تم پیتے ہو۔ چلو بھی، ایک لے لو۔''

میں نے یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ وہ کچھ زیادہ ہی چالاک ہے، کہا، ''اگر تم اس سے خوش ہوتے ہو تو لاؤ، میں ایک سگریٹ پی لیتا ہوں۔''

اس نے مجھے سگریٹ تھمایا، دیا سلائی بھڑکائی اور میرے سامنے کی۔

میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ میں سگریٹ جلانے میں پہل نہ کرتا، لیکن اس کا پہلا ردِعمل یہ تھا کہ اس نے دیا سلائی بجھادی۔ پھر وہ اپنا چہرہ میرے چہرے کے قریب لایا، چادر کو تھوڑا سا اوپر کیا تا کہ اپنے منھ میں دبا ہوا سگریٹ سلگا سکے، اور پھر دوسری دیا سلائی جلائی۔ ہم دونوں قریب سمٹ آئے تا کہ دیا سلائی بجھنے نہ پائے۔ جلتی ہوئی دیا سلائی نے میرے اور اس کے درمیان کی جگہ کو روشن کر دیا۔ اور خدا معاف کرے، وہاں اس کا چہرہ تھا — ایک عفریت کا چہرہ۔ اس کی بادامی آنکھیں حیرت انگیز طور پر بڑی معلوم ہو رہی تھیں۔ وہ چادر میں لپٹا ہوا ایک شیطانی بھیڑ کی طرح لگ رہا تھا۔

سگریٹ میرے منھ سے نکل کر گر پڑا۔ اس دفعہ میں حقیقتاً ڈر گیا تھا۔ اور مجھے یوں لگا کہ جو خوف مجھے پہلے محسوس ہوا تھا، وہ محض بیماری سے پہلے آنے والی جمائیاں تھیں: اور جس لمحے میں نے اس کے چہرے کو دیکھا، اس وقت ہڈیوں کو منجمد کرنے والا خوف کا بخار اصل بیماری تھی۔

لیکن بعض موقعوں پر انسان کتنی حیرت انگیز اہلیت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اگر میں فطری ردِعمل کرتا تو دہشت سے میرا سر گھوم جاتا اور میں مڑ کر تیزی سے بھاگ کھڑا ہوتا، یہاں تک کہ میں گر جاتا یا وہ مجھے آلیتا۔ لیکن میں اس وقت درحقیقت خود پر قابو پانے کے خوف کے شدید احساس میں گھرا ہوا اس کے پہلو میں بیٹھا رہ گیا۔ میں نے تیز دیسی سگریٹ کے کش لیے جو اس نے مجھے دیا تھا، اور میرا سر گھوم گیا کیونکہ میں سگریٹ نوشی کا، خاص طور پر کش اندر کھینچنے کا، عادی نہ تھا۔

میں نے اس کے سوالوں کے جواب پُر یقین لہجے میں دیے؛ یا کم از کم سچی، بے باکانہ کوشش کی کہ میں پُراعتماد لگوں، اور اس کوشش میں زیادہ تر کامیاب رہا۔ میرے جوابات واضح، معقول اور تقریباً فطری نکلے۔ اس نے پوچھا، میرا گھر اس مقام سے کس طرف اور کتنی دور ہے جہاں ہم بیٹھے ہیں؛ میں کہاں گیا تھا؛ کس کے ساتھ تھا؛ میں نے اپنے ساتھیوں سے کیا باتیں کیں اور انھوں نے کیا کہا؛ اور

لوگ اس کے متعلق کیا باتیں کرتے ہیں۔ ان عجیب وغریب حالات میں بھی جن میں میں گھرا ہوا تھا، میں یہ بات محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا کہ وہ یہ تمام باتیں سن کر بچوں کی طرح خوش ہو رہا ہے، قطع نظر اس سے کہ اس کے بارے میں لوگوں کی بعض باتیں بالکل معمولی تھیں۔ کچھ باتیں میں نے خود گھڑ لیں، بہت آسانی کے ساتھ، کہ میں اس کو خوش کرنے کی فکر میں تھا: میں نے اس کی شخصیت اس کے سامنے ایک محدّب عدسے میں رکھ کر پیش کی جس کی وجہ سے اس کا قد دگنا ہو گیا اور اس کے دلیرانہ کارنامے اتنے بڑھا چڑھا کر سنائے کہ وہ کسی بلند مینار کی طرح، یا کسی وسیع وعریض میدان میں کھجور کے درخت کی طرح، ایستادہ نظر آنے لگا۔

سگریٹ کے آخری کش لیتے ہوئے مجھے اس بات کا شدت سے احساس ہوا کہ میں اس کو بتانا چاہتا ہوں کہ میں نے کتنی دفعہ اس سے ملاقات کرنے کی کوشش کی ہے، اور یہ کہ سیّد خلیل، جس کا ''ہوائی جہاز'' وہاں سے دور نہ تھا، میرا گواہ ہے۔ میں جھجکا، کیونکہ مجھے ڈر تھا کہ کہیں میں یہ بات اس طرح نہ کہہ بیٹھوں کہ اسے غصہ آجائے۔ اور مجھے سب سے زیادہ یہ فکر تھی کہ اس وقت کوئی جملہ میرے منھ سے ایسا نہ نکل جائے، کوئی حرکت ایسی نہ ہو جائے، جو اسے ناگوار معلوم ہو۔ مجھے لگتا تھا کہ غالباً وہ اچانک، بغیر کسی وجہ کے، غصے میں آسکتا ہے، گویا میں مجرموں اور دیوانوں کے رویے کو ایک سا سمجھتا تھا۔ لیکن پھر یہ تمام مفروضات میرے ذہن سے نکل گئے اور میں ہر شے سے بے نیاز ہو گیا، سوائے ان چمٹیوں کے جو میرے کان سے آچمٹیں جیسے ہی میں سگریٹ کا ٹوٹا زمین میں مسل کر بجھانے کے لیے جھکا۔

انگلیاں۔ اگر وہ انگلیاں تھیں تو یقیناً ان کے جوڑ آہنی تھے جن کے اوپر کھال منڈھی ہوئی تھی، جو وقت گزرنے کے ساتھ خشک اور سخت ہو چکی تھی۔ مجھے محسوس ہوا جیسے میرا چہرہ لال بھبھوکا ہو گیا ہو۔ لیکن ساتھ ہی مجھے احساس تھا کہ یہ مذاق کے روپ میں ایک تنبیہ ہے۔ چادر کے پیچھے سے، جو دوبارہ اپنے مقام پر، مرغ کی کلغی کی طرح ٹک گئی تھی، ایک آواز آئی:

''تم سگریٹ کیوں پیتے ہو؟ کیا یہ غلط کام نہیں؟''

میں نے اپنی چیخ کو روکا۔ میں کچھ زیادہ ہی خوفزدہ تھا، اور شاید یہ سمجھتا تھا کہ آواز نہ نکالنا مردانگی ہے۔ لیکن درحقیقت یہ خوف ہی تھا جس کی وجہ سے میں نے اپنا منھ بند رکھا۔ جب اس نے پوچھا، کیا میں بھی اپنے باپ کی طرح نمازیں پڑھتا ہوں، جس کی پرہیزگاری کا شہرہ ہے، اور جب اس کی انگلیوں

کا دباؤ بڑھا تو میں بولا، ''نہیں۔''

اس نے اور زور سے میرے کان کھینچے اور ایک سوال، خاموش دہکتے ہوئے انگارے کی طرح، میرے کان میں اتر گیا: ''کیوں؟''

اور میں نے کہا، ''پڑھوں گا، پڑھوں گا نمازیں۔'' اور مجھے محسوس ہوا کہ میرا جسم ٹھنڈا ہو رہا ہے اور اس میں جان واپس آ رہی ہے۔ میں نے ابھی آزادی سے ایک سانس کھینچا ہی تھا کہ اپنی پشت پر ایک ہاتھ، سوجے ہوئے گوشت پر قصائی کے بغدے کی طرح، پڑتا ہوا محسوس کیا۔

''نہیں۔ مجھے یہ کہنا پڑے گا کہ تم بہادر لڑکے ہو۔ تم اپنے باپ کے فخر کا باعث بنو گے۔ اگر تم ڈر جاتے تو میں تمھیں زمین میں پیاز کی طرح گاڑ دیتا۔ اٹھو!''

میں کیا کر سکتا تھا؟ کھڑا ہو گیا۔

''ادھر آؤ!''

میں آگے بڑھا۔

''سنو!''

میں نے اپنا کان، جو رات کی تاریکی میں انگارے کی طرح جل رہا تھا، آگے بڑھایا۔ الغریب ابو محمد نے تھوڑا سا کھنکھار کر گلا صاف کیا، اور کہا، ''میں بھوکا ہوں، بیٹے۔''

میں قسم کھاتا ہوں کہ میرا دل اتنا ہلکا کبھی نہ محسوس ہوا ہو گا جتنا یہ الفاظ سن کر ہوا۔ یہ الفاظ جنھوں نے رات کے تمام خوف اور اندیشے بھگا دیے اور میری روح میں اتر گئے۔ یہ الفاظ میرے اندر گونجنے لگے، اور عجب خوشگوار لہریں حرکت کرنے لگیں — محبت اور نیکی کی، اور قربانی کی ایک بھرپور آرزو کی، جس کی سب سے آسان قسم بلاشبہ ذاتی قربانی ہے۔ تقریباً سرگوشی میں میں نے کہا، ''تم کیا کھانا پسند کرو گے؟''

''کچھ بھی۔ اور اگر تم لا سکو تو میرے لیے سگریٹ، ایک ٹارچ، اور پانی کی صراحی لیتے آنا۔''

میں بھاگنے کے لیے مڑا، لیکن اپنی جگہ سے ہلا نہیں، کیونکہ اس نے اپنی خوفناک انگلیوں سے میرے جلابیے کا کنارہ پکڑ لیا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا؛ اس کی چادر اوپر اٹھی ہوئی تھی۔

''مرد کی زبان دیتے ہو؟''

میں خاموش رہا اور میرا منھ برا سا بن گیا کیونکہ مجھے یوں لگا جیسے وہ میری توہین کررہا ہو۔ شاید میرے زرد، برانگیختہ چہرے پر پڑتی ہوئی چاندنی نے اسے احساس دلایا کہ میں جذبات سے بے قابو ہو رہا ہوں اور رو پڑوں گا۔ اس نے میرا دامن چھوڑ دیا۔ لیکن پھر بھی میں اسی جگہ جما رہا، خاموش، کچھ کہنے سے قاصر؛ اگرچہ میں اس سے اتنی ڈھیر ساری باتیں کہنا چاہتا تھا لیکن جھجک رہا تھا کہ کیسے کہوں، غالباً ان باتوں کو الفاظ میں ڈھال بھی نہ سکتا تھا۔ اور مجھے اس بات کا احساس تھا کہ اس کی درخواست پر جوش اور ولولے کی جو لہر میرے اندر اٹھی تھی وہ اب ختم ہو رہی تھی، اور میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ میں جا کر اپنے باپ کو جگا سکتا ہوں اور رات کے محافظ، اور گاؤں کے مکھیا کو ہوشیار کرسکتا ہوں، اور ہم سب جا کر اسے پکڑ سکتے ہیں۔

میں وہیں کھڑا رہا، یہاں تک کہ وہ بولا:

''جاؤ... جاؤ اب۔''

''کیا تمھیں اس بات کا خوف نہیں ہے کہ میں کیا کر بیٹھوں؟''

ایک پرسکون اور باضبط سرگوشی میں، جو میری ہڈیوں کے گودے میں اترتی چلی گئی، اس نے حکم دیا: ''جاؤ!'' اور میں بوکھلاہٹ میں راستہ ٹٹولتا ہوا گھر کی طرف چل پڑا۔

٦

کون سوچ سکتا ہے کہ میں جان بچا کر فرار ہونے کے بعد دوبارہ اس کے پاس گیا ہوں گا؟ اور کون یقین کرسکتا ہے کہ ہم دونوں کے درمیان ایک پائیدار تعلق قائم ہو گیا ہو گا؟ وہ مجھ پر اتنا بھروسا کرنے لگا کہ اس نے مجھے اپنی نوجوان بیوی وَردہ کی ذمے داری سونپ دی، اور اس جیسی حسین اور نازک عورت میں نے اپنی زندگی میں نہ دیکھی تھی۔

انسان ہی ایسی مخلوق ہو سکتا ہے جو جان بوجھ کر خطرے میں کود پڑے اور اسے دلیری کا نام دے، اور جانوروں کی طرح جبلی طور پر اس سے پیچھے ہٹنے کے بجائے، اس کو عظمت سمجھے۔ ورنہ دنیا کی کوئی طاقت مجھے دوبارہ کھینچ کر اس مقام پر نہ لے جا سکتی تھی جہاں میں نے الغریب کو آخری بار دیکھا

تھا، وہ تمام کھانے پینے کا سامان لیے جو گھر میں میرے ہاتھ لگ سکا تھا، اور پانی کی وہ صراحی جو میرے باپ کے لیے مخصوص تھی اور جسے ہاتھ لگانے کی ہم میں سے کوئی جرأت نہ کرتا تھا۔

یہ میری الغریب سے پہلی ملاقات کی کہانی تھی؛ اور یہ آخری ملاقات ثابت نہ ہوئی۔ کئی دنوں تک میں اس سے برابر ملتا رہا؛ اسے کھانا پانی اور ضرورت کی چھوٹی موٹی چیزیں پہنچاتا رہا جو اسے مکمل طور پر چھپے رہنے کے لیے درکار تھیں۔ یہ کوئی آسان کام نہ تھا، کیونکہ گاؤں میں کھانا خریدا نہ جا سکتا تھا، اور گھر سے کچھ حاصل کرنے کے لیے مجھے کافی ترکیبیں سوچنی پڑتیں، اور باقی کھانا رشتے داروں کے گھروں سے حاصل کرنے کے لیے معقول توجیہات تلاش کرنا پڑتیں۔

شروع میں الغریب نے میرے ساتھ محتاط رویہ رکھا۔ کبھی ایسا نہ ہوا کہ میں اس کے لیے کھانا لے کر گیا ہوں اور اسے اس جگہ پایا ہو جہاں ہم نے ملاقات طے کی تھی۔ وہ جگہ ہمیشہ خالی ہوتی۔ اور میں وہاں شکوک وشبہات اور خوف کے درمیان گھرا، مضطرب کھڑا رہتا، یہاں تک کہ وہ، یہ یقین کرنے کے بعد کہ میں تنہا ہوں، کسی خفیہ جگہ سے نمودار ہو جاتا۔ میں ہمیشہ اس سے رات میں ملتا، مغرب اور عشا کے درمیان۔ میری کم عمری اور ہمارے تعلق کے غیر فطری پن کے باوجود اس نے کبھی مجھ سے یہ نہ کہا کہ جو کچھ ہمارے درمیان ہے، اس کو راز رکھوں۔ یہ کہنا بے کار ہے کہ میں یہ راز افشا کرنے سے پہلے ہی مر جانا پسند کرتا۔ وہ دن کتنے خوشگوار تھے جب میں الغریب کے راز کا رکھوالا تھا، اور باہر کی دنیا سے اس کا تنہا واسطہ۔

مجھے تمام وقت اس بات کا احساس رہتا تھا کہ بالآخر ایک ایسے طریقے سے جو میرے تصور میں بھی نہ آ سکتا تھا، میں اس دنیا میں داخل ہو گیا ہوں جس کے ہمیشہ خواب دیکھتا رہا تھا۔ جب ہم ساتھ کھانا کھاتے، یا معمول سے زیادہ دیر تک بیٹھ کر باتیں کرتے، تو مجھے کتنی خوشی ہوتی تھی۔ زیادہ تر باتیں میں کرتا اور الغریب کو اپنی باتیں جاری رکھنے کی ہمت افزائی یا باتوں کے بہاؤ کو کسی سوال سے روکنے کا کام سونپ دیتا۔ لیکن میری زندگی کے غیر معمولی واقعات کتنے معمولی نظر آتے تھے مجھے، جب میں انھیں اس شخص کے سامنے دہراتا؛ اہم لڑائیاں اور جھگڑے کتنے غیر اہم ہو جاتے جب میں انھیں اس شخص کو سناتا جو بات بے بات قتل کرنے کے لیے مشہور تھا۔

یہ کئی ملاقاتوں اور طویل نشستوں کے بعد ہوا کہ میں نے اسے سچ مچ بھرپور طریقے سے دیکھا اور اس کے خدوخال سے بخوبی واقف ہوا۔ سب سے عجیب و غریب اس کے چہرے پر پھیلی نمایاں سیاہ گھنی مونچھیں تھیں جن میں چند ایک سفید بال نمودار ہو چلے تھے۔ اس کی ناک پتلی اور ستواں تھی، اور آنکھیں چھوٹی چھوٹی، جن کے پپوٹے سرخ تھے اور پلکیں کچھ جھڑ چکی تھیں۔ اس کے ہاتھ عجیب تھے: سخت اور کھردرے، اور اُس وقت جو میرے ہاتھ تھے ان سے بھی چھوٹے، اور چھوٹی چھوٹی انگلیاں۔ اور اس کی چپلیں اتنی چھوٹی تھیں گویا کسی چھوٹے لڑکے یا لڑکی کی ہوں، اور مجھے یاد ہے کہ میں نے اس پر غور کیا تھا کہ اس کا قد مجھ سے زیادہ نہ تھا؛ غالباً کم ہی تھا۔ جب وہ ہنستا، اس کی عادت تھی کہ قہقہے کے آخر میں ایک کھنکھار شامل کر لیتا؛ شاید وہ اس طرح اپنے قہقہے میں درشتی پیدا کرنا چاہتا تھا۔

کئی راتوں کے بعد میرا اور اس کا تعلق اس مقام پر پہنچ گیا جہاں میں نے محسوس کیا کہ میں اب اس سے ایک ایسا سوال کر سکتا ہوں جو بقول اس کے کوئی ''بچہ''، میرے جیسا، یا کوئی دیوانہ ہی پوچھ سکتا ہے: اس نے ایک عام، خدا کا خوف رکھنے والے بندے کے بجائے ایک بدنام قاتل بننا کیوں منتخب کیا؟ وہ ہنسا، کھنکھارا، اور بولا، ''یہ کس قسم کا سوال ہوا؟ کوئی اور سوال کرو۔''

لیکن میں ایک شرارتی طریقے سے، گویا اپنے باپ سے چھیڑ چھاڑ کر رہا ہوں، اس پر بضد رہا کہ وہ میرے اس سوال کا جواب دے۔ وہ سنجیدہ ہو گیا، جیسے دور کہیں گم ہو گیا ہو، اتنی دیر تک کے لیے کہ مجھے اندیشہ ہونے لگا کہ وہ میرے سوال کا جواب دینے کی کوشش کے بجائے کسی آواز کے رخ کو متعین کرنے میں مصروف ہو گیا ہے۔ پھر اس نے کہا، ''سچ تو یہ ہے کہ میں خود بھی نہیں جانتا۔ ہر بار قتل کرو یا خود قتل ہو جاؤ والا مسئلہ رہتا ہے۔''

مجھے اسی وقت یہ احساس ہونے لگا تھا کہ ان گمبھیر الفاظ کے ساتھ ہی اس نے تاریکی کی دنیا کے راز مجھ پر آشکار کرنے شروع کر دیے ہیں۔ جوش کے مارے میرے سانس رکنے لگی۔ میں نے پوچھا:

''قتل کرو یا خود قتل ہو جاؤ؟ اس کا کیا مطلب ہوا؟''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر میں قتل نہ کرتا تو وہ شخص مجھے قتل کر دیتا۔ لہٰذا میں نے اسے قتل کر دیا۔''

''اور ہمیشہ اسی طرح ہوا؟''

''ہمیشہ۔''

''پہلی دفعہ بھی؟''

وہ خاموش رہا اور دوبارہ سنجیدہ ہو گیا۔ پھر اس نے کہا، ''نہیں۔ پہلی دفعہ بہت مشکل ہوتا ہے۔ میں کسی کے لیے کھیت میں کام کرتا تھا۔ اس نے میرے پیسے دبا لیے۔ میں تین دفعہ اس سے اپنی اجرت لینے گیا لیکن اس نے مجھے پیسے نہ دیے۔ لوگوں نے مجھ سے کہا، حکام کو اطلاع دو۔ میں نے ایسا ہی کیا؛ اور انھوں نے مجھے جیل میں ڈال دیا اور پیٹا! جب میں اندر تھا تو میں نے فیصلہ کر لیا کہ اسے جان سے مار ڈالوں گا؛ اور جس دن میں باہر آیا، میں نے اپنی واحد بھینس بیچ کر ایک پستول خرید لیا اور اس کے گھر کے سامنے اسے گولی مار دی۔ مجھ سے پوچھ گچھ ہوئی لیکن کوئی کچھ ثابت نہ کر سکا۔ لہٰذا اس کے خاندان نے مجھ سے بدلہ لینے کے لیے کسی کو مجھے قتل کرنے پر مامور کر دیا۔ کیا میں اس انتظار میں بیٹھا رہتا کہ وہ کب مجھے قتل کرے؟ میں نے اسے قتل کر دیا۔ اور بس۔ تب سے میں یہی کر رہا ہوں۔''

''لیکن... میرا مطلب ہے... وہ آدمی... جب تم نے اسے قتل کیا، کیا تم غصے میں نہیں تھے؟''

''ہاں میں غصے میں تھا۔ میں ایک ماہ بغیر کچھ کھائے پیے بیٹھا رہا۔ میں بیمار پڑ گیا تھا اور جس چیز نے مجھے صحت یاب کیا وہ یہ خبر تھی کہ اس کے گھر والوں نے مجھے قتل کرنے کے لیے کسی کو لگا دیا ہے۔''

وہ اچانک خاموش ہو گیا، اور میں مضطرب ہونے لگا۔ پھر وہ میری طرف مڑا اور تیزی سے بولا:

''تم یہ سب کیوں جاننا چاہتے ہو؟''

''بات یہ ہے کہ میں کسی کو قتل کرنا چاہتا ہوں۔''

وہ ہنسنے لگا، یہاں تک کہ اس کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔

''کس کو قتل کرنا ہے؟ مجھے بتاؤ، میں کر دوں گا اسے قتل، تمھارے لیے۔''

''کوئی مخصوص شخص نہیں، کوئی بھی ہو۔''

''کوئی بھی؟ کیا مطلب ہے تمھارا، کوئی بھی ہو؟''

''کوئی بھی۔''

اسے یہ سمجھانا بہت مشکل تھا کہ میں کیا چاہتا ہوں؛ میری خفیہ آرزو کی تفصیل اور میرے لیے اس آرزو کی کشش، اس کی طاقت۔ کس طرح اس خواہش نے سیّد خلیل کے چکر لگوائے، اور کس طرح

میں الغریب سے ملنے کا مدت سے آرزومند تھا؛ اور کسی کو آج تک یہ بتانے کی ہمت نہ کر سکا تھا— صرف اسے بتا رہا ہوں۔ الغریب نے مجھے آنکھوں کے کونوں سے دیکھا اور میں نے محسوس کیا کہ اس وقت اس کی آنکھیں بھیگ سی گئیں۔

''کیا تم سنجیدہ ہو؟''

''یقیناً، ورنہ مجھے کیا ضرورت تھی کہ تم سے اس موضوع پر بات کرتا؟''

''تم کیوں مجھ سے بات کر رہے ہو؟''

''تا کہ تم مجھے قتل کرنا سکھا دو۔''

دوبارہ اس پر ہنسی کا دورہ پڑا۔ لگتا تھا ہنستے ہنستے اس کا پیٹ پھٹ جائے گا۔ اس نے میری پیٹھ پر دھپ سے ہاتھ مارا، اور کہا:

''کیا تم نہیں جانتے اس طرح کی بات کرنا غلط ہے؟ تمھیں قتل کرنا سکھاؤں؟ کیا تمھارے خیال میں یہ تاش کا کھیل سیکھنے کی طرح ہے موسیو؟''

مجھے اپنے آپ سے نفرت سی محسوس ہوئی، خاص طور پر اس کے ''موسیو'' کہنے پر؛ وہ لفظ جو اس نے زور ڈالتے ہوئے چڑ کر ادا کیا تھا، اس شخص نے جو میرا خیال تھا کہ اگر کبھی مجھے یہ بات اس سے کہنے کا موقع ملا تو میرا مذاق نہیں اڑائے گا— اور کہاں وہ میرے واقف کاروں یا میرے اسکول کے ساتھیوں کی طرح میری ہنسی اڑا رہا تھا۔ میں نے اس کو قائل کرنے کی کچھ زیادہ کوشش نہ کی، کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ اسے مذاق سمجھ کر ٹال دے۔ لہٰذا میں نے اپنا منھ بند کر لیا۔

ہم دونوں کچھ دیر تک خاموش رہے۔ پھر میں نے اپنے کندھوں پر اس کا شفقت بھرا ہاتھ محسوس کیا، گویا وہ پھر دوستی کا ہاتھ بڑھا رہا ہو۔

''اگر تم کسی کو قتل کرنا چاہتے ہو تو ہم انتظام کر لیں گے۔ یہ آسان سی بات ہے۔''

امید سیلاب کی طرح میری طرف واپس امنڈ آئی۔

''وعدہ؟''

''ایک شرط پر۔ اگر میں تم سے ایک کام کرنے کو کہوں تو کرو گے؟''

''جو تم کہو۔''

۷

اس وقت تک میں نے الغریب کو ہم سب جیسا انسان نہ سمجھا تھا؛ ایسا انسان جو کسی خاندان کا حصہ ہو، جس کی ماں ہو، باپ ہو، بیوی ہو، یا بیویاں ہوں۔ لیکن اس نے مجھے مہلت نہیں دی کہ اپنی حیرت کا اظہار کر پاؤں، بلکہ تیزی سے، بغیر رکے، مشن کی تفصیلات سمجھانے لگا: مجھے پانچ پاؤنڈ کا نوٹ اس کی پہلی بیوی کو پہنچانا تھا، اور دوسری بیوی کو ملاقات کے لیے اس کے پاس لے کر آنا تھا۔

پہلی بیوی ہمارے گاؤں کے قریب ہی ایک دوسرے گاؤں میں رہتی تھی۔ وہ ایک بوڑھی چڑیا کی طرح خاکی، اور گل فتنہ کے درخت کی ٹہنی کی طرح سوکھی ہوئی تھی۔ اس کے کم از کم دس بچے تھے جو سب کے سب اس کی طرح خاکی اور خشک تھے۔ اس نے جرح کر کر کے، الغریب کے بارے میں ہر طرح کی تفصیلات پوچھ پوچھ کر، مجھے پاگل کر دیا۔ بلاشبہ اسے شکوک وشبہات تھے۔ جب بالآخر قصہ تمام ہوا اور اس نے مجھے جانے کی اجازت دی تو میں نے سکون کا سانس لیا۔

اس کے بعد مجھے وَردہ کے پاس جانا تھا: اس کی نئی بیوی، غیر معمولی نرم خوئی، حسن اور نسوانیت کی حامل۔ میں کبھی اُس جاگیر پر نہ گیا تھا جس کا نام الغریب نے مجھے وردہ کا پتا سمجھاتے وقت بتایا، لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہ جگہ ایک پمپنگ اسٹیشن کے پرے واقع تھی جہاں آب رسانی کی بڑی نہر کے پانی کی سطح کو جھیل کی سطح تک لایا گیا تھا۔ میں نے وہاں سہ پہر کے بعد جانے کا فیصلہ کیا تاکہ وردہ کو رات کی تاریکی میں اپنے ساتھ لا سکوں۔ میں گھبراہٹ اور خوف کا شکار تھا اور مجھے یقین تھا کہ ہر راہ گیر مجھے پہچان رہا ہوگا اور اس ''نشانی'' کو بھی جو الغریب نے مجھے دی تھی تاکہ وردہ کو یقین ہو سکے کہ مجھے اس نے بھیجا ہے۔ اور کیا نشانی تھی وہ بھی! بھنویں بنانے والی ایک سیاہ پنسل جو وردہ نے منگائی تھی۔ میرے لیے یہی قبول کرنا مشکل تھا کہ الغریب اس قسم کی فضول چیز کا تذکرہ کر سکتا ہے؛ کہاں یہ کہ اسے یاد رہے کہ یہ وہ چیز تھی جس کی وردہ نے فرمائش کی تھی!

جب میں باغ کے احاطے میں پہنچا تو وہاں سوائے عورتوں اور بچوں کے کوئی نہ تھا۔ میرا استقبال مریل، فاقہ زدہ، ادھ موئے کتوں کی ایک ٹولی نے خوفناک طریقے سے بھونک کر کیا۔ کتے میرے پیچھے لگ گئے، اور اگر وہ دہقانی عورت جو مٹی میں سنے کپڑے پہنے ہوے تھی، وقت پر نمودار ہو کر کتوں کو بھگا

نہ دیتی تو میں مڑ کر بگٹٹ بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ اسی عورت نے مجھے وردہ کے دروازے تک پہنچایا۔

میری آمد کی اس نے خود ہی توجیہہ پیش کی۔ ''تم اس کے رشتے داروں میں سے ہو گے جو اسٹیشن میں رہتے ہیں۔'' لوگ صوبے کے دارالحکومت کو یہی کہہ پکارتے تھے، کیونکہ صرف وہیں ریلوے اسٹیشن تھا۔ اس نے وردہ کا دروازہ بھی خود ہی کھٹکھٹایا، اور اس کو آواز دے کر کہا کہ مہمان آئے ہیں۔ اندر سے ایک آواز نے اسے جواب دیا۔ یہ ایک مسرت بھری، مدھر آواز تھی، لیکن یہ ایک شہری آواز تھی جس کی میٹھی شائستگی دیہی علاقے کی اس دور دراز ویران جگہ سے قطعاً مطابقت نہ رکھتی تھی۔

دروازہ کھلا اور لمحہ بھر کے لیے میں نے ایک حسین ترین چہرے کا جلوہ دیکھا۔ ایسا حسن میں نے زندگی میں کبھی نہ دیکھا تھا۔ جلد اتنی صاف شفاف تھی کہ اس کے پار دیکھا جا سکتا تھا، اور اس کے خدوخال اتنے درست تھے کہ وہ ترکی مٹھائیوں کے ڈبوں پر بنی ہوئی عورتوں کی طرح نظر آ رہی تھی۔ یہ واضح تھا کہ وہ ابھی نہا کر نکلی ہے اور اس نے ابھی اپنے گیلے بالوں کی صرف ایک حصے پر کنگھی کی ہے۔ اس سے پیشتر کہ وہ غیر ارادی طور پر دروازے کے پیچھے سمٹ جائے، میں نے اسے ایک نظر دیکھ لیا۔ پھر وہ ایک جلابیے میں ملبوس نمودار ہوئی۔ اس کے بال ڈھکے ہوئے تھے، صرف چہرہ کھلا تھا۔ اور اس کے بعد میں کچھ نہ دیکھ سکا کیونکہ شرم سے میرا سر جھک کر سینے سے آ لگا تھا، اور میں نے اپنی نظریں زمین پر گاڑے رکھیں، اور جب وردہ کی مسرت بھری، نرم، مترنم آواز آئی تو اپنے کانوں کو کچھ نہ سننے کا حکم سنا دیا۔ اس نے مجھے خوش آمدید کہا اور اندر بلایا، گو کہ اسے اب تک معلوم نہ تھا کہ میں کون ہوں اور کیوں آیا ہوں۔

شرم سے میری حالت غیر ہو رہی تھی اور میری زبان گنگ ہو گئی تھی۔ میں نے بمشکل مختصراً مدعا بیان کیا۔ میرے کان سرخ ہو کر جلنے لگے جب میں نے ''نشانی'' کا تذکرہ کیا۔ لیکن یہ بتانے پر بھی اس کے برتاؤ اور اس کی آواز میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ مجھے اسی طرح خوش آمدید کہتی رہی اور بیٹھنے کی دعوت دیتی رہی۔ جب میں جھجکا تو اس نے میرا ہاتھ اپنے ملائم ہاتھ میں لے لیا جو غسل کی وجہ سے اب تک نم تھا، اور مجھے اندر کھینچ لے گئی۔ ''اندر آ جاؤ! اس کو اپنا ہی گھر سمجھو۔ آؤ، اندر آ جاؤ۔ آؤ نا...''

اس نے اس وقت تک میرا ہاتھ نہ چھوڑا جب تک مجھے اندر مہمان خانے میں نہ لے گئی۔ اس نے ایک ہاتھ سے نفیس غالیچہ نکال کر بچھایا اور دو آرام تکیے اس پر رکھے؛ ان میں ایک بیٹھنے کے لیے تھا،

اور وہ اس پر مصر تھی کہ میں دوسرا پشت پر سہارے کے لیے رکھوں۔

میں نے ابھی سانس بھی نہ لیا تھا کہ وہ چائے کا سامان لے آئی اور چائے بنانے لگی۔ جب اس نے مجھے چائے کا فنجان تھمایا تو اس کے ملائم ہاتھ کی سفید رنگت آتشیں ہوگئی۔ پھر اس نے پوچھا، چائے کیسی ہے، اور کہا کہ اس نے جان کر ہلکی رکھی ہے کہ مجھ جیسے نرم خو شخص کے لیے مناسب ہو۔

چائے کے چند گھونٹ لینے پر میرے حواس بحال ہونا شروع ہوے۔ اس وقت تک وہ اپنی مہمان نوازی میں، مجھے آرام سے بٹھانے میں، اتنی مصروف رہی کہ مجھے موقع ہی نہ ملا کہ میں کھل کر بات کرسکوں، کہ میں کیوں آیا ہوں اور اس کے شوہر سے میرا کیا تعلق ہے۔ جتنی دیر میں وہاں رہا اتنی ہی مجھ پر اس کی توجہ بڑھتی گئی۔ اس افراتفری میں میں پریشان ہوتا رہا کہ فنجان کہاں اور کیسے رکھوں۔ اس سے پیشتر کہ میں فنجان رکھتا، وہ میرے بالکل قریب آ گئی۔ ''تم کیوں اتنا شرما رہے ہو، میری جان؟ کیا تم یہاں آرام سے نہیں ہو؟ کیا ہم تمھارے لیے مناسب نہیں ہیں؟ شرماؤ نہیں، چھوٹے بھیا! پلیز شرماؤ نہیں۔''

پھر اس نے مجھے آہستگی سے ہلانا شروع کیا اور مجھے اپنے سے قریب کرلیا۔

شاید میں اپنے حواس پر قابو پالیتا اگر اس کی طرف نہ دیکھتا۔ وہ مجھ سے کسی اسکول کے لڑکے کا سا سلوک کر رہی تھی، گو کہ وہ خود مجھ سے چند ہی سال بڑی رہی ہوگی۔ لیکن عمر کا فرق بے معنی تھا؛ اصل بات یہ تھی کہ وہ عورت تھی اور میں ایک پھٹی آواز والا نوبالغ لڑکا جس کا کنٹھ نکلا پڑ رہا تھا۔ نہ صرف یہ کہ وہ کم عمر تھی بلکہ ناقابلِ برداشت حد تک خوبصورت بھی؛ اجلی شفاف رنگت، کسا ہوا ریشمی لباس جس میں سے اس کا سینہ، پیٹ اور رانیں جیسے باہر نکل آنے کو بے تاب تھیں؛ اور اگر اس کا جسم اتنی نسوانیت کا حامل نہ بھی ہوتا تو اس کی حسین آنکھوں کی سیاہ گہرائیاں ہی شدید اور بے قابو کر دینے والی خواہشوں کو جگانے کے لیے کافی تھیں۔ ان تمام باتوں کا اس کی بے باکی پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے مجھے پیار سے سہلایا اور میرے گلے میں بانہیں ڈال دیں؛ اور جب بھی میں نظریں جھکاتا، وہ اصرار کرتی کہ میں چہرہ اوپر کروں اور اس کی طرف دیکھوں۔ اس نے مجھے سگریٹ، تمباکو، جو کچھ چاہیے تھا، پیش کیا۔ وہ میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہی، اور کہتی رہی، ''تمھارے بال سنہری اور خوبصورت ہیں، بالکل فرنگیوں کی طرح، ماشاءاللہ میرے بھیا۔''

جب وہ مجھے ''بھیا'' کہتی میں کانپ جاتا؛ وہ جن جذبات کا مظاہرہ کر رہی تھی وہ بہن کے جذبات سے مختلف تھے۔

تمام وقت میں اس آگاہی کے ہاتھوں مضطرب رہا کہ یہ حرکتیں کرنے کے باوجود وہ نامور الغریب کی بیوی ہے جو اس وقت اکڑوں بیٹھا، اپنی بائیں ٹانگ میں چاقو واڑسے ہوئے ہماری واپسی کا منتظر ہوگا۔ جب اس کی عشوہ طرازیاں حد سے بڑھ چلیں تو میرے اعصاب جواب دینے لگے۔ اور وہ البیلے پن سے میرے کندھے ہلانے لگی۔ ''یوں نہ کرو۔ تمھیں پتا ہے یہ سب کیا ہوتا ہے۔ تمھارے بال اتنے خوبصورت ہیں۔ تمھارے پیچھے تو کتنی لڑکیاں پڑی ہوں گی۔ تم بہت پیارے ہو! رات یہیں ٹھہر جاؤ۔ نہیں ٹھہرو گے؟ میں تمھیں نہیں جانے دوں گی۔''

میرے اندر ایک جھنجھلاہٹ سر اٹھانے لگی، اس بات پر طیش آنے لگا کہ جس شخص کو کوئی خدمت سونپی گئی ہو وہ خود ہی ان خدمات کا نشانہ بن بیٹھے۔ میری آمد کا مقصد اس کے پرزور خیر مقدم، صاحب سلامت، ذاتی سوالات، ہمکناریوں اور اس کے لمس اور بظاہر پاکیزہ جذبات کی بوچھار میں گم ہو چکا تھا، اور میرا سر گھومنے لگا تھا۔

وقتاً فوقتاً میں اچانک اٹھ کھڑا ہوتا جیسے بھاگنے والا ہوں، لیکن فوراً ہی اس کے بازو مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیتے، اور وہ مجھے زبردستی بٹھا لیتی۔ وہ میرے بالوں کو چومتی، جس سے میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی دوڑ جاتی، اور ہنس کر پوچھتی، ''اتنی جلدی کیا ہے جانے کی؟'' کسی کھلونے کی طرح جس کا اپنا کوئی ذہن نہ ہو، وہ مجھے اپنی سیمابی انگلیوں سے چھوتی رہی — میرے چہرے کو، میری ٹھوڑی پر پھوٹتی ہوئی روئیدگی کو، میری نکلتی ہوئی مونچھوں کو؛ اور میں غصے میں کھولتا، بیٹھا رہا۔ یہ کوشش کرتا رہا کہ الغریب کا تصور میرے اور اس عورت کے درمیان حائل رہے جس کے انداز شہری ہیں، اور جس کا شرم و حیا سے دور دور کا واسطہ نہیں۔ وہ اس طرح کی حرکتیں کر رہی تھی گویا اس سے پہلے زندگی میں کسی مرد کے پاس نہ گئی ہو۔ اور میں حیران تھا کہ الغریب جیسا شخص اس کے ساتھ کیا کر رہا ہے، کیونکہ یہ واضح تھا کہ اسے نہ الغریب کا کوئی خیال ہے اور نہ خوف۔

شاید یہ ناگواری اور بیزاری کا امتزاج تھا اور ان تمام حالات کی تعجب خیزی کہ اچانک مجھے وردہ کے لیے شدید نفرت محسوس ہونے لگی، باوجود اس کے کہ وہ غیر معمولی حسن اور دلفریبی کی حامل تھی۔

الغریب بہت دور تھا اور وہ مرد جو اس کے پاس آ سکتے تھے انھیں اپنی جان کا خطرہ تھا، اور وہ زبردستی مجرد زندگی گزارنے پر مجبور تھی۔ اور قسمت نے مجھے اس کی راہ میں لا کھڑا کیا تھا — اس کے لیے آخری راستہ۔ اس کا کیا خیال تھا؟ کون تھی وہ؟ طوائف؟ اور مجھے کیا سمجھ رہی تھی؟

اور پھر ناگہانی تغیر کے امنڈتے ہوئے سیلاب سے میں نے اپنے آپ کو کھینچ کر الگ کیا، اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر، اور بغیر کسی گھبراہٹ یا شرم کے، اس کو لفظ بہ لفظ الغریب کا پیغام سنایا۔ وہ میرے اس تغیر پر ہکا بکا رہ گئی، اور اس کی حیرت بھری آنکھیں ایک غیر یقینی کیفیت میں ڈوب گئیں۔ لیکن یہ صرف لمحہ بھر کے لیے ہوا اور پھر ان میں دوبارہ ایک قسم کی چمک آ گئی۔ یہ بات سمجھنے میں خاص ذہانت کی ضرورت نہ تھی کہ اس نے میرے ردِعمل اور میری واضح ناپسندیدگی کو اس معنی میں لیا ہے کہ اس کا نسوانی حسن اور دلکشی مجھ پر ناکام ہو گئی ہے۔ اور یہ کہ کامیابی کے لیے اسے اپنے ہتھیار مزید تیز کرنے ہوں گے۔ اور اس دفعہ اس کی لگاوٹیں اور ہم کناریاں بے حیائی میں بہت آگے نکل گئیں۔ گو کہ وہ ہر دفعہ ایک پارسا جملہ کہتی، ''خدا تمھاری حفاظت کرے، رسول پاک تمھاری نگرانی کرے۔'' میری کراہت عیاں ہو گئی اور اب اس کے شرمندہ ہونے کی باری تھی۔ آخر کار اس نے مجھ سے پوچھا:

''کیا میں تمھیں پرکشش نہیں لگتی؟''

اور اس لمحے میں خود کو تقریباً چلاتے ہوئے پایا:

''تم دونوں کے ساتھ کیا معاملہ ہے؟ مجھے الغریب نے تمھارے شوہر نے بھیجا ہے۔ تم میرے ساتھ آ رہی ہو یا نہیں؟''

اس نے میری آنکھوں میں پڑھ لیا کہ اب واپسی کی کوئی صورت نہیں۔ لیکن وہ فوراً پسپا نہ ہوئی، بولتی رہی، گویا میرے ردعمل کی شدّت کو کم کرنا چاہتی ہو، اور ہمارے درمیان کی خلیج کو پاٹنا چاہتی ہو۔ آخر اس نے کہا کہ مجھے واپس جانا ہوگا اور الغریب کو بتانا ہوگا کہ وہ نہیں آ سکتی۔ جب میں نے پوچھا کیوں، تو اس نے اس بات کا کچھ جواب نہ دیا بلکہ گڑگڑا کر کہا کہ میں الغریب کو اپنی طرف سے کچھ نہ کہوں بلکہ وہی بتاؤں جو وردہ نے کہا ہے۔ ایک وقفے کے بعد اس نے کہا، ''اگر وہ مجھ سے ملنا چاہتا ہے تو اس کو یہاں آنا ہوگا۔'' اور جب وہ یہ کہہ رہی تھی تو ہم دونوں کو احساس ہوا کہ یہ پاگل پن ہے اور الغریب کا وہاں آنا خطرے سے خالی نہیں۔

جب میں نے دیکھا کہ مزید رکنے سے کوئی فائدہ نہیں تو اجازت چاہی لیکن اس نے مجھے روکے رکھا اور کاغذ میں لپٹی مٹھائیوں سے میری جیبیں بھر دیں۔ آدھے راستے میں میں نے مٹھائی کھانے کی کوشش کی لیکن وہ میرے حلق میں اٹک گئی اور میں نے پوری قوت سے لفافہ نہر میں پھینک دیا، اور سنجیدگی سے سوچنے لگا کہ الغریب کا سامنا کیسے کروں گا۔

۸

ہماری ملاقات افسردہ کرنے والی تھی۔ معلوم نہیں کیوں، مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ الغریب نے جو کام مجھے سونپا تھا میں اسے پورا کرنے میں ناکام رہا ہوں؛ اور یہ کہ میرے اور اس کے سادہ اور واضح تعلق میں پیچیدگیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ میرے لیے وہ ایک معصوم ہیرو تھا جس کے اس عام زندگی سے جکڑنے والے کوئی رشتے ناتے نہ تھے جو ہم گزارتے ہیں۔ اور پھر مجھے غیر متوقع طور پر معلوم ہوا کہ اس کی ایک بیوی ہے، اور ایک اَور بیوی وردہ جیسی بھی۔ معلوم نہیں کیوں مجھے اس پر شرمندگی تھی؛ گویا یہ میرا فرض تھا کہ میں یہ جاننے سے باز رہوں؛ اور میں نے اسے ایک کمزور لمحے میں دیکھ لیا تھا، ایک ایسی حالت میں جہاں اس کی عزت مشکوک ہو گئی تھی۔

جب اس نے مجھے دیکھا تو صرف اتنا کہا، ''آہ! وہ نہیں آئی؟'' اور پہلی دفعہ مجھے احساس ہوا کہ مجھے جھوٹ بولنا ہوگا، اور میں وردہ کی طرف سے بہانے تراشنے لگا۔ لیکن اس نے صرف سر ہلایا اور کہا، ''ٹھیک ہے۔ کوئی بات نہیں۔ کسی نے تمھیں وہاں جاتے ہوئے دیکھا تو نہیں؟''

اس کے رنجور لہجے سے میں بتا سکتا تھا کہ وہ موضوع بدلنا چاہتا ہے۔ مجھے جھنجھلاہٹ سی ہوئی کہ نہ اس نے مجھ پر غصہ کیا، نہ میرا گلا دبوچا، اور نہ ہی فوراً اس جاگیر کی طرف روانہ ہوا جہاں وردہ رہتی تھی تاکہ اس کو بستر سے کھینچ کر لا سکے۔ مگر جب میں نے، اس تمام واقعے پر چھپی ہوئی ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے، یہ موضوع دوبارہ چھیڑنے کی کوشش کی تو وہ ناراض نہیں ہوا اور وردہ کے بارے میں پوچھنے لگا۔ وہ کیسی ہے؟ ٹھیک تو ہے وہ؟ جب میں وہاں پہنچا تو وہ کیا کر رہی تھی؟ گویا وہ کوشش کر کے عام خاوندوں کی طرح پیش آنا چاہتا ہو جو وقتی طور پر اپنی بیویوں سے جدا ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے ہر سوال

پر میری بغلوں میں ٹھنڈا پسینہ پھوٹ نکلتا تھا، اور میں سوچنے لگتا کہیں اسے علم تو نہیں ہو گیا کہ میرے جواب پوری کہانی نہیں کہہ رہے؛ اور میں سانس روک لیتا، یہاں تک کہ وہ سر ہلاتا اور اگلا سوال کرتا۔

مجھے آج تک یاد ہے کہ کیسے اس نے اچانک سر اٹھا کر مجھے دیکھا تھا۔ اس کی عمر کے پچاس برسوں کو عیاں کرتے ہوئے کھچڑی بال، اس کی مخصوص سکڑتی ہوئی آنکھیں جو تاریکی میں اس طرح چھپی ہوئی تھیں کہ اس کی ناک کے دونوں طرف صرف تاریک حلقے نظر آ رہے تھے۔ میں اس کی خاموشی میں ڈوب گیا، اور اضطراب کے ساتھ ان آنکھوں کو پڑھنے کی کوشش کرنے لگا جن پر رات کی تاریکی کا چشمہ چڑھا ہوا تھا۔ اچانک اس نے کہا، ''سنو موسیو!'' شدید دہشت نے میری آواز بند کر دی اور اس سے یہ تک نہ کہہ سکا کہ وہ اپنی بات جاری رکھے۔

چاند دور سے ہم پر جھانک رہا تھا، تاریکی میں دبکے ہوئے پیڑوں اور ہمارے داہنی طرف قطار میں کھڑے یوکلپٹس کے عظیم الشان درختوں کے اوپر، دودھ کی ایک ٹوٹی ہوئی صراحی کی طرح جو کسی بزرگ کے مزار پر پڑی دعاؤں کی طلب گار ہو۔ اس کی مدھم روشنی سرخی مائل تھی، ایک ایسی لالٹین کی طرح جس میں ہوا کا گزر نہ ہو؛ اور اس روشنی میں الغریب کا سر ہیبت ناک نظر آ رہا تھا۔ اس کے جسم کی مناسبت سے کہیں زیادہ بڑا، بوجھل اور ساکت نظروں سے گھورتا ہوا ایک بے جان سر۔ پھر اس کے ہونٹوں سے بلا جنبش ایک آواز نکلی، ''تم مجھ سے جھوٹ کیوں بول رہے ہو، موسیو؟''

میں ڈھے گیا، دنیا کی کگر سے لڑھک کر، منھ کھولے مہیب خلا کے شگاف میں گرتا چلا گیا۔ میرا دل تھم گیا، ذہن مفلوج ہو گیا، میرے ہاتھ پیر سرد پڑ گئے اور میری جلد سے خوف پسینے کی ننھی ننھی بوندیں بن کر خارج ہونے لگا۔ خلا میں بے تحاشا ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے میں نے حماقت آمیز لہجے میں کہا، ''کیوں؟''

دوبارہ اس کی آواز مجھ تک پہنچی، تاریکی کی آواز، اگر تاریکی بول سکتی ہے۔ ''تم مجھ سے جھوٹ کیوں بول رہے ہو، موسیو؟''

میں نے تھوک نگلا اور تھوک نگلنے کی آواز کو گھونٹنے کی کوشش کی؛ اور اس سے پیشتر کہ میں کچھ کہتا اس نے کہا، ''تم نے اس کے ساتھ کیا کیا؟''

یقیناً اس نے دیکھ لیا ہو گا کہ میں اس طرح اچھل کھڑا ہوا گویا مجھے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ اور

اس نے سوال کو اس طرح بنا کر دوبارہ پوچھا، ''یا اس نے تمھارے ساتھ کوئی شرارت تو نہیں کی؟''

اس لمحے میں نے فیصلہ کیا کہ میں اس کو سب کچھ صاف صاف بتا دوں گا، اور اگر اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو گیا تو ان دونوں سے تعلق ہمیشہ کے لیے ختم کر لوں گا۔ میرا ان جھگڑوں سے کوئی واسطہ نہیں؛ میں نے بچکانہ خواہش کے نتیجے میں خود کو ان سے منسلک کر لیا ہے، اور اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھنے کا خطرہ مول لیا ہے۔ لیکن پھر غیر متوقع طور پر ایک غیر معمولی چیز واقع ہوئی اور میری جان میں جان آئی۔ الغریب نے ایک زوردار قہقہہ بلند کیا اور رات کے سائے چکنا چور ہو کر بکھر گئے اور میرے اندیشے روئی کے گالوں کی طرح ہوا میں اڑنے لگے۔ اس کا مضبوط ہاتھ آگے بڑھا اور میرے کندھے پر دھب سے پڑا اور وہ روشنی کی آواز میں بولا، اگر روشنی کی آواز ہوتی ہے؛ اس کے خدوخال پگھل کر پُرتاثر ہو گئے اور ان میں زندگی امنڈ آئی۔

''تم ڈر گئے؟ کیوں، موسیو؟ تم کو اس طرح چھیڑنا ٹھیک نہیں! پھر بتاؤ مجھے، کیا کیا اس نے تمھارے ساتھ؟''

مجھے بھلا اس بات کا کیونکر علم ہو سکتا تھا کہ اس کی نئی بیوی کا رویہ اس کے لیے کوئی راز نہیں۔ وردہ اس کی چہیتی بیوی تھی، اس کے دل کا ٹکڑا، اور اس نے اس عورت کی کمزوری سے بخوبی واقف ہوتے ہوئے اسے اپنایا تھا۔ اس نے وردہ کو کسی شادی کے موقعے پر موسیقاروں کے ایک طائفے میں گانا گاتے ہوئے سنا تھا اور کسی جنون کی طرح اس کے عشق میں گرفتار ہو گیا تھا اور پھر اس سے شادی کر لی تھی، کم و بیش زبردستی، اور اس کو ایک دورافتادہ جاگیر میں رکھ چھوڑا تھا— کھلے پنجرے میں ایک پرندے کی مانند، تاکہ دوسرے مردوں کی تحقیر کر سکے۔ لیکن وہ الغریب کی بھی اتنی ہی تحقیر کرتی تھی۔ اور— بقول سیّد خلیل کے جس نے مجھے پوری داستان سنائی— وہ دونوں الف لیلہ کی کہانیوں کی عورت اور جن تھے؛ جن نے عورت کو ایک بوتل میں بند کر رکھا تھا اور چابی اپنے پاس رکھی تھی، جبکہ عورت کے پاس چھلّوں سے بھرا ایک تھیلا تھا، جو اسے اُن مردوں نے دیے تھے جو عورت کی جن کے ساتھ بے وفائی کا باعث بنے تھے۔ بے شک وردہ کے پاس چھلوں کا کوئی تھیلا نہیں تھا اور الغریب جن سے کہیں زیادہ اثر اور طاقت کا مالک تھا، اور کہیں زیادہ وردہ سے محبت کرتا تھا۔ وہ اپنے ساتھ، اپنی پہلی بیوی اور بچوں کے

ساتھ، کنجوسی کرتا تھا تاکہ وردہ پر چیزیں نچھاور کر سکے۔ اور وہ وردہ کو وفادار رہنے کو بھی نہ کہتا تھا، حتیٰ کہ ایک روایتی وضع داری کا پاس رکھنے کا بھی مطالبہ نہ کرتا تھا؛ بلکہ اس نے یہ کہہ کر اسے بظاہر کھلی چھٹی دے دی تھی کہ ''اگر تمھیں کچھ کرنے کا موقع ملا تو وہ تمھارا حق ہوگا۔'' شاید اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا، اور وہ بوقت ضرورت وردہ کی غلط حرکتوں کی توجیہہ کرنے کی کوشش کرتا۔ اور اس تمام اثنا میں شک کی آگ اس کی روح کو چاٹتی اور اسے اذیت پہنچاتی رہتی اور یہ سوال اس کو ڈستا اور اس کی قوت کو زائل کرتا رہتا: کیا اس نے موقعے کا فائدہ اٹھالیا ہے؟ کیا اس کو موقع مل گیا؟ یا وہ اب تک بے وفائی کرنے کی قوت سے محروم، اس کی قید میں ہے، اس وجہ سے کہ الغریب کا نام دل میں اس قدر دہشت پیدا کرتا ہے؟

جب بھی وردہ پر اس کے اعتماد کی کمی اور اس کا اپنی ذات پر شک ایک خاص نقطے تک پہنچتا، وہ اپنی طاقت کے مظاہرے پر مجبور ہو جاتا تاکہ خود کو اور دوسروں کو یقین دلا سکے کہ وہ اب تک مختارِ کامل ہے۔ وہ طیش میں آ کر آس پاس کے علاقوں پر اپنا غصہ اتارتا اور اپنی شہرت کو جن کی بوتل سے بھی زیادہ خوفناک بنا دیتا۔

میں بھلا کس طرح جان سکتا تھا کہ اس نے مجھے ایک مہرے کی طرح استعمال کیا تھا تاکہ وردہ کو چھیڑ سکے، اس کو بتا سکے کہ گو الغریب اس سے بہت دور ہے مگر وہ میری قوتِ ارادی کو مفلوج کرنے اور وردہ کو بے وقوف بنانے کے لیے مجھے استعمال کرنے کے قابل ہے۔ وردہ کو یقیناً پتا ہوگا کہ جلد یا بدیر میں ٹوٹ پھوٹ جاؤں گا اور الغریب کو سب کچھ بتا بیٹھوں گا، اس لیے اس کا رویہ میرے ساتھ اتنا نپا تلا تھا، تاکہ وہ الغریب کے چیلنج کا سامنا کر سکے اور جواب میں اس کو خود چیلنج کر سکے۔ میں ایک جیتا جاگتا خط تھا جو الغریب نے اپنی بیوی کی ذہنی کیفیت کی تفتیش کے لیے لکھ کر بھیجا تھا؛ اور وردہ نے اس کا جواب، اس کے خلاف بغاوت سے بھرپور خط، اسی کاغذ پر لکھ بھیجا تھا۔ الغریب نے مجھے وہاں اس لیے بھیجا تھا کہ اپنی بیوی پر ثابت کر سکے کہ اس کے حسن و جمال اور نسوانی کشش کے مقابلے میں الغریب کا اثر مجھ پر زیادہ حاوی تھا۔

لیکن اس رات جب میں الغریب کو بتا رہا تھا کہ وردہ کے گھر کیا ہوا تھا، وہ صرف ہمہ تن گوش

رہا، وقتاً فوقتاً ہنستا رہا، اپنے پرانے لہجے میں نہیں بلکہ ایک نوبالغ لڑکے کی طرح جو اپنے وجود پر اور اپنی مردانگی پر خوش ہو رہا ہو۔

جب میں نے بات ختم کی تو اس نے ذرا سنجیدگی سے کہا، ''اچھا موسیو، اگر وہ تمھاری بیوی ہوتی اور اس طرح کی حرکتیں کرتی تو تم اس کے ساتھ کیا کرتے؟'' میں نے واقعتاً غصے میں آ کر جواب دیا، ''میں اسے کب کا قتل کر چکا ہوتا۔''

''اتنی آسانی سے؟ کیا کسی کو قتل کرنا اتنا ہی آسان ہے؟''

''کم از کم تمھارے لیے تو ہے۔''

اس نے سر جھکا لیا۔ ''لوگوں کو قتل کرنا اَور بات ہے، اور اپنی بیوی کو قتل کرنا اور بات۔ کون جانے... مجھے لگتا ہے میں جس سے بھی ملتا ہوں اس نے کبھی نہ کبھی اپنی بیوی کو قتل کرنے کے بارے میں سوچا ہوتا ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ تم حتمی فیصلہ نہیں کر سکتے کہ کرو یا نہ کرو۔ ایک دن تم خود سے کہتے ہو: بس بہت ہو چکا، اس سے کوئی امید نہیں کی جا سکتی؛ اسے ختم کر دو۔ مگر دوسرے دن شاید تم خود سے کہو: ایک موقع اور دے دو؛ ہو سکتا ہے وہ اپنی عادتیں بدل ڈالے... اور پھر ان دونوں ارادوں کے درمیان تمھاری کشمکش جاری رہتی ہے، عمر بھر۔ اگر فیصلہ کرنا اتنا ہی آسان ہوتا تو ہر شخص اپنی بیوی کو اپنی زندگی میں کم از کم ایک بار تو ضرور قتل کر چکا ہوتا۔''

میں سمجھ نہ سکا کہ وہ کہنا کیا چاہتا ہے لیکن میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھ سے صاف بات نہیں کر رہا ہے جو کہ خلافِ معمول تھا؛ اور میں یہ پہلی دفعہ دیکھ رہا تھا کہ وہ ایک ایسے مسئلے کو غیر سنجیدگی سے برتنے کی کوشش کر رہا ہے جو اس کے لیے شدید اہمیت رکھتا ہے۔ اس لیے میں نے اس سے کہا:

''لیکن میرا تو خیال تھا کہ تم ایسے نہیں ہو۔''

اس نے اپنا سر ذرا سا اٹھایا اور کچھ مذاق اور کچھ سنجیدگی سے کہا، ''جلد ہی تم بڑے ہو جاؤ گے اور سمجھ جاؤ گے کہ میرا کیا مطلب ہے۔''

میں نے دیکھا کہ اس کی گردن جھک گئی ہے اور اس کا سر ایک غیر یقینی ساکت جھنڈے کی طرح لٹک گیا ہے۔ مجھے اس پر ترس آنے لگا۔ میں اب اس سے تھک چکا تھا۔ میں اس کے پاس بیٹھے بیٹھے اکتا گیا، اور جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ اچانک وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا اور کان لگا کر سننے لگا۔ اس نے

اپنے کان کھڑے کر لیے جیسے کوئی کتا خطرے کی بو سونگھ رہا ہو۔ اس کی سانسیں تیز ہو گئیں، جیسے وہ میلوں دور سے بھاگتا آیا ہو: اور پھر اس کی آواز آئی، ''اپنی عبا دانتوں میں دبا لو، اور جان بچا کر بھاگو۔ رکنا نہیں، گھر پہنچ کر دم لینا۔''

۹

وہ رات میں نے کروٹیں بدل کر گزاری، اس تفکر میں کہ اس نے مجھے بھاگنے کا حکم کیوں دیا تھا، یا پھر اس گفتگو پر غور میں جو ہمارے درمیان ہوئی تھی۔ میں الغریب کے اس پیکر کا جو میں نے اپنے ذہن میں بنا رکھا تھا، اس سے ملاقات کے بعد قائم ہونے والی رائے سے تطابق تلاش کرنے کی کوشش کرتا رہا: ایک طاقتور شخصیت، پھر بھی عجیب طور پر کمزور: ایک شخص جس نے دنیا بھر کو دہشت میں مبتلا کر رکھا تھا لیکن وردہ کو مرعوب نہیں کر سکا تھا جس کو اس سے سب سے زیادہ خوفزدہ ہونا چاہیے تھا۔ اس دوران الغریب نے اپنی زندگی کی سب سے زیادہ تکلیف دہ راتوں میں سے ایک رات گزاری جیسا کہ مجھے دوسرے دن پتا چلا۔

اس کی حسیات درست ثابت ہوئی تھیں، ایک بہت بڑا حفاظتی دستہ کمشنر کی سربراہی میں اس کی تلاش میں ان ہی کھیتوں کے اطراف گشت کر رہا تھا۔ اگر ہم چند لمحے اور باتیں کرتے رہتے، یا اس کی سماعت اتنی حساس نہ ہوتی، تو انھوں نے ہمیں گھیر لیا ہوتا۔

دوسری رات میں اس کے لیے تربوز لے کر گیا جس کی اس نے خواہش کی تھی۔ میں نے اسے ٹھنڈا کرنے کے لیے اس کو بیچ سے کاٹا اور بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے لگا۔ بہت دیر ہو گئی اور وہ نہ آیا۔ میں جتنا تربوز کھا سکتا تھا، کھا لیا اور بچا ہوا حصہ زمین میں دبا کر گھر واپس آ گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ خوشی مناؤں یا افسوس کروں اِس دھاگے کے ٹوٹنے پر جس نے مجھے الغریب سے باندھ رکھا تھا۔ گو کہ میری اس سے ملاقات کو مختصر سا عرصہ ہوا تھا لیکن یہ میرے تجسس کو کند کرنے کے لیے کافی تھا۔ لیکن دوسری طرف ان ملاقاتوں سے میرا مقصد حاصل نہ ہوا تھا: اس نے مجھے قتل کرنا نہیں سکھایا تھا جو کہ میری خواہش تھی، اور اب مجھے یہ گمان ہونے لگا تھا کہ خود اسے بھی قتل کرنا نہیں آتا۔

چند دن یوں ہی گزر گئے، شاید دو یا شاید تین۔ اور پھر ایک رات میں اپنے بستر کے ساتھ والی دیوار پر ہلکی سی دستک کی آواز سے چونک کر جاگ گیا۔ میں پوری طرح بیدار ہو گیا اور کان لگا کر سننے لگا۔ دوسری دفعہ وہ آواز صاف اور واضح تھی۔ یہ ایک کنکر کی آواز تھی جو مجھے یقین تھا کسی نے جان بوجھ کر میری توجہ مبذول کرانے کے لیے کھڑکی پر مارا ہے۔ میں سوچنے لگا یہ کون ہو سکتا ہے، کیونکہ الغریب کو یہ ٹھیک سے معلوم نہ تھا کہ میرا گھر کس جگہ واقع ہے؛ اگر اس نے معلوم کر بھی لیا ہو تو اسے یہ کیسے پتا چلا ہو گا کہ میرا کمرہ کون سا ہے اور میں کس کھڑکی کے قریب سوتا ہوں؟

میں اٹھ بیٹھا، شدید اندیشوں کے باعث خالی الذہنی کی کیفیت میں، یہاں تک کہ میرا دماغ ایک خالی ٹین کے ڈبے کی طرح معمولی سی آہٹ اور مبہم سے خیال سے بھی بجنے لگا۔ میں نے احتیاط سے کھڑکی کھولی اور گھر کے باہر مدھم سی روشنی میں، سرگوشی میں ایک حکم سنا: ''نیچے آؤ''۔ اور پھر ایک اور حکم: ''اور اطالوی لے آنا۔''

وہ الفاظ تاریکی میں چاقو کے تیز پھل کی طرح اچانک چمکے، اور غائب ہو گئے۔ سب کچھ تاریک سکوت میں لوٹ گیا، سوائے ایک تاریک ترین ساکت نقطے کے جس نے ہلنا شروع کیا، انسانی شکل اختیار کی اور کھیتوں کی طرح چل پڑا۔

میری مسرت ہر چیز پر غالب آ گئی — میری بوکھلاہٹ پر، میرے خوف پر کہ کہیں گھر میں کوئی اور بھی اٹھ نہ بیٹھا ہو، خاص طور پر میرا باپ، کہ ہلکی سی آواز پر بھی اس کی آنکھ کھل جاتی تھی۔ خوشی میرے اندر موجزن ہو گئی جب میں کبوتر خانے کے پیچھے والے گودام کے راستے کو ٹٹولتا ہوا آگے بڑھا جہاں میں نے وہ اطالوی سب مشین گن چھپا رکھی تھی جو الغریب نے مجھے دی تھی۔ پچھلے چند دنوں میں جب اس سے میری ملاقاتیں ختم ہو گئی تھیں، میری زندگی پرانے معمول کے ڈھرے پر لوٹ آئی تھی: بے معنی، بے ماجرا، راز اور رات سے خالی وہ زندگی کتنی مختلف معلوم ہوتی تھی۔ میں اکثر مکئی کی بالیوں میں بھٹکتا پھرتا، اس امید میں کہ شاید اس دھاگے کو پکڑ سکوں جو مجھے اس تک واپس لے جائے۔ اور اب وہ خود لوٹ آیا تھا، اور اس طرح کہ میرے تخیل کی آگ بھڑک اٹھی تھی۔

میری مسرت میرے شکوک پر حاوی آ گئی اور پلک جھپکتے میں میں اس کے سامنے کھڑا تھا، اسی جگہ جہاں ہم دونوں ملا کرتے تھے۔ اکھڑی ہوئی سانسوں پر قابو پاتے ہوئے میں نے اسے بتایا کہ میں

اس کے لیے تربوز لے کر آیا تھا، بندوق اسے پکڑائی اور اس کے سامنے اسے لوڈ کیا جیسا کہ اس نے مجھے سکھایا تھا۔ جب میری سانسیں بحال ہوئیں اور میرا درجۂ حرارت معمول پر آنے لگا، تو میں نے اس کی طرف دیکھا۔ بوکھلاہٹ میں مجھے احساس ہوا کہ وہ پہلے جیسا الغریب نہ تھا؛ وہ خاموش اور سمٹا ہوا تھا اور اس نے اپنی حسیات کو یکجا کر کے اپنی قوتِ ارادی کو ایک مخصوص مقام پر مرکوز کر رکھا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک ایسا تاثر تھا جو میں نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا: ایک پر جوش محویت بلکہ دیوانگی اور ایک نئی روح اس میں دوڑ اٹھی تھی، جس نے مجھے اچانک خاموش کر دیا، اور ایک سپاہی کا سارویہ اختیار کرنے پر مجبور کر دیا جو اپنے افسر کے حکم کا منتظر ہو؛ اور بلا شبہ میں نے اسے کہتے سنا:

''تم گھر جاؤ گے یا میرے ساتھ آ رہے ہو؟''

میں نے فوراً جواب دیا، ''میں تمھارے ساتھ چلوں گا — لیکن ہم کہاں جا رہے ہیں؟''

''پوچھو مت۔ شاید ہم کسی کو قتل کرنے جا رہے ہیں۔ شاید ہمیں کوئی قتل کر دے۔ تم آ رہے ہو؟''

میرے جواب کا انتظار کیے بغیر اس نے مکئی کی بالیوں کے درمیان راستہ بنایا اور پھر اس کا منحنی ہیولا غائب ہو گیا۔

ایک لمحے کی ہچکچاہٹ کے بعد میں اس کے پیچھے چل پڑا۔

۱۰

میں نے اس سے بات چیت جاری رکھنے کی کوشش نہ کی۔ وہ ایسے شخص کی طرح چلا جا رہا تھا جو کسی دور دراز منزل کی جانب گامزن ہو — ایک منزل جو اسے دنیا و مافیہا سے بے نیاز کر کے اپنی طرف کھینچ رہی ہو۔ اسے نہ سانس لینے کی فرصت تھی اور نہ کسی سے بات کرنے کی۔ اس کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے میں نے کتنے ہی پل پار کیے، نہروں کے کنارے گھوم کر طے کیے اور سیلابی نالوں کی تہہ میں گھٹنوں کے بل رینگ کر نکلا۔ وہ نہ مجھے دیکھ رہا تھا اور نہ کچھ سن رہا تھا۔ وہ میرے وجود سے بے خبر تھا۔ کبھی اگر وہ کچھ بولتا بھی تو اس سے زیادہ نہیں: ''کیا؟ کیا کہا تم نے؟'' اور جب بھی میں نے سوال کرنے کی کوشش کی تو وہ جواب میں بڑبڑانے لگا اور مجھے احساس ہوا کہ وہ اپنے خیالوں میں کھویا ہوا ہے

اوراس سے جواب اگلوانے کی کوشش بے کار ہے۔

رات وسیع وعریض تھی، اور ہیبت ناک، دن کی موت کے ماتم میں سیاہ لبادہ اوڑھے، کسی خیمے کی مانند؛ صرف زرد چاند اور تارے سوگواروں کو راستہ دکھانے کے لیے مدھم روشنی میں جل رہے تھے۔ کھیت دور تک پھیلے ہوئے تھے، دن کے کھیتوں سے زیادہ وسیع وعریض۔ کٹی ہوئی گندم، مکئی کی کھڑی بالیوں کے لیے راستہ بنا رہی تھی، اور جو کپاس کے لیے۔ اور ہم پانی میں، جس نے زمین کو چاول کی کاشت کی امید میں ڈبویا ہوا تھا، مبہم سائے دیکھ رہے تھے۔ زمین... حدِ نظر تک زمین ہی زمین تھی؛ ہر انچ کا ٹکڑا کاشت کیا ہوا، محنت سے سنوارا ہوا۔ وہ بے چاری خلقت اپنے پلنگوں پر لیٹی ہوئی تھی جس نے اس کے لیے خون پسینہ ایک کیا تھا اور پھر تھک کر، گویا اداس ہو کر، کروٹیں بدلتی ہوئی سو گئی تھی، اس انتظار میں کہ دن نکلے اور انھیں اپنے ہاتھوں میں سمیٹ کر زمین کے چہرے پر بکھیر دے اور وہ ایک بار پھر اس تاریک ویرانے کو سبزے میں اور اس کی مٹی کو کپاس میں تبدیل کر دیں یہاں تک کہ رات آجائے اور ان کو کاٹ کر اپنے رازوں سے دور اسی مٹی سے بنائے ہوئے انسانی گوداموں میں محفوظ کر دے۔

کیسی خلیج تھی جو ہمارے اور ان کے درمیان حائل تھی۔ وہ جو زمین کی یافت پر زندہ رہتے تھے اور پھر اس کو اپنی ہڈیوں کے گودے سے سینچتے تھے، وہ اس وقت دور اپنے مکانوں میں سوئے ہوئے تھے، وجود کے سامنے اپنی مکمل سپردگی سے مطمئن، کٹھور آسمان اور زمین سے بے نیاز اور اپنے بے تغیر روز وشب پر قانع۔ اور ہم ان کی دنیا سے گزر رہے تھے، ان کی کوششوں کے ثمر کو جواں مردوں کی طرح آراستہ کرنے اور تصرف میں لانے کے لیے۔ الغریب میرے آگے تھا؛ اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں اور طاقتور بازوؤں کے ساتھ دن کی گرفت سے فرار کی کوشش میں رات کے ہاتھوں کاٹ ڈالے جانے کی کشمکش سے بچ کر نکلتا ہوا، اور ان کو اپنے بنائے ہوئے قوانین کے آگے زیر کرتا ہوا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کی طاقت لوگوں پر ظاہر ہو، تاکہ وہ اس سے اس طرح خوف کھائیں جیسے خدا سے اور اگلے جہاں سے اور سرما کی کاٹنے والی سردی سے خوف کھاتے ہیں۔ میں نے رات کی وسعت کو اور پشت سے اس کے مختصر سے وجود کو دیکھا؛ باوجود اس کے کہ بندوق اس کے کاندھے پر لٹکی ہوئی تھی، مجھے محسوس ہوا کہ وہ رات کی باگیں پکڑنے، اس پر قابو پانے کے لیے بہت کمزور ہے۔

لیکن وہاں ہم تنہا نہ تھے۔ میں نے اسے کچھ بڑبڑاتے اور پھر واضح طور پر کسی کو سلام کرتے سنا۔

میں نے اپنے اطراف میں نظر ڈالی اور دو، یا شاید زیادہ، آدمیوں کو دیکھ سکا جنھوں نے پل کے نیچے یا شاید کسی پن چکی کے سائے میں پناہ لے رکھی تھی۔ بجائے اس کے کہ میں تعجب کرتا کہ وہ وہاں کیا کر رہے ہیں اور کیوں اپنے بستر چھوڑ کر اس تاریک ویرانے میں خاموش مشاورت کے لیے آئے ہیں، ایک جھرجھری اور اپنے سر کی ایک غیر ارادی جنبش کے ساتھ میں نے جان لیا کہ وہ رات کے فرزند ہیں اور الغریب جیسی زندگی کے طلب گار۔ جب انھوں نے اس کی آواز سنی تو خود کو محفوظ تصور کیا اور سلام کا جواب دیا، گویا وہ کوئی اسمِ شب ہو۔ انھوں نے اپنی خوشگوار مہمان نوازی ترک نہ کی اور کہا، "تشریف لایئے۔" میری مسرت کی انتہا نہ رہی کہ انھوں نے مجھے الغریب کے ساتھ دیکھ کر مجھے بھی دعوت دی۔

بتدریج، رات کے طویل قرب کے بعد، جب ہم تاریکی میں مزید اندر اتر گئے تو میں نے الغریب کو نئی آنکھوں کے ساتھ دیکھنا شروع کیا۔ گو کہ میری بینائی ہمارے اطراف میں پھیلی ہوئی رات سے دھندلا گئی تھی، میں یہ محسوس کرنے کے قابل تھا کہ رات اور وہ کس طرح یک جان ہو گئے ہیں۔ یہ میرے لیے ناممکن ہو گیا کہ رات کا تصور الغریب کے بغیر یا اس کی اور اس جیسوں کی زندگی کا تصور رات کی پناہ دینے والی بانہوں کے بغیر کر سکوں۔ یہ وہ اجنبی تھے جو دن کے غیر مبہم نسب سے انحراف کر کے اپنے مبینہ سلف، رات، کی پناہ میں آ گئے تھے۔ رات کی گمنامی کی کشش انھیں اپنی طرف جذب کرتی تھی، اور دن کی صراحت اور ضابطہ پرستی سے انھیں تنفر تھا۔ جو کوئی بھی رات سے ان کی بے تکلفی کا، اور رات کی وحشت سے ان کے عادی ہونے کا گواہ ہے، وہ اس نتیجے تک پہنچنے پر مجبور ہو گا کہ ان جیسے لوگ ہمیشہ رہیں گے، چاہے یہ دنیا الٹ پلٹ کر پھر سے آباد ہو جائے۔ جب تک رات کا جادو باقی ہے، کون انھیں الزام دے سکتا ہے؟ کیونکہ یہ رات ہی ہے جس نے ان کو دن سے کھینچ کر جدا کیا اور انھیں وہ بنایا جو کہ وہ ہیں۔ رات اپنے ساتھ اپنی مخلوق لاتی رہے گی، جس طرح پانی مچھلیاں، صحرا گلہ بان اور جلاوطن گھر کی یاد لاتا ہے۔

اس طرح کے مرد ہمیشہ ہوتے آئے ہیں اور ہمیشہ ہوں گے، اس کے باوجود کہ وہ صدیوں سے کڑی سزاؤں کا شکار رہے ہیں اور ختم ہوتے رہے ہیں۔ جب بھی ان میں سے ایک ختم ہوتا ہے، رات دن سے ایک اَور حاصل کر لیتی ہے تاکہ یہ پہیا اس طرح گھومتا رہے۔ اور ہمیشہ دو واضح دنیائیں موجود رہتی ہیں: رات کی دنیا اور دن کی دنیا۔ گو کہ جو دن کے باسی ہیں وہ اکثریت میں ہیں — شاید اس لیے

کہ ہمیں یقین رہے کہ ہمارے پاس متبادل موجود ہے اور ہم اپنی مرضی کے مالک ہیں، جس دنیا میں چاہیں رہیں۔

اچانک الغریب نے مجھے روکنے کے لیے اپنا ہاتھ بلند کیا۔ میں نے خود کو اس کے مقابل پایا: وہ مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اُس لمحے میں نے خود سے سوال کیا کہ وہ کون سی چیز ہے جو اس شخص کو مجھے قتل کرنے سے روکے ہوئے ہے۔ ہم ایک دور افتادہ ویرانے میں تھے: صرف خاموش رات ہماری گواہ تھی۔ اور اگر اسے کسی بہانے کی ضرورت ہوتی تو جو کچھ میرے اور وردہ کے درمیان ہوا، وہی کافی تھا۔ صرف ایک وجہ تھی جو میں سوچ سکتا تھا: وہ یہ کہ الغریب مجھے جانتا تھا، اور یہ کہ اب اس کے اور میرے درمیان تعلق کی نوعیت ایسی تھی جس سے مجھے تسلی تھی۔ کسے معلوم؟ شاید اگر لوگوں کے درمیان باہمی پہچان کا رشتہ مضبوط ہو تو وہ ایک دوسرے کو قتل کرنے سے گریز کریں؛ ان کے درمیان خوف کا وجود ہی نہ ہو۔ یہ خیالات میرے ذہن میں گردش کر رہے تھے جب وہ بولا، ایسی آواز میں جو طویل خاموشی اور شبنم کی نمی سے بھاری ہو رہی تھی۔

''کیا تم خوفزدہ ہو؟''

''نہیں۔''

''ہر چیز کے لیے تیار ہو؟''

''کس قسم کی چیز کے لیے؟''

اس نے جواب نہیں دیا۔ ایک بار پھر اس نے مجھے غور سے دیکھا اور کہا، ''کیا تم وہ آگ دیکھ سکتے ہو؟''

میں نے اب تک اس پر غور نہ کیا تھا لیکن جب میں نے جھاڑیوں میں سے جھانک کر دیکھا تو کافی فاصلے پر ایک دمکتا ہوا نقطہ نظر آیا، جیسے کسی کانے بھیڑیے کی آنکھ، جو دہکتے ہوئے انگارے بھی ہو سکتے تھے۔

''تمھیں معلوم ہے وہاں کون ہے؟''

''کون؟''

''شلابی۔''

''شلابی کون؟''

''میرا دوست، میرا عزیز دوست۔ میں اس سے ملنے آیا ہوں۔ اتنا عرصہ ہو گیا اس سے ملے ہوے۔ میں اسے دل کی گہرائیوں سے یاد کر رہا ہوں۔''

اور پھر اس نے کارروائی میں میرا کردار بتایا: وہ چاہتا تھا کہ میں شلابی اور اس کے ساتھی کو خوفزدہ کر دوں۔ وہ آگ میں بھٹے بھون رہے تھے اور مکئی کی خوشبو ہوا میں بسی ہوئی تھی۔ مجھے مشین گن لے کر رینگتے ہوے ان تک پہنچنا تھا اور ان کے سامنے کود کر چلانا تھا: ''حرامیو! تم یہاں کیا کر رہے ہو؟'' اس لمحے، الغریب نے مجھے تسلی دی، وہ سامنے آ جائے گا اور میں ہنس پڑوں گا اور ہم سب بیٹھ کر بھٹے اڑائیں گے۔

مجھے اقرار کرنا ہوگا کہ اس وقت میں نے خود کو موت کے منہ میں جاتا ہوا محسوس کیا؛ بندوق میرے ہاتھ میں کانپنے لگی اور مجھے دونوں ہاتھوں سے اس کو پکڑ کر کندھے سے لگانا پڑا۔ بے حد آہستگی سے میں آگے بڑھا۔ اور وہ چند لمحے پھیل کر ایک صدی پر محیط ہو گئے، جن میں میں فاصلہ طے کر کے ان کے سامنے پہنچا اور اس قابل ہوا کہ ان کے چہرے دیکھ سکوں۔ ان میں سے ایک جوان اور خوبصورت تھا اور ایک اونی ٹوپی سر پر ترچھی اوڑھے ہوے تھا۔ اور دوسرا واضح طور پر کوئی سرکاری چوکیدار نظر آتا تھا۔ وہ پالتی مارے، اپنی بندوق گھٹنوں پر رکھے، بیٹھا آگ کو کرید رہا تھا؛ جبکہ نوجوان اپنے گھٹنے بازوؤں میں گھیرے بیٹھا تھا اور متفکر نظر آتا تھا۔ اگر مجھے الغریب کا خوف نہ ہوتا تو میں ان کے سر کے اوپر ہوا میں گولیاں چلاتا؛ بھری ہوئی بندوق بہت بڑی ترغیب تھی، اور فاصلے سے گولی چلانا ان کے سامنے جانے سے کہیں زیادہ آسان تھا۔

میں وہاں کھڑا رہا، کانپتا اور جھجکتا ہوا، یہاں تک میں نے الغریب کو ان دونوں کی پشت پر، کھلیان کے دروازے سے نکلتے ہوے دیکھا اور اس لمحے، گویا مجھے حکم ملا ہو، میں اچانک ایک پاگل سانڈ کی طرح اچھل کر ان کے اور اپنے درمیان کا فاصلہ وحشیانہ قلانچوں میں بھرتا، ڈکراتا ہوا، لحہ بھر میں ان کے سامنے تھا اور ہمارے درمیان صرف آگ کے دہکتے ہوے کوئلے تھے۔ میں نے بے حد احمقانہ انداز میں بندوق سے ان کا نشانہ لیا، لیکن یہ شرارت میری توقع سے کچھ زیادہ ہی کامیاب ثابت ہوئی؛ وہ سچ مچ خوفزدہ ہو گئے اور ڈر کے مارے اچھل کر پیچھے کو ہوے۔ چوکیدار یوں چیخنے لگا گویا ذہنی توازن کھو

بیٹھا ہو۔ اب جب میں اس واقعے کو یاد کرتا ہوں تو یہ سب تفصیلات مجھے دلدل میں دھنسی، گہرائی میں ڈوبی ہوئی معلوم ہوتی ہیں جیسے کبھی پیش ہی نہ آئی ہوں۔ اس کی وجہ وہ دوسرے واقعات ہیں جو اسی لمحے وقوع پذیر ہونا شروع ہوے — میری زندگی کے سب سے بھیانک، دہشت انگیز مناظر۔

میرے پاس اس کے سوا کوئی راہ نہ تھی کہ ان واقعات کو ہوتے ہوے دیکھوں۔ اور مجھے آج، اس لمحے تک یاد ہے کہ الغریب کیسے قریب آتے آتے ان کے سر پر پہنچ گیا۔ پھر اس نے اپنے ہاتھ سر کے اوپر اٹھا لیے۔ میں نے ان ہاتھوں کو نیچے آتے دیکھا یا نہیں، یہ میں نہیں کہہ سکتا؛ لیکن جو مجھے یاد ہے وہ ایک ایسی آواز تھی جو میں نے آج تک نہ سنی تھی، یا جس کا وجود تک نہ ہوگا — ایک انڈے کی دوسرے انڈے کو پاش پاش کرنے کی آواز، اگر انڈا انسانی سر کے برابر ہو: کسی دہکتی ہوئی دھات کے پانی میں بجھتے ہوے سسکارنے کی آواز۔ مجھے صرف وہ آواز یاد ہے، اور پھر اس اوباش نوجوان کا اپنے پیروں پر جھک کر کھڑا ہونا اور پھر دوبارہ نہ بیٹھنا۔ اس کی ٹانگ ہوا میں اچھلی، اور پھر یکساں وقفوں میں جھٹکوں کے ساتھ نیچے آنے لگی۔ اس کا سر بھی زمین پر آ گرا، لیکن وہ سر نہیں جسے میں نے دیکھا تھا بلکہ ایک گڈمڈ سے مادّے کا ڈھیر، جو ایک سیاہ چمکدار شے سے کھل گیا تھا: اور یہ علم کسی بھی مضبوط اعصاب کے مالک اور مستقل مزاج شخص کو ہلا دینے کے لیے کافی ہوتا کہ وہ شے ایک کلھاڑی تھی جو اس کی ایک آنکھ سے ہوتی ہوئی سیدھی ٹھوڑی تک اتر گئی تھی۔

۱۱

اس تمام کارروائی میں چند سیکنڈ سے زیادہ نہ لگے ہوں گے، لیکن اس واقعے تک لوٹ لوٹ کر جانے اور ان کے بارے میں سوچنے میں میری زندگی کے کئی سال صرف ہوے۔ ہر دفعہ وہی کراہت کا احساس غالب آ جاتا، وہی تشنج، رونگٹوں کا اسی طرح کھڑا ہو جانا، گویا وہ میں خود تھا جس کی کھوپڑی کھل گئی تھی۔

ہم میں کوئی ایسی انجانی طاقت ہے جو کسی دوسرے کو اذیت میں گرفتار دیکھ کر ہمیں خود اذیت میں مبتلا کر دیتی ہے، اور کسی دوسرے کی موت پر ہم خود بھی کم و بیش ختم ہو جاتے ہیں۔ میرے اور اس

نوجوان کے درمیان کوئی رشتہ نہ تھا، لیکن اس کی دہشت ناک موت مجھے بار بار دہلاتی رہی۔ اور یہی نہیں کہ میں مقتول کے لیے انسانی جذبات کی وجہ سے اذیت میں مبتلا رہا، بلکہ اس سے بدتر یہ کہ قاتل کے ساتھ وابستہ ہونے کا احساس بھی مجھے کچو کے دیتا رہا۔

وہ دہشت جو اس کی موت کے بعد کے چند منٹوں میں مجھ پر طاری رہی وہ اس دہشت سے کہیں زیادہ شدید تھی جو اس کی موت کے لمحے میں ہوئی تھی۔ الغریب کا چہرہ، جب اس نے ہولناک طور پر گڑی ہوئی کلہاڑی کو کھینچ کر باہر نکالا، وحشت ناک ہو رہا تھا؛ اور وہ، ہانپتا ہوا، اس پر جھکا کھڑا تھا۔ اس نے مجھے دیکھا اور پھر چوکیدار کو جو زمین پر اوندھا پڑا تھا، یا خوف سے مر چکا تھا۔ آگ کی لَو نے الغریب کے چہرے کو روشن اور اس کے تاثرات کو نمایاں کر دیا تھا۔ میں اپنی جھرجھری پر قابو پانے میں ناکام ہو گیا اور مجھ پر باقاعدہ کپکپی طاری ہو گئی۔

میں نے اس کی چھوٹی آنکھوں کو کبھی اتنا پھیلا ہوا نہ دیکھا تھا؛ میں نے کبھی نہ سوچا تھا کہ انسانی آنکھ میں یہ خاصیت ہوتی ہے کہ وہ گول ہو کر اتنی پھیل جائے۔ میں نے سوچا کہ اگر وہ خود قتل ہوا ہوتا تو اس کی آنکھوں میں اتنی دہشت نہ ہوتی، اور نہ اس کا چہرہ اتنا ستا ہوا ہوتا۔ یوں لگتا تھا کہ جس وار نے نوجوان کے سر کے دو ٹکڑے کر دیے تھے، اسی وار نے کوئی خفیہ در کھول دیا تھا جس میں سے کسی شیطانی عفریت نے نکل کر خود ایک کلہاڑی سے الغریب کی کھوپڑی کھول دی تھی۔ صرف ایسی کوئی بدروح ہی الغریب کی ابلتی ہوئی آنکھوں اور اس کے اچانک حواس کھو بیٹھنے کی وجہ ہو سکتی تھی۔ اس کی حرکات اور جنبشیں جنونیوں کی سی ہو گئی تھیں، ؛ وہ اپنے اردگرد آنکھیں پھاڑ کر دیکھتا، دائروں میں گھومتا، پہلو بدلتا، کلہاڑی لیے وار کے انداز میں ہاتھ اٹھاتا۔ یہ کوئی دوسرا آدمی تھا؛ اس الغریب سے بالکل مختلف جو میرے ساتھ رات کے اندھیرے میں اتر کر آیا تھا۔

اب میں سوچتا ہوں کہ وہ آسانی سے کلہاڑی میرے سر میں بھونک سکتا تھا، بغیر کسی اشتعال کے؛ یا زمین پر اوندھے پڑے ہوئے چوکیدار کے دو ٹکڑے کر سکتا تھا۔ یقیناً، وہ اس غیر عقلی کیفیت میں کچھ بھی کر سکتا تھا؛ اور اگر وہ خود کو اس نظر نہ آنے والے عفریت سے بچانے کے لیے جو اُس کے سامنے کھڑا اسے دہشت زدہ کر رہا تھا، خوں ریزی اور تباہ کاری پر اتر آتا تو اسے روکنا کسی کے بس کی بات نہ تھی۔

یہ ایک معجزہ ہی تھا کہ میں اور چوکیدار اس رات بچ نکلے۔ میری یہ کیفیت تھی کہ میں بندوق کی لبلبی دبانے ہی والا تھا جیسا کہ الغریب نے مجھے سکھایا تھا۔ ہم سب یکساں طور پر دہشت زدہ تھے؛ ایک عادی مجرم اور قاتل اُتنا ہی خوفزدہ تھا جتنا ایک بے وقوف نوآموز۔ زندگی کی بقا کے لیے میں بندوق سے چمٹا ہوا تھا اور وہ کلھاڑی سے؛ دیوانگی کے عالم میں اس شے کو تلاش کرتا ہو جو اسے دہلا رہی تھی۔ اور اس دوران چوکیدار نے بے ہوشی میں تحفظ پایا ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ مقتول بھی یہی پسند کرتا کہ اسی طرح مرا پڑا رہے، بجائے اس کے کہ دوبارہ زندہ ہو کر پھر سے کلھاڑی کے وار کا نشانہ بنے۔ آگ بھڑکتی رہی، خود کو بجھنے سے بچائے رکھنے کے لیے وہ بھٹے کے دانوں کو جلاتی رہی اور وہ آگ سے اپنی بقا کی جنگ لڑتے رہے؛ اپنے مقدر کے خوف سے سسکارتے، وقتاً فوقتاً چٹختے، آگ سے رحم کی التجا کرتے کہ زندگی کی آخری رمق تو نہ بجھائے۔ موت کا بھرپور چھا جانے والا خوف اور زندگی سے ہٹ دھرمی کے ساتھ چمٹاؤ ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے؛ اور رات، دن سے مقابلے کی کوشش میں، دبیزتر ہو گئی۔ صرف چاند ایک غیر جانبدار تماشبین تھا— اپنی موٹی سی ناک لیے، ہم پر ترس سے گھٹتا ہوا، بظاہر مقدر کے کھیل پر گم سم۔

اور پھر ہمیں انسانی گوشت کے جلنے کی بو محسوس ہوئی جو مکئی کی خوشبو میں مل گئی تھی اور ہوا میں پھیل رہی تھی۔

اچانک ہم حرکت میں آ گئے۔ الغریب کی ایک لات سے چوکیدار اٹھ کھڑا ہوا اور پھر ان دونوں نے مل کر لاش کو اٹھایا اور آگ بجھائی جو اس کے کپڑوں میں پھیلنے لگی تھی اور اس کے بازوؤں کے گوشت تک پہنچ چکی تھی۔ میں نے بندوق اور کلھاڑی اٹھائی اور وہ دونوں اپنے بوجھ کے ساتھ مجھ سے آگے نکل گئے۔ ہم زیادہ دور نہیں گئے؛ چند گز کا فاصلہ طے کر کے ہم ایک ویران پن چکی پر پہنچ گئے جو اس وقت جب دریائے نیل میں پانی کم ہوتا تھا، زیرِ زمین پانی نکالنے کے کام آتی تھی۔ اس کے اردگرد گھاس اگ آئی تھی اور اس کا پانی ٹھہرا ہوا تھا؛ دھات کے رنگ کا اور چکنا ہو چلا تھا۔ وہ پن چکی پہلے ہی ان کے ہاتھ لگ چکی تھی، اور وہ اسے کمیں گاہ کے طور پر استعمال کرتے تھے اور وہاں لوٹ کا سامان چھپایا کرتے تھے۔ لیکن اس وقت تک مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ پن چکی ان لوگوں کی قبر کا کام

بھی دیتی ہے جن کو روایتی طریقوں سے دفنانا مناسب نہیں ہوتا۔ پانی میں پھینکنے سے پہلے لاش سے ایک بھاری پتھر باندھ دیا جاتا اور پانی اس کے کپڑوں اور اس کے مردہ جسم کو چند ہی دنوں میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیتا۔

ہم ایک خاموش جلوس کی صورت میں واپس آئے۔ اس دفعہ میں سب سے آگے تھا، چوکیدار بیچ میں، اور الغریب پیچھے بندوق اور کلہاڑی اٹھائے ہوئے جو میں نے اسے تھمادی تھیں۔ چوکیدار اور الغریب نے کچھ کانا پھوسی کی اور پھر چوکیدار جلد ہی غائب ہو گیا اور ہم دونوں اکیلے واپس ہوئے۔

چند لمحوں تک ہم میں سے کوئی کچھ نہ بولا، اور پھر الغریب اپنی معمول کی آواز میں اس خطرناک کھیل میں مجھے شامل کرنے کی معافی مانگنے لگا: اسے شلابی کو ختم کرنا ہی تھا اور اس کی مدد کرنے والا اور کوئی نہ تھا۔

اور پھر اس نے مجھے شلابی کے بارے میں بتانا شروع کیا۔ وہ صرف اس کا مددگار یا اس کے گروہ کا ایک رکن ہی نہ تھا بلکہ اس کا عزیز ترین دوست بھی تھا۔ ان کی دوستی کا آغاز بدھ بازار میں ایک جھگڑے کے بعد ہوا تھا اور یہ دوستی دس سال تک قائم رہی۔ الغریب اس کے خلوص پر شبہ کیے بغیر اسے اپنا سب کچھ دے ڈالتا: اپنا آپ، اپنا نام، اپنا اثاثہ — اس دن تک جب وہ آخری بار اس پن چکی پر ملے تھے جہاں ہم نے کچھ لمحے پہلے اسے چھوڑا تھا۔ جب الغریب اس روز پن چکی پر پہنچا تو اس نے خود کو پولیس کے پچاس نشانہ بازوں کے درمیان گھرا ہوا پایا۔ اس پر بندوق تنی ہوئی تھی: اور جب اسے ٹرک میں دھکیلا گیا اور شلابی پیچھے رہ گیا تب بھی الغریب اس پر شبہ نہ کر پایا۔ وہ کس طرح یہ جان سکتا تھا کہ ان تمام برسوں میں شلابی حسد کی آگ میں جلتا رہا ہے اور اس کو اکھاڑنے کی سازشوں میں لگا ہوا ہے تاکہ خود الغریب کی جگہ لے سکے، گروہ کا سردار بن سکے اور — جس بات نے الغریب کو زیادہ کھایا — وردہ کے ساتھ سو سکے؟ اور شلابی ہی تھا جس نے کمشنر کی ایما پر اس چھاپے کا انتظام کیا تھا۔

الغریب نے یہ سب کہانی کی صورت میں نہیں سنایا بلکہ اس طرح گویا وہ کوئی ایسا زخم دکھا رہا ہو جس میں سے اب تک خون رس رہا ہو، ٹیسیں اٹھ رہی ہوں۔ ایک بار وہ بولتے بولتے اچانک خاموش ہو گیا، اور پھر بے حد مضطرب ہو کر بولا، ''اس نے جو ٹوپی چھاپے کی رات پہن رکھی تھی وہ میری تھی۔ میں نے اسے ایک ٹھیلے سے دو پونڈ میں خریدا تھا۔ اسے وہ ٹوپی بے حد پسند آئی تھی، اس لیے میں نے اسے

دے دی تھی۔'' وہ ہنسا اور کہنے لگا، ''اگر تم سچ جاننا چاہو تو غلطی اس کی نہیں بلکہ میری تھی۔ اگر میں دوستی اور وفاداری کی توقع کر رہا تھا تو میں غلطی پر تھا۔ رات میں ہر شخص صرف اپنے لیے ہوتا ہے۔ اگر تم اپنی گردن کی حفاظت کی ذمے داری کسی اور کو سونپ دو، تو پھر کچھ ہونے پر اس کو الزام نہیں دے سکتے۔''

اور پھر الغریب مڑا اور بتانے لگا کہ کس طرح اس نے شلابی کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا تھا: بالکل ویسے ہی جس طرح شلابی نے اسے پولیس کے ہتھے چڑھوایا تھا، کم وبیش اسی جگہ پر، اور انھی ہتھیاروں سے: دوستی اور اعتماد۔ وہ چوکیدار اسی جاگیر سے آیا تھا جہاں وردہ رہتی تھی۔ شلابی نے فوراً ہی اس سے دوستی کر لی تھی اور اس پر تحفے تحائف اور عنایتوں کی بارش کر دی تھی تاکہ وردہ کے پاس بلا خوف وخطر آ جا سکے۔ اس رات دونوں نے وردہ کو اغوا کرنے کا منصوبہ بنایا تھا اور وہ دو آدمیوں کا انتظار کر رہے تھے تاکہ اپنی کارروائی شروع کر سکیں۔ بے شک شلابی کو ہرگز یہ علم نہ تھا کہ چوکیدار نے اس کا راز فروخت کر دیا ہے، جبکہ اس تمام کارروائی کا اختتام خود چوکیدار کے لیے بھی غیر متوقع تھا۔

گو کہ میں وہ سب غور سے سن رہا تھا جو الغریب کہہ رہا تھا، لیکن ساتھ ساتھ یہ عیارانہ خیال بھی میرے ذہن میں گردش کر رہا تھا کہ اگر میرا باپ مجھے اس وقت دیکھ لے تو کیا کہے؟ وہ متقی، پرہیزگار شخص جو پانچوں وقت کی نماز پڑھتا تھا اور خدا کے بنائے ہوئے اصولوں پر چلتا تھا، اگر اسے یہ علم ہو جائے کہ میں نے ابھی ابھی اپنی آنکھوں سے کیا دیکھا ہے تو اس کا کیا ردعمل ہو؟ اور یہ جان کر کہ میں کس شخص کا چیلا بن گیا ہوں؟ اس شخص کا جس نے مجھے اپنی باتوں سے ایک ایسی غیر معمولی، عجیب وغریب دنیا میں پہنچا دیا ہے جس کی معمولی سے معمولی تفصیل بھی رونگٹے کھڑے کر دینے کے لیے کافی ہے۔

ان باتوں نے مجھے اتنا الجھائے رکھا کہ میں نے غور ہی نہ کیا کہ اس وقت ہم اس جاگیر میں داخل ہو گئے ہیں جہاں وردہ رہتی ہے، اور کم وبیش اس کے دروازے پر پہنچ چکے ہیں۔ الغریب نے مجھے متوجہ کرنے کے لیے میرا جلابیہ کھینچا۔ ''یہ دیکھو، خون ہے شاید۔'' جب میں نے نزدیک سے دیکھا تو مجھے اس کے ہاتھ میں خون کے دھبے نظر آئے اور جب اس نے اپنی ران کو دوبارہ چھوا تو وہاں خون ہی خون تھا۔ اس نے کپڑے اوپر کیے۔ وہاں ایک گھناؤنا زخم تھا جیسے کسی پاگل مخلوق نے اس جگہ کے گوشت کو ادھیڑ کر رکھ دیا ہو۔ غالباً جب وہ شلابی کو قتل کر رہا تھا، کلھاڑی کا کوئی وار غلطی سے اس کی اپنی ران پر لگ گیا تھا۔

۱۲

زخم، بلاشبہ، بھر گیا، ایک ڈاکٹر معروف نامی کی کوششوں سے جس نے طب کا علم تجربے سے حاصل کیا تھا۔ وہ ایک معمولی سا نجام تھا لیکن اس کی شہرت بحیثیت ایک جراح کے چار دانگ میں پھیلی ہوئی تھی، اور لوگ کہتے تھے کہ اس کے عورتوں کے سے نرم و نازک ہاتھ کسی اصلی ڈاکٹر سے زیادہ بہتر طور پر علاج کرنے کے اہل ہیں۔

زخم کا مندمل ہونا، اور اس میں میرا حصہ، بذاتِ خود ایک ناول بن سکتا ہے، لیکن اتنا کہنا کافی ہے کہ یہ اس جھولتے ہوئے پل کے نیچے ہوا جہاں ہم نے الغریب کی صحت یابی تک پڑاؤ ڈالنے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں کبھی یہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ اس پل کے نیچے اتنی گنجائش ہوگی اور وہ جگہ اتنی محفوظ ہوگی کہ کسی شخص کے لیے کئی ماہ وہاں یوں پڑا رہنا ممکن ہوگا کہ اوپر سے گزرنے والوں کو پتا بھی نہ چلے، اور نہ یہ کہ میرے لیے یہ غیر متوقع طور پر مسرت آمیز واقعہ ثابت ہوگا، ایک بے حد ولولہ انگیز تجربہ، گویا تم پل کو اپنے کاندھوں پر لیے کھڑے ہو۔ اور وہ سب کتنا عجیب تھا — ایک چھوٹی سی ڈھلان کے دامن میں پانی کو قریب سے بہتے ہوئے محسوس کرنا، ان آوازوں کو سننا جو مٹی اور لوہے کے پل سے گزرتے ہوئے قدموں کی چاپ اور پانی کی نرم گنگناہٹ کے امتزاج سے پیدا ہوتی تھیں۔

میں نے اس کے ساتھ بہت دن وہاں گزارے۔ اپنے گھر اور باہر کی دنیا سے کٹ کر، گویا میں کسی اَور قسم کی زندگی کو جانتا ہی نہ ہوں؛ اور ایسا خود بخود اور فطری طور پر ہو گیا، میرے شعوری فیصلے کو اس میں کوئی دخل نہ تھا۔ مجھے صرف الغریب کی صحت یابی کی فکر تھی، اور یہی وجہ تھی میرے زندہ رہنے کی، میرے وجود کی۔ اس زمانے میں ہم ایک دوسرے کے بے حد قریب آ گئے۔ میں اس کے تضادات کو قریب سے دیکھ سکتا تھا: کمزوری اور طاقت اس کے اندر ساتھ ساتھ موجود تھے۔ اس کے جسم اور روح دونوں میں غیر معمولی قوت پنہاں تھی، لیکن پھر بھی وہ زخم پذیر تھا اور اذیت سہنے کا اہل۔ وہ کم بولتا تھا لیکن تھا بذلہ سنج، اور اس کے پاس یقیناً معلومات کا وسیع ذخیرہ ہوگا لیکن وہ بتاتا کم تھا۔

اس کے آغازِ صحت کے دنوں کی ایک یاد میرے ذہن میں آج تک روشن ہے۔ جب ڈاکٹر معروف اسے دافعِ درد انجکشن دینے کی تیاری کر رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ اس کا چہرہ زرد ہو گیا، وہ پسینے

میں تربتر ہو گیا، اس کی آنکھیں پھیل گئیں اور وہ گھبرائی ہوئی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

پہلے تو میں اس کا رویہ سمجھ نہ سکا اور میں نے سوچا کہ یہ اس کے زخم سے پیدا ہونے والی پیچیدگیوں کی علامات ہوں گی۔ لیکن پھر ڈاکٹر معروف نے اس سے پوچھا، "تم ڈر رہے ہو کیا؟" اور اس نے شدت کے ساتھ انکار کیا، اور میں اس نتیجے پر پہنچا — گو کہ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا — کہ وہ الغریب جس سے لوگ دہشت کھاتے تھے اور جو کسی کے آگے جھکنا نہ جانتا تھا، وہ بچوں کی طرح انجکشن لگوانے سے خوفزدہ ہو رہا تھا۔ جب معروف نے سوئی لگانے کی کوشش کی تو اس نے تھوڑی دیر رکنے کی التجا کی، اور پھر چلانے لگا کہ وہ اسے سانس لینے کا موقع تو دے۔ کمزوری اس پر اتنی غالب آ گئی کہ وہ ڈر کے مارے تیزی سے پیچھے ہٹنے لگا اور پھر اچانک ساکت ہو گیا کہ اس کی پشت پل کی دیوار سے جا لگی تھی۔ اس موقعے پر معروف نے زبردستی اس کا بازو پکڑا اور سوئی اس میں بھونک دی۔ اس کے اندر ایک تبدیلی رونما ہوئی اور وہ کسی جنونی کی طرح نظر آنے لگا، یا کسی بلی کی طرح جو شدید دہشت کے عالم میں اپنے مقابل پر دانت اور پنجے گاڑنے کے لیے تیار ہو۔ ڈرامائی طور پر میری نظروں کے سامنے وہی وقت پھر گیا جب اس نے شلابی کو قتل کیا تھا: اس کی آنکھیں غیر انسانی طور پر پھیل گئیں اور مدافعتی خوف سے دہکنے لگیں، اور وہ انگلیوں کی پوروں تک مردے کی طرح پیلا پڑ گیا، گویا اس نے دوبارہ کوئی عفریت دیکھ لیا ہو جو اسے نیست و نابود کرنے کے درپے ہو۔ وہ ایک بدہیئت لمحہ تھا جب معروف نے سوئی نکالی اور الغریب اس کی طرف جھپٹا، اور میں نے سوچا کہ وہ اس کا گلا دبا ڈالے گا۔ بجائے اس کے وہ حرکت وہیں ختم ہو گئی، ایک معطل ہوش کی طرح۔ اور اس کا عکس ہمارے اطراف پانی میں پڑنے لگا، ایک ٹھہرے ہوئے زندہ منظر کی طرح، پانی کی لہروں میں مرتعش ایک ایسے آدمی کا عکس جو خوف سے وحشی ہو گیا ہو۔

ایک دفعہ جب اس کا درد وقتی طور پر کم ہوا تو میں نے وردہ کے بارے میں اس سے بات چیت کی۔ اس وقت تک وردہ سے میرا کافی واسطہ پڑنے لگا تھا اور مجھے اس سے شدید نفرت ہو چلی تھی، اور اس کے نتیجے میں لامحالہ الغریب سے بھی نفرت ہونے لگی تھی۔ جب میں وردہ کی شکایت کرتا تو وہ اس طرح سر ہلاتا گویا اسے اس موضوع سے کوئی دلچسپی ہی نہ ہو۔ مجھ سے یہ بات ہضم نہ ہوتی تھی کہ اس جیسا تجربہ کار آدمی اتنی مستقل مزاجی کے ساتھ وردہ جیسی عورت کے پیچھے لگا ہوا ہو — ایک ایسی عورت

کے جو الغریب کے قابل نہ تھی اور جو اس کے اختیار کا کسی طور پر بالکل لحاظ نہ کرتی تھی۔

وہ لیٹا ہوا تھا، ایک پنکھے سے مکھیاں جھلتا ہوا، جو میں نے اسے کھجور کے پتوں سے بنا کر دیا تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ میں نے محسوس کیا جیسے وہ بوکھلایا ہوا اور شرمندہ ہو، اور اپنی صورت حال کی توجیہہ کے لیے اس کو الفاظ نہ مل رہے ہوں۔ وہ کہہ بھی کیا سکتا تھا؟ یہ بات واضح تھی کہ وردہ کے لیے اس تعلق کی کوئی اہمیت نہیں؛ نہ وہ اس کے خطوط کا جواب دیتی اور نہ اس کی التجاؤں پر کان دھرتی۔ ایک دفعہ جب وہ پل کے نیچے الغریب کو دیکھنے آئی تھی تو میرے بے حد اصرار پر، اور یہ جتا کر کہ وہ صرف میری خاطر آئی ہے۔ کاش الغریب کو معلوم ہوتا کہ مجھے اس کی کیا قیمت دینی پڑی۔ وہ بہت دیر تک آنکھیں بند کیے لیٹا رہا، اور جب آخر کار اس نے آنکھیں کھولیں تو کہا کہ بس بہت ہو چکا، اور اس نے فیصلہ کرلیا ہے کہ اس تعلق کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دے گا؛ وہ طلاق دے کر وردہ کو اس کے راستے پر چلا جانے دے گا۔ لیکن جس انداز سے اس نے کہا کہ ''میں نے فیصلہ کرلیا ہے،'' اس سے مجھے معلوم ہو گیا کہ اگرچہ وہ اپنی نیت میں مخلص ہے، لیکن اس کا فیصلہ الفاظ سے آگے کبھی نہیں بڑھ سکے گا۔

اس جیسا، شہرت اور طاقت کا حامل شخص آخر کیوں وردہ جیسی عورت کے پیچھے پڑا ہوا تھا؟ کیا وہ محبت تھی، جیسا کہ لوگ کہتے تھے؟ یا وہ اس بات کا جیتا جاگتا ثبوت تھا کہ اس کی شخصیت کے چند گوشے ایسے ہیں جہاں اس کا کوئی اختیار نہیں؛ اور عام آدمی کی طرح اس کی بھی حدود ہیں؟

فیصلہ درحقیقت وردہ کی طرف سے کیا گیا: جب میں دوسرے دن اس کے گھر گیا تو وہ وہاں نہ تھی۔ گھر خالی تھا۔ پڑوسیوں نے بتایا کہ وہ اپنے کپڑوں اور ساز و سامان کے ساتھ کہیں چلی گئی ہے۔ کہاں؟ یہ کسی کو علم نہ تھا۔

میں نے یہ خبر بچکانہ جوش کے ساتھ الغریب کو سنائی، یہ سوچے بغیر کہ اس بات کا اس پر کیا اثر ہو سکتا ہے۔ میں سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ اس کے چند گھنٹوں بعد مجھے اس کی آنکھوں میں آنسو نظر آئیں گے۔

لیکن ہم کہانی کی طرف لوٹتے ہیں۔ زخم اب بھر چلا تھا اور اس کی بو قابل برداشت ہو گئی تھی؛ اور الغریب نے کسی حد تک اپنی خود اعتمادی اور قوت بحال کر لی تھی اور دن میں مچھلیاں پکڑنے سے دل بہلانے لگا تھا۔ اس دوران میں ایک مسئلے پر غور کرتا رہا اور اس کا سامنا کرنے کے لیے رات کا انتظار کرنے لگا۔ میں نے اپنی زندگی پر تنقیدی نظر ڈالی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ میں سیڑھیوں پر کھڑا محورِ قص تھا،

نہ اوپر جاتا تھا اور نہ نیچے اترتا تھا: نہ میں الغریب کے آدمیوں جیسا بن رہا تھا اور نہ اپنی روزمرہ کی زندگی کی طرف لوٹ رہا تھا۔ میں اپنا گھر چھوڑ چکا تھا، پلٹ کر نگاہ تک نہ ڈالی تھی، اور اپنے خوابوں کی تکمیل کی آرزو میں خود کو الغریب سے منسلک کر لیا تھا؛ لیکن اب تک جو ہوا وہ بس یہ تھا کہ دونوں چیزیں — میرے خواب اور میری معمول کی زندگی — مجھ سے دور ہوتی جا رہی تھیں، اور میں محض ایک غلام کی سی زندگی گزار رہا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا اور بے صبری سے مناسب لمحے کا انتظار کرنے لگا جب میں اپنا فیصلہ اس پر آشکار کر سکوں۔

آخرکار کڑے انتظار کے بعد رات آئی۔ ہم نے شام کا کھانا ختم کیا اور ہمارے اردگرد ہر شے نے تاریکی کا لبادہ اوڑھ لیا۔ میں نے الغریب سے پوچھا کہ کیا میں اس سے ایک بات کر سکتا ہوں۔ اس کو فطری طور پر احساس ہو گیا کہ وہ کوئی ایسی بات ہے جس کا میں مزید متحمل نہیں ہو سکتا۔ انتہائی توجہ کے ساتھ اس نے میری بات سنی اور مجھے اس بات کا موقع دیا کہ پہلے میں اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے اپنی بے چینی کو کم کر لوں اور پھر سکون سے اصل بات پر آؤں۔ میں نے اسے صاف صاف بتا دیا کہ میں چاہتا ہوں وہ اپنا وعدہ پورا کر کے مجھے اس آرزو کی تکمیل میں مدد دے جس کی وجہ سے میں نے اپنی معمول کی زندگی ترک کر کے اس کی شاگردی اختیار کی تھی۔ وہ سنتا رہا، لیکن پھر — جیسے وہ جانتا نہ ہو — اس نے پوچھا کہ آخر میری آرزو کیا ہے۔ میں نے کہا:

''تم جانتے ہو میں کیا چاہتا ہوں۔ میں کسی کو قتل کرنا چاہتا ہوں۔''

''تو جاؤ، اور قتل کر دو کسی کو۔''

''میں نہیں جانتا کیسے کروں، جب تک تم مجھے نہ سکھاؤ۔''

''تمھیں یہ جاننے کی ضرورت نہیں ہے کہ قتل کس طرح کیا جاتا ہے۔ اگر تم کسی کو قتل کرنا چاہتے ہو تو بس تم قتل کر دیتے ہو۔''

میں نے محسوس کیا کہ وہ پھر اس کوشش میں ہے کہ مجھے اس سے باز رکھے؛ اور میں اپنے آپ کو مضبوط کر کے ہر چیز کے لیے تیار ہو گیا۔ میں نے، سنجیدہ لہجے میں، جو کچھ پہلے کہا تھا اس کو دہرانا شروع کیا، اور اس سے کہا کہ اس مقصد میں کامیابی حاصل کرنے میں میری مدد کرے؛ اور میں نے یہ بات اس پر واضح کر دی کہ اگر اس نے ایسا نہیں کیا تو اس کا مطلب ہوگا کہ وہ مجھے سنجیدگی سے نہیں لے

رہا ہے، میرا مذاق اڑا رہا ہے اور مجھے صرف اس لیے رکھے ہوئے ہے کہ میں دوڑ دوڑ کر اس کی خدمت کرتا رہوں۔

وہ تاسف میں اپنا نچلا ہونٹ کاٹنے لگا۔ اس نے آنکھیں موندلیں اور پھر کھول دیں۔

''ٹھیک ہے۔ اگر تم رات کے فرزند بننا ہی چاہتے ہو تو وہ کام کرو جو وہ اب تک نہ کر سکے — مجھے قتل کر دو۔ میں سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں۔ تم یہ کام کمشنر سے زیادہ بہتر طریقے سے کر سکتے ہو۔ میں ختم ہو چکا ہوں۔ جیسا کہ سعد زاغلول نے کہا تھا، بس بہت ہو چکا۔ مجھے قتل کر دو، اور تمھارا نام تاریخ میں ہمیشہ کے لیے زندہ رہ جائے گا، ایک ایسے شخص کی حیثیت سے جس نے الغریب کو ٹھکانے لگایا۔''

اگر میں نے یہ محسوس نہ کیا ہوتا کہ وہ یہ بات کہتے ہوئے انتہائی سنجیدہ ہے تو شاید میں اپنا غصہ برداشت نہ کر پاتا اور اسی وقت اٹھ کر چلا جاتا۔ حقیقت یہ تھی — مجھے اقرار کرنا پڑے گا — کہ میں نے اس کی اس تجویز پر لمحہ بھر غور کیا۔

میں نے مایوسی سے سر ہلایا اور ایک جھنجھلاہٹ بھری خاموشی میں ڈوب گیا؛ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا جواب دوں۔

لیکن وہ مسکرا رہا تھا۔ اس نے میرے کندھے نرمی سے تھپتھپائے، بالکل ایسے جیسے وردہ چھوا کرتی تھی۔

''ٹھیک ہے۔ ناراض نہ ہو۔ میں تمھیں کسی کو قتل کرنے دوں گا، اگر تم یہی چاہتے ہو۔ اور تم کو سند بھی مل سکتی ہے جو یہ ثابت کر دے کہ تم اس امتحان میں پورے اترے ہو۔ لو، یہ رہی بندوق۔ جو بھی پہلا شخص اس پل پر سے گزرے، کسی بھی جانب سے، تم اسے گولی مار دو گے۔''

میں خوشی سے اچھل پڑا اور پل کے آہنی شہتیر سے تقریباً ٹکرا کر، تکلیف سے چلایا:

''کیا تم سنجیدہ ہو؟''

''اگر تمھیں یقین ہے کہ تمھارا مطلب وہی ہے جو تم کہہ رہے ہو تو میں سنجیدہ ہوں۔ میں تم سے خوش تھا، بالکل اس طرح جیسے تم میرے بیٹے ہو، کیونکہ تم شریف ہو، پڑھے لکھے ہو، اچھے طور طریقوں کے مالک ہو، اور سمجھ سکتے ہو کہ یہ سب کیا ہے۔ میں تمھارے جیسا ہونے کی کوشش کر سکتا تھا، یا اپنے بیٹے کو تم جیسا بنانے کی آرزو کر سکتا تھا؛ لیکن اگر تم مجھ جیسا بننا چاہتے ہو اور اسکول کا طالب علم رہنے سے

مطمئن نہیں ہو تو پھر کیا کیا جا سکتا ہے۔ بات کافی آگے جا چکی ہے۔ اب یا تو تم پہلے راہ گیر کو قتل کرو گے یا میں تمھیں قتل کروں گا۔ اور میں شریف آدمی نہیں ہوں۔"

۱۳

پھر یوں ہوا کہ ہم پل کے نیچے سے نکل آئے اور رینگتے ہوئے اس دیوار تک پہنچے جو پل کے کنگورے سے متصل تھی۔ میرے پاس اطالوی مشین گن تھی اور ہم دونوں تقریباً جھک کر مستعد ہو گئے۔ ہماری آنکھیں تلاش میں اندھیرے کو چیرنے لگیں، کیونکہ چاند اب تک نہ نکلا تھا؛ اور ایک ایسے لہجے میں جو میرے لیے بالکل نیا تھا، الغریب نے سرگوشی میں کہا:

"جب تم اسے آتا ہوا دیکھو تو سب کچھ بھول کر اپنی توجہ اس پر مرکوز کر دو۔ نشانہ اس وقت تک نہ لو جب تک وہ تمھارے قریب نہ آ جائے، اس درخت کی سطح پر۔ نشانہ لیتے وقت اپنی سانس روکو۔ اور نشانہ اس کے سینے کے درمیان کا لو، اور پھر لبلبی دبا دو۔ جھجکو مت، ورنہ وہ تمھیں قتل کر دے گا۔ اسے مسلح جانو، اسے مار دو، یا مرنے کے لیے تیار رہو۔ اگر تمھارے اعصاب جواب دینے لگیں تو یہ تصور کرو کہ یہ وہ شخص ہے جس نے تمھارے باپ کو قتل کیا ہے۔ خواہ تمھارا باپ زندہ ہو، یہ فرض کرنا لازم ہے۔ اگر وہ پہلی دفعہ میں نہ گرے تو فوراً دوسری گولی چلا دو، اور پھر ایک اَور۔ اور اگر وہ گر پڑے تو پھر سے نشانہ لے کر ایک بار پھر گولی چلاؤ، اس کو بالکل ختم کرنے کے لیے۔"

زندگی میں پہلی دفعہ میں نے خود کو سکھائے جانے والے سبق کے لیے مکمل طور پر ہمہ تن گوش پایا۔ جو کچھ مجھے بتایا جا رہا تھا، میں اس کے ایک ایک لفظ پر غور کر کے اپنے اندر جذب کر رہا تھا۔ میری ہر پور، ہر سانس یہ سمجھ رہی تھی کہ آنے والے لمحے میں اسے کیا کرنا ہے۔ میں پیش آنے والے واقعے کی سنگینی میں پوری طرح ڈوب گیا اور ساتھ ہی ساتھ ایک سرور میں آ گیا: آخرکار میں ان کے راز پانے والا تھا، انھیں سیکھ رہا تھا، کیونکہ میں نے مطلوبہ نمبر حاصل کر لیے تھے۔ اگر الغریب کو مجھ پر اور میری صلاحیتوں پر اعتماد نہ ہوتا تو وہ کبھی اس بات پر راضی نہ ہوتا کہ میں اس طرح اس کا شاگرد بن جاؤں۔

اب وہ میرے برابر دوہرا ہوا بیٹھا تھا اور اس کی آواز اور جسم کی حرکات نے اس کی دوسری

شخصیت کے خدوخال ڈھالنے شروع کر دیے تھے: قاتل الغریب، حملے کی تیاری کرتا ہوا۔ لیکن جس چیز پر میری نظر پڑی اور جسے دیکھ کر ٹھنڈا پسینہ پھوٹ نکلا اور جس نے میرے سرور کو خوف میں تبدیل کر دیا، وہ اس کا ہاتھ تھا جو اس کے کپڑوں کے اندر چھپی ہوئی کلھاڑی کو گرفت کیے ہوے تھا—— وہی کلھاڑی جس نے شلابی کی کھوپڑی کھول دی تھی، اب میرے انتظار میں تھی، اگر میں اپنے مشن میں ناکام رہا۔

میں نے اچانک محسوس کیا کہ اس تمام اثنا میں، ان تمام دنوں میں میں اپنے خوابوں میں رہتا رہا تھا، ایک دوسری دنیا میں؛ اور اب وہ وقت آ چکا تھا، وہ لمحہ سر پر آن پہنچا تھا، جب مجھے اپنے جسم کو بھی خوابوں کی سرزمین میں لانا تھا۔ خواب دیکھنا اور چیز ہے اور اپنے جسم کو خواب کا حصہ بنانا ایک دوسری چیز۔ اور جب زندگی کا دارومدار ہی اس پر ہو تو کیا ہو؟

اس نے کہا، ''یہ لو!''

وہ ایک بیڑی تھی۔ میں نے ہمیشہ اس کے سامنے تمباکو نوشی سے انکار کیا تھا، لیکن اس وقت بیڑی میں نے اپنے مضبوط ہاتھوں میں لے لی، اس کو سلگایا اور ہم مردوں کی طرح کش لگانے لگے، اور میں خود کو مردوں کی طرح محسوس کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر اس نے کہا، ''جب یہ کام ہو جائے گا، ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔''

وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گیا اور پھر آنکھوں میں چمک لیے میری طرف مڑا۔ ''شاید تم خوش قسمت نکلو اور کوئی امیر شکار حاصل کر لو۔ خیر جو بھی ہو، جب تم اپنا کام کر چکو تو اس بات کا اطمینان کر لینا کہ بندوق تمھارے پاس ہے۔ اس کی تلاشی لینا، جو کچھ ہاتھ لگے رکھ لینا اور چلتے بننا۔ اور اس بات کا خیال رکھنا کہ کہیں اس کی تلاشی لیتے وقت تم خود اپنی کوئی چیز نہ گرا بیٹھو۔''

میں نے پُراعتماد نظر آنے کی کوشش میں سر ہلایا۔

وقت رینگ رہا تھا، اور ہم نے اپنے نامعلوم شکار کی جھلک کے انتظار میں دور فاصلے پر نظریں گاڑ رکھی تھیں۔ جوں جوں انتظار طویل ہوتا گیا، میرا ذہنی دباؤ ہر گزرتے ہوے لمحے کے ساتھ بڑھنے لگا یہاں تک کہ میری برداشت سے باہر ہو گیا؛ اور میرے جذبات کا لاوا ابلنے لگا۔ میں کھڑا ہونے ہی والا تھا، چیخنے ہی والا تھا، کہ مجھے اپنے بازو پر اس کے چھوٹے سے ہاتھ کا ہلکا سا دباؤ محسوس ہوا۔

''صبر! انتظار کرو۔ میں نے تم سے کہا ہے کہ اپنے جذبات، اپنی کیفیت کو بالکل فراموش کر دو۔

تمھیں سائیکل چلانا سکھاتے وقت کیا بتایا گیا تھا؟ کیا انھوں نے نہیں کہا تھا کہ سیدھے سڑک پر دیکھو، اپنے سامنے۔ یہ لازم ہے کہ تم اپنے اندر اپنی ذات میں نہ جھانکنے لگو، ورنہ تم بازی ہار جاؤ گے۔ صرف آنے والے پر توجہ مرکوز رکھو۔"

اس کے الفاظ نے کچھ اثر کیا؛ دباؤ کم ہوا، میں پرسکون ہو گیا، اور ایک بار پھر سامنے نظریں جما دیں۔

چاند نکلا۔ پہلے پہل اس کی روشنی مشرق سے نکلتے ہوئے سورج کی طرح تھی لیکن پھر وہ جیسے جیسے آسمان پر چڑھتا گیا— گول لیکن نامکمل— اس کی روشنی سفید ہوتی گئی، یہاں تک کہ وہ آسمان کے بیچوں بیچ پہنچ کر اس طرح لٹک گیا گویا دنیا کی چھت پر کوئی بلب لگا ہوا ہو۔ اب جبکہ رات کا سورج نکل آیا تھا اور مکمل تاریکی کی جگہ نامکمل روشنی نے لے لی تھی، ہمیں پل پر سے جاتی ہوئی اور پل سے آگے نکلتی ہوئی سڑک دکھائی دینے لگی، اور آدھی روشنی میں نہائے ہوئے دور کے کھیت اور قریب کی فصلیں نظر آنے لگیں۔ ہم اپنے اردگرد دیکھتے رہے، ہر تبدیلی کا غور سے جائزہ لیتے رہے؛ اور تب ہمیں اپنی طویل شبِ انتظار کا پھل ملا، اور ایک نقطہ مکمل سکوت کے درمیان حرکت کرتا ہوا نظر آیا۔

میرے دل نے اتنی تیزی سے دھڑکنا شروع کر دیا کہ میں اس کی آواز سن سکتا تھا، ایک تیز دھپ دھپ کی آواز جو کسی طرح ختم نہ ہوتی تھی۔ اس کے فوراً بعد ایک اور آواز آنے لگی— بہت دور اور مدھم لیکن لامحالہ کسی کے گانے کی آواز— اور پھر میرا دل وحشیانہ طور پر دوبارہ دھڑکنے لگا۔

مجھے محسوس ہوا جیسے وہ ایک سال کا عرصہ ہو جس عرصے میں چاند کی دن جیسی روشنی کے افق پر اس آواز کا مالک نمودار ہونا شروع ہوا۔ ابتدا میں وہ ایک سفید ساکت نقطے کی طرح نظر آیا، پھر حرکت کرتا ہوا، اور پھر کوئی ایسی مخلوق دکھائی دیا جس کا اوپر کا حصہ سفید تھا اور نیچے کا سیاہ۔ پھر یہ واضح ہوا کہ وہ ایک ایسا شخص تھا جو کسی جانور پر سوار تھا اور گا رہا تھا۔

میں اس انتظار میں تھا کہ الغریب کچھ کہے، لیکن اس نے میری خاموش التجا پر کوئی ردعمل ظاہر نہ کیا، اس وقت بھی نہیں جب میں نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس نے کچھ نہیں دیکھا، کچھ نہیں سنا؛ لیکن اس کی آنکھیں اس متحرک ہدف پر گویا کسی تار سے بندھی ہوئی تھیں، اور اس نے کلھاڑی پر اپنی گرفت ڈھیلی نہ کی تھی۔

میں نے مڑکر اس آدمی کو دیکھا، اس نمکین پسینے کے پار جو میری پیشانی پر بہہ کر میری آنکھوں میں چبھ رہا تھا۔ میں نے پسینہ پونچھا اور اس شخص پر نظریں جما دیں؛ میرا اس وقت تک نشانہ باندھنے کا کوئی ارادہ نہ تھا جب تک وہ درخت کی سطح تک نہ آ جائے۔

لہٰذا میں نے بندوق کی نالی کے اوپر سے اس کے جانور کی حرکت پر نظر رکھی اور پوری کوشش کے باوجود میں وہ لوک گیت سننے لگا جو وہ گا رہا تھا۔ اس کی آواز اچھی نہ تھی، اور نہ ہی گیت کے بولوں سے لگا کھاتی تھی، لیکن وہ ایک اونچی، بھرپور آواز تھی۔ وہ گا رہا تھا: ''اے رات...'' گویا اس نے خود کو رات کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا ہو اور اس سے التجا کر رہا ہو کہ اسے تمام شر سے محفوظ رکھے۔ اور جب اس نے گایا: ''اے آنکھو...'' تو میں نے تصور کیا کہ وہ اپنے آپ پر رو دیا ہے، کہ رات نے اس کی نہیں سنی۔ گانے میں محبوب کے باغ کا ذکر تھا جہاں خوبانی، انار اور نرگس کے پھول اگے ہوئے تھے اور کس طرح وہ اس باغ میں داخل ہونے اور پھل توڑنے جا رہا تھا۔ مجھے اس شخص کے اور جانور کے بیچ کوئی شے نظر آنے لگی: ایک بوری، جس میں یقیناً آٹا ہوگا؛ اور میں نے جان لیا کہ اسے چکی سے واپسی پر دیر ہوگئی ہے۔

اس اثنا میں الغریب ناقابلِ یقین حد تک غیر انسانی طریقے سے خاموش رہا، خاموشی جو اتنی گمبھیر، اتنی یقین دلانے والی تھی گویا اسے جان بوجھ کر پیدا کیا گیا ہو، تاکہ مجھے یوں محسوس ہو کہ وہ وہاں موجود ہی نہیں ہے؛ صرف رات میری رفیق ہے۔ اس خیال کے ساتھ کہ اب میں آزاد ہوں، الغریب کی موجودگی اور اس کی کلھاڑی سے آزاد، اور جو چاہوں کروں، مجھے محسوس ہوا جیسے کوئی بوجھ مجھ پر آن گرا ہو۔ میں خوفزدہ نہ تھا اور نہ کسی دباؤ میں تھا؛ جب بھی نظر چرا کر الغریب کو دیکھتا اور اسے قبر کی سی خاموشی میں گم پاتا، مجھے یقین ہونے لگتا کہ میں آزادانہ عمل کر رہا ہوں۔ میں اس صورت حال پر پوری طرح مختار تھا۔ میں مسلح تھا۔ رات اور حیرانی کے عناصر میری طرف تھے۔ پہلی دفعہ میں نے شاگردی کے جامے اور چیلے کی ذہنیت کو اتار پھینکا اور خود کو واقعتاً رات کا فرزند تصور کرنے لگا جو عمل کی قوت رکھتا ہے۔

اس اعتماد کی موج میں رواں، میں نے اپنے ہدف کی طرف دیکھنا شروع کیا۔ اس شخص اور اس مخصوص درخت کے درمیان اب صرف چند گز کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ اس کی آواز صاف اور واضح تھی اور گانے کے بول متناسب اور پختہ۔ شاید وہ گیت جو اس نے خوف کے زیرِ اثر شروع کیا تھا اپنا کام دکھا چکا تھا اور اس نے اسے دنیا سے ہم آہنگ کر دیا تھا؛ گیت اب انبساط سے لبریز تھا، گویا وہ گیت کے لیے

گا رہا ہو۔ وہ گا رہا تھا: ''اے رات...'' رات کی تاریک شان وشوکت کی تعریف میں، اور: ''اے آنکھو...'' ان آنکھوں کی بدقسمتی پر جو محوِ خواب تھیں اور رات کے حسین نظارے سے محروم تھیں۔

ایک منٹ کے اندر اندر مجھے اس شخص کو ختم کرنا تھا جو نغمے کے سرور اور گائیکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ بندوق کی نالی اس کی پیش قدمی پر نظر رکھے ہوئے تھی، اور جیسے ہی وہ درخت کی سطح پر آتا، مجھے نشانہ لینا تھا، اور گولی چلانی تھی۔

میں کہتا ہوں کہ ''مجھے قتل کرنا تھا''، اور اُس وقت ''قتل'' صرف ایک لفظ تھا میرے لیے۔ اب اس کے اردگرد نہ کوئی ہالہ تھا اور نہ کوئی کشش۔ وہ صرف ایک خالص عملی کارگذاری تھی جس کے لیے مجھے اپنی سانس روک لینی تھی، نشانہ لینا تھا، اور پھر داہنے ہاتھ کی شہادت کی انگلی سے ہلکی سی حرکت کے ساتھ لبلبی دبانی تھی۔

وہ شخص کافی نزدیک آچکا تھا، اور اس کے اور درخت کے درمیان صرف ایک گز کا فاصلہ رہ گیا تھا۔

میں نے سانس روک لی اور اپنے آپ کو یہ باور کرانے کی کوشش کرنے لگا کہ میرے ہاتھ میں دنیا بھر کا سیسہ بھر گیا ہے تاکہ اس کا ہلکا سا ارتعاش تک روک لوں اور اس کے سینے کو نشانہ بنائے رکھوں۔ میں یہ تصور کرنے لگا کہ میرا باپ اسی رات کو قتل ہوا ہے اور یہ شخص میرے باپ کا قاتل ہے جو جائے واردات سے لوٹ رہا ہے۔ لبلبی پر ایک ہلکے سے دباؤ سے سب کچھ تمام ہو جائے گا؛ میں رات کی سلطنت میں اس کے سب سے خوفناک دروازے سے اندر داخل ہو جاؤں گا۔ ایک معمولی سی حرکت، ایک ہلکا سا دباؤ۔

اس کے بعد میں نہیں کہہ سکتا کہ کیا ہوا۔ مجھے جو کچھ یاد ہے وہ چاند کی روشنی تھی اور اس شخص کا حیرت انگیز طور پر اجلا سفید جلابیہ، اور اس کا گیت جو اتنا خوبصورت لگ رہا تھا کہ اس نے درخت کی چوٹیوں پر بیٹھے پرندوں کو اسے سننے پر تقریباً مجبور کر دیا تھا۔ اور اس کا وہ احساس — دنیا سے اور اپنے آپ سے ہم آہنگی کا احساس — جو اس کے ساتھ رہا، درخت کی سطح تک آجانے اور اس سے آگے نکل جانے کے بعد بھی۔ سب کچھ مختلف ہوتا، میری زندگی آج کسی اَور ڈگر پر ہوتی، اگر اس شخص نے ذرا بھی خوف کا مظاہرہ کیا ہوتا، اگر وہ گیت گاتے گاتے چپ ہو گیا ہوتا، یا اگر اس نے خطرے کی بو سونگھ لی

ہوتی، یا شاید اگر میں نے زیادہ پُر اثر طور پر تصور کیا ہوتا کہ اس نے میرے باپ کو قتل کیا ہے، یا ہم دونوں کے اختیار سے باہر کوئی واقعہ ہوا ہوتا، یا کوئی ایسی بات پیش آئی ہوتی جس سے اس کے ارد گرد تنی ہوئی، اس کے ساتھ ساتھ چلتی، شر کے اثر کو کاٹتی ہوئی اس ناقابلِ تسخیر دیوار میں کوئی دراڑ پڑ جاتی۔ میں آج تک نہ جان سکا کہ میری انگلی نے وہ معمولی سی حرکت کیوں نہ کی اور لبلبی کیوں نہ دبائی۔ میرے لیے یہ سمجھنا بہت مشکل ہے کہ وہ آواز جو میری روح کی گہرائیوں سے، میری انگلیوں کی پوروں سے، میرے بالوں کی جڑوں سے نکلی، اور وہ آواز میں نے اس سے پہلے کبھی نہ سنی تھی۔ نہ کبھی اس کے وجود پر غور کیا تھا، اور نہ کبھی یہ سوچا تھا کہ عین موقعے پر میرے اندر کی آواز مجھے حکم دے گی: ''تم یہ نہیں کرو گے۔''

ہر وقت بے سوچے سمجھے، ہم دوسروں پر پابندیاں لگاتے ہیں اور یا تو ان کو قبول کر لیتے ہیں یا مسترد کر دیتے ہیں؛ لیکن اپنے آپ پر پابندی لگانے کا میں نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا، اور اس آواز نے مجھے بالکل منتشر کر دیا۔ یہ کیونکر ہوا؟ یہ خیال مجھے اب تک الجھن میں ڈال دیتا ہے۔

میرے جسم کے ہر حصے سے پسینہ پھوٹنے لگا۔ میری ہتھیلی اور میری اسی انگلی کی پور میں چھوٹے چھوٹے سمندر ابھرنے لگے جو اس تمام کارروائی میں مرکزی کردار ادا کرنے والی تھی۔ بندوق تقریباً میری گرفت سے نکل گئی، اور میں نے جتنی مرتبہ لبلبی دبانے کی کوشش کی، میری انگلی پھسل جاتی رہی۔ میرا پسینہ بھی بلاشبہ میرے ارادے کی کمزوری کا مظہر تھا، وہ قوتِ ارادی جس کو میں نے اپنے اندر کی آواز کے خلاف طلب کرنے کی کوشش کی؛ اس آواز پر لعنت بھیجتے ہوئے، اس پر جھنجھلاتے ہوئے، اس کے ماخذ کو تلاش کرتے ہوئے جس نے میری قوتِ ارادی کو ہوا میں تحلیل کر دیا تھا، اور میرے جسم کے ہر حصے کو، انگلیوں کے ایک ایک جوڑ تک کو مفلوج کر دیا تھا۔

آخر کار میں نے اس آواز کے ماخذ کو پہچان لیا: وہ شخص — اونچی آواز میں گاتا ہوا، اپنے ارد گرد کی دنیا کا آقا۔ بظاہر اس کو شر کے وجود کی بیش بینی نہ ہوئی تھی۔ اور اس کی جھلک نظر آتے ہی — اس کا صافہ اور سفید جلابیہ اور اس کی آٹے کی بوری — مجھے محسوس ہوا کہ اس کے اور میرے درمیان جو فاصلہ تھا وہ ہوا میں تحلیل ہو گیا ہے۔ میں اس کے گیت کے بولوں کو سمجھ رہا تھا، مجھے اس میں معنی نظر آ رہے تھے، اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا گویا وہ میرے لیے نغمہ سرا ہو: شاید مجھے خوش آمدید کہنے کے لیے۔ جانور کی پشت پر اس کی چھڑی اور گیت کی تال کے ساتھ اس کا رکاب میں پیر ہلانا اور اس کے گلے کی ہر گونج،

میرے لیے ایک تحکمانہ فرمان تھی: ''تم یہ نہیں کرو گے۔'' آخر میں اس کی ہر جنبش، جس سے اس کے انسان ہونے کا ثبوت ملتا تھا، میرے اندر یہی ردِعمل پیدا کرنے لگی، یہاں تک کہ وہ انداز بھی جو نوع انسان کے لیے مخصوص ہے — جس طرح وہ سواری کی پشت پر گردن تانے بیٹھا تھا — ان تمام اثرات نے میرے اندر اکٹھا ہو کر اس کے اطراف ایک ناقابلِ تسخیر مدافعت پیدا کر دی اور وہ اس طرح حرکت کرتا ہوا نظر آنے لگا گویا ایک مقدس حصار میں ہو، وہ حصار جو پھیل کر بالآخر مجھے چھو رہا تھا اور جس نے مجھے منجمد کر دیا تھا — یہ سب کچھ مجھ پر اس حد تک اثر انداز ہوا کہ جب وہ پل پر بال بھر کے فاصلے پر تھا اس کی نظر ہم پر پڑی؛ اس نے سلام کیا؛ بندوق میری گرفت سے نکلتی ہوئی معلوم ہوئی اور میں نے خود کو جواب دیتے ہوئے پایا: ''وعلیکم السلام۔''

جب وہ ہمارے عین متوازی ہوا تو اس نے معافی چاہی کہ سواری سے اتر کر سلام کرنے کے بجائے وہ اس پر بیٹھا ہوا گزر رہا ہے۔ ایک آواز — جس کو میں یکسر بھلا چکا تھا — میرے قریب سے آئی: ''سلام۔ کوئی بات نہیں۔''

میں نے تمام تفصیل سے اپنے مقدر کو یاد کیا جو میرا منتظر تھا۔ عجب بات یہ تھی کہ میں بے خوف تھا اور مکمل بے اعتنائی سے مرنے کے لیے تیار تھا۔

۱۴

لیکن الغریب نے مجھے قتل نہیں کیا اور نہ اس شخص پر حملہ کیا۔ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے بولنا شروع کیا لیکن اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''اس کی کوئی ضرورت نہیں... کلھاڑی تمھارے لیے تیار تھی، یہ حقیقت ہے۔'' میں نے پوچھا، پھر اس نے استعمال کیوں نہ کی۔ مجھے تعجب ہوا جب اس نے کہا کہ وہ کلھاڑی صرف اس وقت استعمال کرتا اگر میں نے اس شخص کو قتل کیا ہوتا۔ اس بات نے مجھے حیران کر دیا اور میں اسے سننے پر مجبور ہو گیا، گو کہ اس نے کچھ زیادہ کہا نہیں۔ جو کچھ اس نے کہا اس کا لب لباب یہ تھا کہ گو وہ خود جرائم اور قتل و غارت میں سر تک ڈوبا ہوا تھا، اگر میں چاہتا بھی تو وہ مجھ کو اس راستے پر جانے نہیں دے سکتا تھا۔ میں اگر ایک دفعہ قتل کر بیٹھتا تو پھر پیچھے مڑ کر دیکھنا

بے کار تھا؛ میں اس کی طرح بن جاتا اور ایک المناک زندگی گزارتا جیسی اس نے گزاری: خود مدافعتی میں، دوسروں کی زندگیاں برباد کرکے، خود اذیت میں مبتلا اور دوسروں کو اذیت پہنچاتے ہوئے، ان سے شدید نفرت کرتے ہوئے اور ان کی شدید نفرتوں کا نشانہ بنتے ہوئے۔ اور آخر میں میں شلابی کی طرح غدار ہو جاتا۔ اگر میں عزت اور اعتماد کے ساتھ لوگوں سے پیش آتا تو مجھے اپنی جان کی قیمت ادا کرنی پڑتی۔ اور اگر میں ہر شخص پر شک وشبہ نہ کرتا، خواہ وہ کتنے ہی سچے اور پرخلوص کیوں نہ ہوں، تو میں کہیں کا نہ رہتا۔

''یہ ایک بھیانک زندگی ہوتی ہے جب تم کسی پر بھروسا نہیں کرتے اور کوئی تم پر اعتماد نہیں کرتا۔ نہ تم کسی کی بات کا یقین کرتے ہو اور نہ کوئی تم پر یقین کرتا ہے۔ اس سے بہتر ہے کہ تم مر جاؤ؛ مگر المیہ یہ ہے کہ تم خود اپنی جان نہیں لے سکتے۔ تم جتنے لوگوں کو چاہو قتل کر سکتے ہو لیکن تم خود کو ختم نہیں کر پاتے۔ اس وجہ سے میں تم پر ترس کھا کر تم کو قتل کر دیتا۔ بس میری خواہش ہے کہ کاش میری کبھی ایسے شخص سے ملاقات ہو جائے جو مجھ پر یہ مہربانی کر سکے۔''

وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گیا، چاند کو گھورتا رہا اور پھر گویا خود سے مخاطب ہو کر بولا:

''اگر تم اسے قتل کر دیتے تو کم از کم مجھے یہ معلوم ہو جاتا کہ اب تم پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کوئی ایک دفعہ قتل کر بیٹھے تو وہ اس مادہ بھیڑیے کی طرح ہو جاتا ہے جو اپنے ہی بچوں کو کھا جاتی ہے، پاگل کتے کی طرح جو بلا تخصیص ہر ایک پر جھپٹ پڑتا ہے، چاہے وہ اس کے دوست اور ساتھی ہی کیوں نہ ہوں۔ کچھ اور نہیں تو تم میری مخبری ہی کر دیتے۔''

وہ خاموش ہو گیا اور بندوق مجھ سے لے لی، اس کا معائنہ کیا اور پھر بولا:

''یہ بات واضح ہے کہ اب مجھے بیدار ہونا ہوگا۔ ورنہ میں تم کو اسی گڑھے میں لے جاؤں گا جس میں خود پڑا ہوا ہوں۔ میں نے اب تک تم پر بہت زیادتی کی ہے۔ اس تمام دوران میں یہ امید کرتا رہا ہوں کہ ایک دن میں اپنی آنکھیں بند کر لوں گا اور جب انھیں دوبارہ کھولوں گا تو خود کو تمھارا باپ اور تمھیں اپنا بیٹا پاؤں گا۔ لیکن ظاہر ہے تمھارے حقیقی باپ کو مجھ پر ترجیح حاصل ہے۔ اب تم یہاں سے چلے جاؤ۔''

میں بوکھلا گیا۔ جو کچھ وہ کہہ رہا تھا میں اس میں غرق تھا اور اس کے آخری الفاظ نے مجھے حیرت

میں ڈال دیا۔اس کا لہجہ بالکل بدلا ہوا تھا اور اس کی آواز فیصلہ کن اور واضح تھی، کسی ہچکچاہٹ اور رحم کی جھلک سے مبرا۔ میں نے پھٹی پھٹی حیران آنکھوں سے اسے دیکھا اور اس نے مجھے جواب میں جامد، سخت سرد اور درشت نگاہوں سے گھورا۔ ''جاؤ۔ بھاگو۔ اور بھاگتے رہو جب تک گھر نہ پہنچ جاؤ۔''

ایک بھیانک دھماکا ہوا اور گرم ہوا کا ایک جھونکا میرے کندھے کے بالکل اوپر سے، تقریباً کان کو اڑاتا ہوا گزر گیا۔ جب میں اپنے حواس میں آیا تو سرپٹ بھاگ رہا تھا۔ دور فاصلے پر ایک اور دھماکا ہوا اور میرے سر کے اوپر سے گولیوں کی ایک باڑھ ہوا میں سوراخ کرتی ہوئی گزری۔ لیکن میں نے ہمت کر کے، دوڑتے دوڑتے مڑ کر الغریب پر ایک نظر ڈالی — یہ جانتے ہوئے کہ یہ اس کی آخری جھلک ہے۔ شاید وہ میرا واہمہ ہو لیکن مجھے یوں لگا گویا میں ساکت ہوں اور وہ بھاگ رہا ہے۔ وہ بے حد بوڑھا نظر آ رہا تھا؛ اس کے کندھے بوجھ سے جھکے ہوئے تھے۔ اس کا منحنی سا ہیولا رات میں اترتا جا رہا تھا، اس کی گہرائیوں میں ڈوبتا اور سیاہی کے ساتھ مدغم ہوتا ہوا، تاریکی میں جو پیچھے ہٹ رہی تھی، صبح کی روشنی سے پسپا ہو رہی تھی۔

❋❋

گابریئل گارسیا مارکیز

تنہائی کے سو سال

ا

بہت برسوں بعد، فائرنگ اسکواڈ کا سامنا کرتے ہوے، کرنل اور یلیانو بوئندیا ماضی کی اُس دور دراز سہ پہر کو یاد کرنے والا تھا جب اس کا باپ زندگی میں پہلی بار اسے برف دکھانے لے گیا تھا۔ اس وقت ماکوندو مٹّی کے بیس گھروں پر مشتمل گاؤں تھا، جو ایک ایسے دریا کے کنارے بنائے گئے تھے جس کا شفاف پانی چکنے پتھروں کے پاٹ پر بہتا تھا۔ یہ پتھر ماقبلِ تاریخ کے انڈوں کی مانند سفید اور عظیم الجثہ تھے۔ دنیا اتنی تازہ تھی کہ بہت سی چیزوں کے کوئی نام نہ تھے، اور ان کا ذکر کرتے وقت اُن کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہوتا۔ ہر سال مارچ کے مہینے میں مفلوک الحال خانہ بدوشوں کا ایک قبیلہ گاؤں کے قریب اپنے خیمے لگاتا، اور نقاروں اور بانسریوں کے شوروغل کے ساتھ نت نئی ایجادات کا مظاہرہ کرتا۔ پہلے وہ مقناطیس لائے۔ غیر مانوس ڈاڑھی اور چڑیا کے سے ہاتھوں والے ایک بھاری بھرکم خانہ بدوش نے، جس نے اپنا تعارف ملکیادیس کے نام سے کرایا، لوگوں کے سامنے، بقول اس کے، مقدونیہ کے عالم کیمیاگروں کے آٹھویں عجوبے کا ایک جید مظاہرہ پیش کیا، اور لوگ ششدر ہو کر، اپنی اپنی جگہوں سے گر کر دھات کے پیچھے لڑھکتی دیگچیوں، کڑھائیوں، چمٹوں اور انگیٹھیوں کو، کیلوں اور پیچوں کی بے قراری سے تڑختے شہتیروں کو، اور ان اشیا کو جنھیں گم ہوے مدتیں ہو چکی تھیں، انھی کونوں کھدروں سے جہاں انھیں سب سے زیادہ تلاش کیا گیا تھا، نمودار ہوتے دیکھتے رہ گئے، جو ایک ہنگامہ خیز افراتفری میں ملکیادیس کے طلسمی ڈلوں کے پیچھے گھسٹتی چلی آ رہی تھیں۔ ''اشیا کی اپنی زندگی ہوتی ہے،'' خانہ بدوش

نے کرخت لہجے میں اعلان کیا، ''صرف ان کی روحوں کو بیدار کرنے کی بات ہے۔'' حوزے آرکا دیو بوئندیا نے، جس کا تخیل ہمیشہ فطرت کی قوتوں سے، بلکہ معجزوں اور طلسمات سے بھی پرے جاتا تھا، سوچا کہ اس بے مقصد ایجاد کے ذریعے زمین کے پیٹ سے سونا نکالا جاسکتا ہے۔ ملکیا دیس نے، جو ایک دیانت دار انسان تھا، اس کو خبردار کیا: ''اس سے یہ کام نہیں لیا جاسکتا۔'' لیکن حوزے آرکا دیو بوئندیا اُن دنوں خانہ بدوشوں کی دیانت پر ایمان نہ رکھتا تھا، لہٰذا اس نے اپنے خچر اور دو بکریوں کے عوض مقناطیسی ڈلے خرید لیے۔ اس کی بیوی اُرسلا اگواران، جو اپنے مختصر گھریلو مال و اسباب میں اضافے کے لیے ان جانوروں پر انحصار کرتی تھی، حوزے آرکا دیو کو اس حرکت سے باز نہ رکھ سکی۔ ''بہت جلد ہمارے پاس کافی سونا ہوگا اور ہم گھر کا فرش پکا کرواسکیں گے،'' اس کے شوہر نے کہا۔ وہ کئی مہینوں تک اس خیال کو سچ ثابت کرنے میں لگا رہا۔ مقناطیسی ڈلوں کو گھسیٹتے ہوئے اور ملکیا دیس کے منتر بہ آوازِ بلند پڑھتے ہوئے، حوزے آرکا دیو بوئندیا نے اُس خطے کا ایک ایک انچ کھوج لیا، یہاں تک کہ دریا کی تہہ بھی کھنگال ڈالی۔ جو کچھ وہ کھود نکالنے میں کامیاب ہوا وہ پندرھویں صدی کا ایک زرہ بکتر تھا، جو زنگ خوردگی سے جڑا ہوا تھا، اور جس کے اندر پتھروں سے بھرے ہوئے ایک بہت بڑے تونبے کی گونج سنائی دیتی تھی۔ جب حوزے آرکا دیو بوئندیا اور اس کی مہم کے چار آدمی زرہ بکتر کو کھولنے میں کامیاب ہوئے تو اس کے اندر سے ایک بُھر بُھرایا ہوا انسانی ڈھانچا برآمد ہوا، جس کے گلے میں تانبے کا ایک لاکٹ جھول رہا تھا۔ لاکٹ کے اندر کسی عورت کے بالوں کی ایک لٹ تھی۔

مارچ میں خانہ بدوش واپس آئے۔ اس دفعہ وہ اپنے ساتھ دوربین، اور طبل برابر محدب عدسہ لائے، جسے انھوں نے ایمسٹرڈیم کے یہودیوں کی ایجاد کہہ کر متعارف کرایا۔ انھوں نے ایک خانہ بدوش عورت کو گاؤں کے ایک سرے پر بٹھا دیا اور خیمے کے سامنے دوربین لگا کر بیٹھ گئے۔ پانچ سکوں کے عوض لوگ دوربین میں جھانک کر عورت کو ہاتھ بھر فاصلے پر بیٹھا دیکھ سکتے تھے۔ ''سائنس نے فاصلے مٹا دیے ہیں،'' ملکیا دیس نے اعلان کیا۔ ''بہت جلد کوئی بھی شخص گھر بیٹھے دیکھ سکے گا کہ دنیا کے کسی بھی خطے میں کیا ہو رہا ہے۔'' دوپہر کے جلتے سورج نے محدب عدسے کے ساتھ ایک حیرت انگیز تماشا کیا: انھوں نے گلی کے بیچ خشک بھوسے کی ایک ڈھیری لگائی، اور شعاعوں کو مرتکز کر کے اس میں آگ بھڑکا دی۔ حوزے آرکا دیو بوئندیا کو، جس کی اپنے مقناطیسوں کی ناکامی کے بعد سے اب تک دل جوئی نہ ہو سکی تھی،

عدسے کو جنگی ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے کا خیال آیا۔ ملکیادیس نے ایک بار پھر اس کو باز رکھنے کی کوشش کی، لیکن آخر کار دو مقناطیسی ڈلوں اور نو آبادیاتی زمانے کے تین سکوں کے عوض حوزے آرکادیو بوئندیا کو محدب عدسہ دے دیا۔ اُرسلا پریشانی سے رو دی۔ وہ پیسے سونے کے سکوں سے بھرے صندوق سے نکالے گئے تھے جو اس کے باپ نے عمر بھر روکھی سوکھی کھا کر جوڑے تھے، اور جو اُرسلا نے کسی مناسب وقت پر استعمال میں لانے کے لیے پلنگ کے نیچے زمین میں دبا رکھے تھے۔ حوزے آرکادیو بوئندیا نے ارسلا کو تسلی دینے کی کوئی کوشش نہ کی، اور کسی سائنس دان کی سی نفس کشی کے ساتھ، خود اپنی سلامتی کی بھی پروا کیے بغیر، حربی تجربات میں محو ہو گیا۔ دشمنوں کی فوج پر عدسے کے اثرات کے مظاہرے کی ایک کوشش میں، وہ سورج کی شعاعوں کے ارتکاز کا خود شکار ہو کر اپنا جسم کئی جگہ سے جلا بیٹھا، اور ان زخموں کے بھرنے میں طویل عرصہ لگا۔ بیوی کے احتجاج پر، جس کو اس خطرناک ایجاد پر بے حد تشویش تھی، ایک موقعے پر حوزے آرکادیو بوئندیا جھنجھلا کر گھر کو آگ دکھانے لگا تھا۔ وہ مسلسل کئی کئی گھنٹے اپنے کمرے میں بند، اس انوکھے ہتھیار کے حربی امکانات کا جائزہ لیتا رہتا، یہاں تک کہ وہ ایک ایسا ہدایت نامہ تیار کرنے میں کامیاب ہو گیا جو حیرت انگیز طور پر اطلاقی صراحت، اور ایک ناقابلِ تعریف یقینِ کامل کے ساتھ لکھا گیا تھا۔ یہ کتابچہ اس نے اپنے لاتعداد تجربوں کی تفصیلات اور خاکوں کے ساتھ نتھی کر کے، ایک قاصد کے ہاتھ حکومت کو روانہ کیا، جو پہاڑوں کو عبور کرتا، لامتناہی دلدلوں میں گم ہوتا، سرکش دریاؤں کو پار کرتا، وباؤں، خونخوار جانوروں اور نااُمیدیوں سے قریب المرگ تھا کہ اس نے ایک ایسا راستہ پا لیا جسے ڈاک لے جانے والے خچر استعمال کیا کرتے تھے۔

اس حقیقت کے باوجود کہ دارالخلافے تک پہنچنا ناممکن حد تک مشکل تھا، حوزے آرکادیو بوئندیا نے ٹھان لی کہ جیسے ہی حکومت اسے فوج کے سامنے اس ایجاد کا عملی ثبوت دینے اور فوجیوں کو پیچیدہ شعاعی جنگ کے رموز سکھانے کا حکم دے گی، وہ اس مہم پر نکل کھڑا ہو گا۔ کئی سال تک اس نے جواب کا انتظار کیا۔ آخر کار انتظار سے تھک کر اس نے ملکیادیس کے سامنے اپنے تجروں کی ناکامی کا رونا رویا۔ خانہ بدوش نے دیانت داری کا تسلی بخش ثبوت دیتے ہوئے محدب عدسہ واپس لے کر حوزے آرکادیو بوئندیا کو مقناطیسی ڈلے لوٹا دیے، اور اس کے ساتھ کچھ پُرتگالی نقشے اور جہاز رانی کے چند آلات بھی اس کے پاس چھوڑ دیے۔ اس نے راہب ہیرمن کی تحقیقات کا مختصر خلاصہ خود تحریر کر کے حوزے آرکادیو کو دیا

تا کہ وہ اسطرلاب، قطب نما اور زاویہ پیما کو کام میں لا سکے۔ حوزے آرکادیو بوئندیا نے برسات کے طویل ماہ اس چھوٹے سے کمرے میں بند ہو کر تجربات کرنے میں گزارے جسے اس نے مکان کے عقب میں تعمیر کیا تھا تا کہ کوئی اس کے تجربات میں خلل انداز نہ ہو سکے۔ اپنی خانگی ذمے داریوں سے یکسر بے نیاز ہو کر، وہ تمام رات صحن میں بیٹھا ستاروں کی چالیں دیکھا کرتا، اور دوپہر کے درست وقت کا تعین کرنے کے چکر میں اسے لُو لگتے لگتے بچی۔ جب وہ اپنے آلات کے استعمال میں طاق ہو گیا تو اس کے ذہن میں خلا کا ایسا نظریہ آیا جس کی مدد سے وہ اپنے کتب خانے سے نکلے بغیر انجانے سمندروں کا سفر، غیر آباد خطوں کی سیر اور شاندار ہستیوں سے تعلق قائم کر سکتا تھا۔ یہ وہ دن تھے جب اس نے خود سے باتیں کرنے اور گھر میں کسی کی طرف متوجہ ہوئے بغیر چلنے کی عادتیں اپنالی تھیں۔ اس دوران اُرسلا اور بچوں کی، باغ میں کیلے، کلا ڈیئم، شکرقند، آہو یاما اور بینگن اُگا اُگا کر، کمر ٹوٹنے لگی تھی۔ پھر اچانک، کسی اطلاع کے بغیر، حوزے آرکادیو بوئندیا کی ہذیانی سرگرمی کی جگہ ایک فسوں کی سی کیفیت نے لے لی۔ اس نے کئی دن یوں گزارے جیسے کسی سحر میں ہو؛ اپنی سمجھ پر اعتبار کیے بغیر وہ سرگوشیوں میں خوفناک قیاسات بڑبڑاتا رہتا۔ آخر دسمبر کے مہینے میں، منگل کے روز، دوپہر کے کھانے کے وقت، اس نے اپنی اذیت کا تمام بوجھ اچانک اتار پھینکا۔ بچے اپنے باپ کی، جو طویل بے خوابی اور اپنے تخیل کے قہر سے تباہ ہو چکا تھا، اس جلیل القدر متانت کو عمر بھر یاد رکھنے والے تھے جس کے ساتھ اس نے اپنی دریافت ان پر منکشف کی:

''دنیا گول ہے، نارنگی کی طرح۔''

ارسلا سے ضبط نہ ہو سکا۔ ''اگر تم کو پاگل ہونا ہی ہے تو براہِ کرم خود پاگل ہو،'' وہ چلائی، ''اپنے خانہ بدوشوں کے سے خیالات بچوں کے سروں میں نہ گھساؤ۔'' بے حس حوزے آرکادیو بوئندیا اپنی بیوی کی مایوسی سے خوفزدہ نہ ہوا، جس نے طیش میں آ کر اسطرلاب فرش پر دے مارا۔ اس نے اسطراب دوبارہ بنالیا، گاؤں کے مردوں کو تنگ کمرے میں جمع کیا اور اپنے نظریات کی مدد سے، جنھیں کوئی نہ سمجھ سکا، اس امکان کو ثابت کرنے میں لگ گیا کہ مسلسل مشرق کی سمت سفر کرنے پر کوئی بھی شخص اُسی جگہ واپس پہنچ سکتا ہے جہاں سے اس نے سفر کا آغاز کیا ہو۔ گاؤں بھر کو یقین ہو چلا تھا کہ حوزے آرکادیو بوئندیا کا دماغ چل گیا ہے۔ تب ملکیادیس نے آ کر معاملہ سلجھایا۔ اس نے لوگوں کے سامنے اس شخص کی ذہانت

کوسراہا جس نے خالصتاً علم ہیئت کے قیاس پر مبنی ایک ایسا نظریہ پیش کیا جو پہلے ہی عملی طور پر ثابت کیا جا چکا تھا، گو کہ ماکوندو میں اب تک کسی کو اس کا علم نہ تھا۔ تحسین کے ثبوت کے طور پر اس نے حوزے آرکادیو بوئندیا کو ایک ایسا تحفہ دیا جو گاؤں کے مستقبل پر گہرا اثر ڈالنے والا تھا: ایک کیمیاگر کی تجربہ گاہ۔

تب تک ملکیادیس حیرت انگیز سرعت کے ساتھ بوڑھا ہو گیا تھا۔ ابتدائی پھیروں میں وہ حوزے آرکادیو بوئندیا کا ہم عمر نظر آتا تھا۔ لیکن جبکہ موخر الذکر نے اپنی غیر معمولی قوت کو برقرار رکھا تھا، جس کے ذریعے وہ گھوڑے کو کانوں سے پکڑ کر روک سکتا تھا، خانہ بدوش لگتا تھا کسی بیماری سے اندر ہی اندر گھلتا جا رہا ہے۔ درحقیقت اس کا یہ حال ان متعدد اور غیر معمولی بیماریوں کی وجہ سے ہوا جن کا وہ دنیا کے گرد بے شمار چکر لگاتے ہوئے شکار ہوا تھا۔ جیسا کہ تجربہ گاہ میں آلات ترتیب سے رکھنے میں حوزے آرکادیو بوئندیا کی مدد کرتے وقت بات چیت کے دوران خود اس نے کہا، موت اس کے تعاقب میں تھی، اس کے پائنچوں کو سونگھتی پھرتی، لیکن اپنے پنجے اس پر گاڑنے کا فیصلہ نہ کر پاتی۔ ملکیادیس اُن تمام طاعونوں اور ناگہانی آفتوں سے بچ کر آیا تھا جو نوعِ انسان پر حملہ آور ہوئی تھیں۔ وہ فارس میں پیلا گرا، ملایا کے جزائر میں اسقربوط، اسکندریہ میں کوڑھ، جاپان میں بیری بیری، مدغاسکر میں کالے طاعون، سِسلی میں زلزلے اور آبنائے ماگیلان میں سمندری طوفان سے بچ نکلا تھا۔ ملکیادیس ایک دل گیر شخص تھا، اداسی کے ہالے میں گھرا ہوا ایک ایسا انوکھا بشر جس کے پاس کہا جاتا تھا ناستراڈیمس کی پیش گوئیوں کی شرحیں تھیں؛ ایک ایسی نگاہ کا حامل جو اشیا کے پار دیکھ سکتی تھی۔ وہ ایک بڑا سا کالا ہیٹ پہنے رہتا، جو بڑے بڑے پر پھیلائے پہاڑی کوے کی مانند لگتا، اور ایک مخملی واسکٹ جس پر صدیوں کی چکنی تہہ جمی ہوئی تھی۔ لیکن اس کے علم و فراست، اور اس کی پُراسرار وسعتِ نگاہ کے باوجود، اس کا ایک انسانی وجود تھا، ایک بوجھ، ایک دنیاوی کیفیت، جو اس کو روزمرہ کے مسائل میں الجھائے رکھتی۔ وہ ضعیفی میں لاگو ہونے والی بیماریوں کا رونا روتا، اور معمولی پریشانیوں سے دوچار رہتا۔ ہنسنا وہ ایک عرصہ ہوا ترک کر چکا تھا، کیونکہ اس کے دانت اسقربوط کی بیماری میں گر گئے تھے۔ اس حبس زدہ دوپہر کو، جب خانہ بدوش اپنے راز اس پر آشکار کر رہا تھا، حوزے آرکادیو بوئندیا کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ ان دونوں کے درمیان ایک عظیم دوستی کا آغاز ہو رہا ہے۔ بچے اس کی عجیب و غریب داستانیں حیرت زدہ ہو کر سن رہے تھے۔ اور یلیانو، جو اس وقت پانچ سال سے زیادہ کا نہ ہو گا، زندگی بھر ملکیادیس کو اسی طرح یاد رکھنے والا تھا

جیسا اس نے اس دوپہر کو دیکھا تھا: دھات کی سی چمکیلی اور مرتعش روشنی میں بیٹھا، تخیل کی تاریک ترین گپھاؤں کو اپنی بھاری گونج دار آواز سے روشن کرتا ہوا، جبکہ گرمی کی حدّت سے اس کی کنپٹیوں پر چکنائی پگھل کر بہہ رہی تھی۔ حوزے آرکادیو، اس کا بڑا بھائی، اس زبردست لمحے کا نقش موروثی یاد کا حصہ بنا کر اپنی آل اولاد کے لیے چھوڑ جانے والا تھا۔ البتہ اُرسلا کے لیے ملکیادیس کی اس ملاقات کی ناخوشگوار یاد باقی رہی، کیونکہ جس لمحے وہ کمرے میں داخل ہوئی تھی، ملکیادیس نے بے احتیاطی سے پارے کا فلاسک توڑا تھا۔

''اس میں سے شیطانی بو آرہی ہے،'' ارسلا نے کہا۔

''ہرگز نہیں،'' ملکیادیس نے اس کی اصلاح کی۔ ''یہ ثابت کیا جاچکا ہے کہ شیطان میں گندھک کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ پارہ تو محرق جوہر ہے۔''

ہمیشہ کی طرح پند آمیز ملکیادیس اُرسلا کو شنگرف کی شیطانی خصوصیات پر لیکچر دینے لگا۔ ارسلا نے اس کی باتوں پر توجہ نہ دی، اور بچوں کو لے کر عبادت کے لیے چلی گئی۔ اس کاٹنے والی تیز بو کو اس کے ذہن میں ہمیشہ کے لیے ملکیادیس کی یاد سے وابستہ ہوجانا تھا۔

وہ ابتدائی تجربہ گاہ، طرح طرح کے برتنوں، کپیوں، مقاطیر اور چھلنیوں کے علاوہ، پانی کی ایک بھدی سی نلکی، پتلی لمبی گردن والے کانچ کے پیالے، پارس پتھر کی ایک نقل، اور مریم یہود کے تین بازوؤں والے اَنبیق پر مشتمل تھی جسے خانہ بدوشوں نے جدید تفصیلات کی روشنی میں بنایا تھا۔ ان اشیا کے ساتھ ملکیادیس سات سیاروں سے مطابقت رکھنے والی سات دھاتوں کے نمونے، سونے کی مقدار دگنی کرنے والے موسیٰ اور زوزِیمس کے نسخہ جات، تشریحات اور خاکوں سے مرصع ان عظیم تعلیمات پر مبنی ایک جامع کلیات ان لوگوں کے لیے چھوڑ گیا تھا جو ان کی تفسیر کی صلاحیت رکھتے ہوں اور پارس پتھر تیار کرنے کا بیڑا اٹھا سکیں۔ سونے کی مقدار دگنی کرنے کے آسان نسخے کے جھانسے میں آکر حوزے آرکادیو بوئندیا ہفتوں ارسلا کی طرف ملتفت رہا، تاکہ وہ زمین میں دبائے ہوئے سونے کے سکے نکال لنے دے، اور وہ ان کو اتنی دفعہ دگنا کرسکے جتنا کہ پارے کو تقسیم در تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ارسلا ہمیشہ کی طرح اس دفعہ بھی اپنے شوہر کی اٹل ضد کے آگے نہ ٹھہر سکی۔ اور پھر حوزے آرکادیو بوئندیا نے تین سکوں کو ایک کڑھائی میں ڈالا، ان کو تانبے کے ذرات، زرنیخ، گندھک اور جست کے ساتھ پگھلایا، اور پھر اس

آمیزے کو ارنڈی کے تیل میں ابلنے کو رکھ دیا، یہاں تک کہ وہ ایک گاڑھے، طاعونی سیال میں بدل گیا، جو سونے سے زیادہ عام سا شکر کا شیرہ معلوم ہوتا تھا۔ ارسلا کو ورثے میں ملا ہوا قیمتی اثاثہ ان پُرخطر اور سخت مراحل سے گزرنے، سات سیاروں کی دھاتوں کے ساتھ پگھلنے، ہوا بند پارے اور جوہرِ نمک کے ساتھ ملائے جانے اور خنزیر کی چربی میں پکنے کے بعد (کہ مولی کا تیل اُس وقت دستیاب نہ تھا) سور کی بھنی ہوئی خستہ کھال کے ایک بڑے سے ٹکڑے میں تبدیل ہو گیا جو کڑھائی کے پیندے سے مضبوطی کے ساتھ چپک گیا تھا۔

جب خانہ بدوش واپس آئے تو اُرسلا پورے گاؤں کو ان کے خلاف کر چکی تھی۔ لیکن تجسس خوف پر غالب آیا، کیونکہ اس دفعہ خانہ بدوش طرح طرح کے ساز بجاتے گاؤں میں گھوم رہے تھے، کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی، اور ایک نقارچی ناسیان سینیز کی سب سے حیران کن ایجاد کے مظاہرے کا اعلان کر رہا تھا۔ لہٰذا ہر شخص خیمے کی طرف چل پڑا، اور ایک ایک سکہ دے کر جواں سال ملکیا دیس کا دیدار کرنے لگا، جس کی جھریاں غائب ہو چکی تھیں اور نئے سفید دانت چمچما رہے تھے۔ جن لوگوں کو ملکیا دیس کے اسقر بوط سے گلے ہوئے مسوڑھے، اندر کو پچکے ہوئے گال اور پھٹے ہوئے ہونٹ یاد تھے، خانہ بدوش کی مافوق الفطرت قوت کا مظاہرہ دیکھ کر خوف سے کانپنے لگے، اور وہ خوف اس وقت شدید ہراس میں بدل گیا جب ملکیا دیس نے اپنی بتیسی ایک لمحے کے لیے نکال کر دکھائی —— وہ لمحہ جس میں ملکیا دیس دوبارہ وہی پیرِ فرتوت بن گیا —— اور منھ کھول کر اسے پھر سے جمایا، اور اعادۂ شباب کے پورے اعتماد کے ساتھ مسکرایا۔ حوزے آرکادیو بوئندیا تک نے یہ سوچا کہ ملکیا دیس کا علم اپنے عروج کو پہنچ چکا ہے، لیکن جب ملکیا دیس نے اسے نقلی دانتوں کے بارے میں سمجھایا تو حوزے آرکادیو بوئندیا پر ایک مثبت جوش کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ یہ بات اس کو اتنی معمولی ہونے کے ساتھ ساتھ اتنی انوکھی لگی کہ راتوں رات وہ کیمیا گری سے اپنی تمام تر دلچسپی کھو بیٹھا۔ وہ بدمزاجی کے ایک نئے بحران سے گزرا۔ اس نے وقت پر کھانا پینا چھوڑ دیا۔ تمام دن وہ گھر میں ٹہلا کرتا۔ ''دنیا میں ناقابلِ یقین چیزیں ہو رہی ہیں،'' اس نے ارسلا سے کہا، ''دریا کے اُس پار ہر طرح کے طلسمی آلات موجود ہیں، اور ہم یہاں گدھوں کی سی زندگی گزار رہے ہیں۔'' جو لوگ حوزے آرکادیو بوئندیا کو ماکوندو کی بنیاد پڑنے کے وقت سے دیکھتے چلے آئے تھے، وہ حیران رہ گئے کہ وہ ملکیا دیس کے اثر میں آ کر کتنا بدل گیا ہے۔

ابتدا میں حوزے آرکادیو بوئندیا گھر کا پُر شباب سربراہ تھا، جو کاشت کاری کی ہدایتیں جاری کرتا، بچوں کی پرورش اور جانوروں کی افزائشِ نسل کے بارے میں مشورے دیتا، اور سب کے ساتھ مل کر ہر طرح کے کام کرتا، یہاں تک کہ گاؤں کی بہبود کے لیے جسمانی مشقت میں بھی لوگوں کا ہاتھ بٹاتا۔ اس کا گھر شروع ہی سے گاؤں کا بہترین گھر تھا، لہٰذا دوسرے گھر اسی طرز پر بنائے گئے تھے۔ اس گھر میں ایک چھوٹی سی روشن بیٹھک تھی، چبوترے پر کھانے کا کمرہ بنایا گیا تھا جس میں خوش رنگ پھول تھے، دو خواب گاہیں تھیں، ایک آنگن جس میں شاہ بلوط کا ایک دیو قامت درخت تھا، ایک صاف ستھرا باغیچہ، اور ایک باڑا جہاں بکریاں، سؤر اور مرغیاں پُرسکون سنگت میں رہتی تھیں۔ صرف لڑاکا مرغ ہی ایک ایسا حیوان تھا جس کا نہ صرف اس گھر میں، بلکہ پوری آبادی میں داخلہ ممنوع تھا۔

اُرسلا کام کرنے کی اتنی ہی استعداد رکھتی تھی جتنی اس کا شوہر۔ وہ پھرتیلی، چھوٹی سی، سخت گیر، مضبوط اعصاب والی عورت، جس کو آج تک کسی نے گنگناتے نہ سنا تھا، پَو پھٹنے سے رات گئے تک اپنے سخت، کلف دار پیٹی کوٹ کی نرم سرگوشیوں کے ساتھ ہر جگہ دکھائی دیتی۔ اسی کی بدولت کُٹا ہوا کچا فرش، مٹی کی دیواریں، لکڑی کا پرانا فرنیچر، جو انھوں نے خود بنایا تھا، ہمیشہ صاف ستھرا رہتا، اور پرانی الماریوں کے خانوں سے، جہاں وہ اپنے کپڑے رکھتے تھے، کالی تلسی کی گرم مہک اٹھا کرتی۔

حوزے آرکادیو بوئندیا نے، جو گاؤں کا سب سے زیادہ پُرعزم مرد تھا، بستی کے تمام گھر ایسے محل وقوع پر بنائے تھے کہ ہر گھر سے یکساں محنت کے ساتھ دریا پر جا کر پانی لایا جا سکتا تھا، اور گلیوں کی ترتیب ایسی سوجھ بوجھ سے رکھی تھی کہ کسی گھر کو دوسرے گھر سے زیادہ دھوپ کی حدت نہ پہنچتی۔ چند ہی برسوں میں ماکوندو جیسا باترتیب اور محنتی گاؤں اس کی تین سو کی آبادی میں سے کسی نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ وہ حقیقتاً ایک ایسا خوش و خرم گاؤں تھا جہاں کوئی تیس سال سے زیادہ کا نہ تھا، اور جہاں کوئی موت واقع نہیں ہوئی تھی۔

گاؤں کی بنیاد پڑنے کے زمانے ہی سے حوزے آرکادیو بوئندیا نے پنجرے اور دام بنائے تھے۔ کچھ ہی عرصے میں اس نے نہ صرف اپنے گھر کو، بلکہ گاؤں کے ہر گھر کو، طوطوں، میناؤں، بلبلوں اور خوش رنگ کلغی دار پرندوں سے بھر دیا۔ انواع و اقسام کے پرندوں کی چہچہاہٹیں اور نغمے ارسلا کو اتنا پریشان کرتے کہ وہ اپنے کانوں میں موم ڈال لیتی کہ کہیں شور سے پاگل نہ ہو جائے۔ جب ملکیادیس کا

قبیلہ پہلی دفعہ سر درد کے علاج کے لیے شیشے کی گولیاں بیچتا گاؤں پہنچا تھا تو سب کو حیرت ہوئی تھی کہ انھیں خوابیدہ دلدلوں میں گم یہ گاؤں کیونکر ملا، اور خانہ بدوشوں نے اقرار کیا تھا کہ وہ پرندوں کے نغموں کا پیچھا کرتے ہوئے وہاں تک پہنچے ہیں۔

اجتماعی پیش قدمی کا یہ جذبہ جلد ہی غائب ہو گیا؛ مقناطیس کی دُھن، علم نجوم کے حساب کتاب، کیمیا گری کے خوابوں، اور دنیا کے نوادرات دریافت کرنے کی تمنا نے اس ولولے کو پس پشت ڈال دیا۔ ایک صاف ستھرے، چاق و چوبند انسان سے، حوزے آرکادیو بوئندیا ایک کاہل الوجود، لباس کے معاملے میں بے پروا شخص میں تبدیل ہو گیا، جس کی وحشیانہ ڈاڑھی ارسلا بڑی کوششوں اور باورچی خانے کی چھری کی مدد سے تراشتی۔ کئی لوگ اسے آسیب کا شکار سمجھتے۔ لیکن وہ لوگ بھی، جنھیں اس کے پاگل پن کا یقین ہو چکا تھا، اپنے اپنے کام کاج اور گھر بار چھوڑ کر اس کے پیچھے پیچھے چلے آئے، جب وہ اوزار سنبھالتا ہوا نکلا اور لوگوں سے ایک ایسی راہ کھولنے کے لیے کہا جس کے ذریعے ماکوندو کی رسائی دنیا کی عظیم ایجادات تک ہو سکے۔

حوزے آرکادیو بوئندیا خطے کے جغرافیے سے قطعی نابلد تھا۔ اسے صرف یہ معلوم تھا کہ مشرق میں سنگلاخ پہاڑی سلسلہ ہے، اور پہاڑوں کے درمیان کے دوسری طرف ریوہاچا کا قدیم شہر، جہاں، اس کے دادا اور ریلیانو بوئندیا اوّل کے بقول، سر فرانس ڈریک نے توپوں سے مگرمچھوں کا شکار کیا تھا، اور پھر ان کے ٹکڑے اکٹھا کر کے، اور بھس بھروا کے، ملکہ الزبتھ کی خدمت میں پیش کیے تھے۔ جوانی میں حوزے آرکادیو بوئندیا اور اس کے آدمیوں نے بیوی بچوں، مویشیوں اور ساز و سامان کے ساتھ ان پہاڑوں کو عبور کیا تھا تاکہ سمندر تک نکلنے والی راہ کا پتا لگا سکیں، اور چھبیس ماہ کے بعد اس مہم کو خیرباد کہہ کر ماکوندو کی بنیاد ڈالی تھی تاکہ انھیں واپس نہ جانا پڑے۔ لہٰذا وہ ایک ایسا راستہ تھا جس سے اسے کوئی دلچسپی نہ تھی، جو صرف ماضی کو جاتا تھا۔ جنوب میں دلدل تھی، جو دائمی خودرو نباتاتی کیچڑ سے ڈھکی ہوئی تھی، اور دلدلی سلسلے کی وسیع کائنات تھی، جس کی، خانہ بدوشوں کے بقول، کوئی حدیں نہ تھیں۔ مغرب کی سمت وہ وسیع دلدل ایک لامتناہی آبی سلسلے سے جا ملتی تھی جہاں نرم جلد والی، دودھ پلانے والی مچھلیاں تھیں، جن کے سر اور دھڑ عورتوں کے سے تھے، اور جن کے غیر معمولی پستانوں کی کشش ملاحوں کو برباد کر دیتی تھی۔ خانہ بدوش زمین کے اس ٹکڑے تک پہنچنے سے پہلے، جہاں سے ڈاک لے جانے والے خچر گزرا کرتے

تھے، اس دلدلی راستے پر چھ ماہ تک کشتیوں میں رواں رہے تھے۔ حوزے آرکادیو بوئندیا کے حساب کے مطابق، تہذیب سے اتصال کا راستہ شمال کی سمت سے نکل سکتا تھا۔ لہٰذا اس نے زمین صاف کرنے کے اوزار اور شکار کرنے کے ہتھیار ان لوگوں کو تھمائے جو ماکوندو بساتے وقت اس کے ساتھ تھے، قطب نما اور نقشے اپنے تھیلے میں ڈالے، اور اس پُر خطر مہم پر نکل پڑا۔

پہلے چند روز انھیں کوئی مشکل نہ پیش آئی۔ وہ دریا کے پتھریلے کنارے کے ساتھ ساتھ اس جگہ تک اترتے چلے گئے جہاں انھیں برسوں پہلے سپاہی کا زرہ بکتر ملا تھا، اور وہاں سے جنگلی نارنگی کے درختوں کے درمیان ایک پگڈنڈی سے گزر کر بن میں داخل ہو گئے۔ پہلے ہفتے کے اختتام پر انھوں نے ایک ہرن شکار کر کے بھونا۔ لیکن وہ اس بات پر متفق ہوے کہ آدھا ہرن کھایا جائے، اور باقی نمک لگا کر آئندہ کے لیے رکھ لیا جائے۔ اس تیاری کے ذریعے انھوں نے کوشش کی کہ طوطوں کو پکڑ کر نہ کھانا پڑے، جن کا نیلا گوشت سخت اور بدمزہ ہوتا تھا۔ پھر دس دن سے زیادہ عرصے تک انھوں نے سورج نہ دیکھا۔ زمین آتش فشاں کے لاوے کی طرح نرم اور گیلی ہوتی گئی، نباتات دبیز تر، اور پرندوں کی چیخیں اور بندروں کا شور دور تر ہوتا گیا، اور کائنات پر دائمی اداسی چھا گئی۔ اپنے جوتے کھولتے ہوے تیل کے جوہڑوں میں دھنساتے، کلھاڑیوں سے خون رنگ سوسن کے پھولوں کو کاٹتے اور سنہرے سلامندار مارتے ہوے، مہم کے لوگ اس پُرنم اور ساکت جنت کے اندر قدیم یادوں میں ڈوبتے چلے گئے، وہ یادیں جو گناہِ آدم کے وقت سے بھی پرے کی تھیں۔ ایک ہفتے تک، منھ سے ایک لفظ نکالے بغیر، خوابناک کیفیت میں سرشار، نیند میں چلنے والوں کی مانند، وہ اس غمگین کائنات میں اترتے چلے گئے، وہ کائنات جو صرف جگمگاتے ہوے کیڑوں کی لطیف پرچھائیوں سے روشن تھی، اور ان کے پھیپھڑے خون کی دم گھونٹنے والی بُو سے پھٹنے لگے۔ وہ واپس نہ جا سکتے تھے، کیونکہ وہ جو بھی راستہ کھولتے، جلد ہی نباتات کے دوبارہ اگنے سے بند ہونے لگتا، وہ نباتات جو ان کے دیکھتے ہی دیکھتے اگ آتی تھیں۔

''ٹھیک ہے،'' حوزے آرکادیو بوئندیا کہتا، ''اصل بات یہ ہے کہ ہم سمت نہ بھول جائیں۔'' قطب نما کی مدد سے وہ اپنے آدمیوں کو ان دیکھے شمال کی جانب راستہ دکھاتا رہا تاکہ وہ اس پُرطلسم خطے سے نکل سکیں۔ وہ ایک گہری رات تھی، بے ستارہ، لیکن اندھیرا تازہ اور صاف ہوا سے بارور ہوتا جا رہا تھا۔ طویل مسافت کی تھکن سے چور، انھوں نے اپنی اپنی جھولنیاں درختوں کے تنوں سے تانیں اور دو ہفتوں

کے مسلسل سفر کے بعد گہری نیند سوئے۔ صبح جب ان کی آنکھ کھلی تو سورج آسمان پر چمک رہا تھا۔ منظر کے فسوں نے انھیں گنگ کر دیا۔ ان کے سامنے فرن اور کھجور کے درختوں میں گھرا، صبح کی روشنی میں سفید، اور سفوف کی طرح بُھر بُھرایا ہوا ایک بڑا سا قدیم ہسپانوی جہاز، داہنے رخ پر ہلکا سا جھکا ہوا کھڑا تھا۔ اس کے مستول پر بادبان کے چیتھڑے جھول رہے تھے۔ جہاز کے رسّے گیاہ سے مزین تھے، اور اس کا پیٹا، نرم کائی اور پتھرائی ہوئی سیپ مچھلیوں سے پٹا ہوا، مضبوطی سے پتھریلی زمین پر جما کھڑا تھا۔ تمام ڈھانچا یوں لگتا تھا جیسے اپنی مخصوص جگہ گھیرے ہوئے ہو، جو تنہائی اور گمنامی کی دنیا تھی، وقت کی تباہ کاری اور پرندوں کی دست بُرد سے محفوظ۔ جہاز کے اندرونی حصے میں، جس کا مہم کے ارکان نے احتیاط کے ساتھ جائزہ لیا، پھولوں کے ایک گھنے جنگل کے سوا کچھ نہ نکلا۔

جہاز کی دریافت سے، جو سمندر کے نزدیک ہونے کی نشان دہی کرتی تھی، حوزے آرکادیو بوئندیا کی ہمت ٹوٹ گئی۔ وہ اسے اپنی متلون مزاج قسمت کی ایک چال سمجھا، کہ وہ سمندر جس کو وہ ہزارہا قربانیوں اور دشواریوں کے باوجود تلاش نہ کر پایا تھا، اب اچانک، کسی تلاش کے بغیر، ایک ناقابلِ تسخیر شے کی طرح اس کے راستے میں حائل تھا۔ بہت برسوں بعد، جب وہ خطہ ڈاک کی باقاعدہ ترسیل کے راستے کے طور پر استعمال ہونے لگا تھا، اسے ایک بار پھر کرنل اورلیلیانو بوئندیا نے عبور کیا، اور اسے جہاز کا صرف جلا ہوا ڈھانچا افیون کے کھیت میں نظر آیا۔ اس وقت، جب اسے یقین ہو گیا کہ باپ کی سنائی ہوئی کہانی اُس کے ذہن کی اختراع نہیں بلکہ حقیقت پر مبنی تھی، اس کو تعجب ہوا کہ جہاز خشکی کے اس حصے میں کس طرح آ کر پھنسا ہو گا۔ لیکن حوزے آرکادیو بوئندیا کو اس بات سے کوئی سروکار نہ تھا۔ جہاز کو پیچھے چھوڑ کر، مزید چار دن کے سفر کے بعد، جب اس نے راکھ کے رنگ کا گندا، جھاگ اڑاتا سمندر دیکھا تو اس کے سارے خواب ڈھے گئے۔ وہ سمندر اتنی قربانیوں اور مہم جوئیوں کے قابل نہ تھا۔

''خدا غارت کرے،'' وہ چلایا، ''ماکوندو چاروں طرف سے پانی سے گھرا ہوا ہے۔''

جزیرہ نما ماکوندو کا خیال، جو حوزے آرکادیو بوئندیا کے بنائے ہوئے بے طور، بے ڈھنگے نقشے کو دیکھ کر پیدا ہوا تھا، طویل عرصے تک قائم رہا۔ وہ نقشہ اس نے مہم سے واپسی پر طیش میں آ کر بنایا تھا، بدنیتی سے، راستے کی مشکلات کو بڑھا چڑھا کر، گویا خود کو اس بات کی سزا دے رہا ہو کہ اس نے عقل سے کس قدر بالاتر ہو کر وہ جگہ چنی تھی۔ ''ہم کہیں نہیں پہنچ سکتے،'' اس نے ارسلا سے واویلا کیا، ''ہم یہیں

سڑ کر مر جائیں گے، سائنس کے فائدے اٹھائے بغیر۔" یہ یقین، جس پر تجربہ گاہ کے طور پر استعمال کیے جانے والے تنگ کمرے میں بند حوزے آرکادیو بوئندیا بہت دنوں تک سوچ بچار کرتا رہا، ماکوندو کو کسی بہتر مقام پر منتقل کرنے کے منصوبے کا سبب بنا۔ اس وقت تک اُرسلا کو اس ہذیانی منصوبے کی ہوا لگ چکی تھی۔ ایک چیونٹی کی سی رازداری اور مشقت کے ساتھ، اس نے گاؤں کی عورتوں کو اپنے شوہروں کی متلون مزاجی کی مخالفت پر مائل کر لیا تھا، جو منتقلی کی تیاریوں میں مصروف ہو چکے تھے۔ حوزے آرکادیو بوئندیا کو معلوم نہ ہوا کہ کس لمحے، یا کن مخالف قوتوں کے سبب، اس کا منصوبہ عذر، ٹال مٹول، ناامیدیوں اور حیلہ سازیوں کے جالوں میں لپٹ کر ایک فریب میں بدل گیا۔ ارسلا نے ایک معصوم توجہ کے ساتھ اس پر نظر رکھی، بلکہ اس صبح جب وہ نقل مکانی کے بارے میں بڑبڑاتا ہوا عقبی کمرے میں تجربہ گاہ کا سامان ڈبوں میں رکھ رہا تھا، ارسلا کو اس پر ترس بھی آیا۔ لیکن اس نے حوزے آرکادیو بوئندیا کو یہ کام نمٹانے دیا۔ اور کچھ کہے بغیر اسے ڈبے بند کر کے ان میں کیلیں ٹھونکتے، اور سیاہی میں برش ڈبو کر اپنا نام لکھتے ہوئے دیکھتی رہی، لیکن اسے معلوم تھا کہ حوزے آرکادیو بوئندیا کو معلوم ہے (کیونکہ ارسلا نے اسے خود سے دھیمے دھیمے سرگوشیاں کرتے سن لیا تھا) کہ گاؤں کے لوگ اس مہم میں اس کا ساتھ نہیں دے رہے ہیں۔ البتہ جب حوزے آرکادیو بوئندیا کمرے کا دروازہ اکھاڑنے لگا تو ارسلا نے ہمت کر کے اس سے پوچھا کہ وہ کیا کر رہا ہے، اور اس نے کسی قدر تلخی کے ساتھ جواب دیا: "چونکہ کوئی ہمارا ساتھ دینے کو تیار نہیں، لہٰذا ہم لوگ اکیلے ہی جائیں گے۔" ارسلا پریشان نہ ہوئی۔

"ہم نہیں جائیں گے،" اس نے کہا، "کیونکہ ہمارا بیٹا یہاں پیدا ہوا تھا۔"

"یہاں ابھی تک ہم میں سے کوئی نہیں مرا ہے۔ جب تک کسی جگہ کوئی اپنا دفن نہ ہو، وہ جگہ اپنی نہیں ہوتی۔"

ارسلا نے ایک نرم استقامت سے جواب دیا، "اگر تم سب لوگوں کے یہاں ٹھہرنے کے لیے مجھے مرنا پڑا تو میں مر جاؤں گی۔"

حوزے آرکادیو بوئندیا نے کبھی نہ سوچا تھا کہ اس کی بیوی عزم کی اتنی پکی ہے۔ اس نے ارسلا کو اپنے پرکشش تخیلات سے لبھانے کی کوشش کی؛ ایک انوکھی دنیا کا وعدہ کیا جہاں انسان کی جب خواہش ہوتی، اُسے صرف زمین پر آبِ طلسم چھڑکنا ہوتا اور درخت پھل دینے لگتے، جہاں درد رفع کرنے کے

لیے انواع واقسام کے آلات سستی قیمت پر ملتے۔ لیکن ارسلا اس کی بصیرت سے قطعی متاثر نہ ہوئی۔

''بجائے اس کے کہ تم اپنی احمقانہ ایجادات کے بارے میں سوچتے رہو، تمھیں اپنے لڑکوں کی فکر کرنی چاہیے،'' ارسلا نے کہا، ''دیکھو، وہ کس حالت میں ہیں۔ گدھوں کی طرح وحشی ہوتے جا رہے ہیں۔''

حوزے آرکادیو بوئندیا نے اپنی بیوی کی بات کو لفظاً لیا اور کھڑکی سے جھانک کر باہر دیکھا۔ بچے دھوپ میں ننگے پاؤں باغ میں دوڑتے پھر رہے تھے، اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے بچے اسی لمحے، اچانک، ارسلا کے جادو پھونکنے سے وجود میں آئے ہوں۔ حوزے آرکادیو بوئندیا کو اندر ہی اندر کچھ محسوس ہوا، کوئی قطعی اور پُراسرار کیفیت، جو اسے اس کے اپنے زمانے سے اکھاڑ کر یادوں کے نامعلوم گوشوں میں لے گئی۔ ارسلا نے جھاڑو دینا جاری رکھا، اس گھر میں جو اب خالی چھوڑ دیے جانے کے خطرے کی زد سے باہر آ چکا تھا۔ حوزے آرکادیو بوئندیا خیالوں میں گم کھڑا بچوں کو دیکھتا رہا، یہاں تک کہ اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اس نے ہتھیلی کی پشت سے آنکھوں کی نمی صاف کی، اور تسلیم و رضا کا ایک گہرا سانس کھینچا۔

''ٹھیک ہے،'' حوزے آرکادیو بوئندیا نے کہا، ''لڑکوں سے کہو ڈبوں سے سامان نکلوانے میں میری مدد کریں۔''

سب سے بڑا لڑکا، حوزے آرکادیو، چودہ سال کا تھا۔ اس کا سر چوکور، بال گھنے اور فطرت باپ کی سی تھی۔ گو کہ اس کی قوت اور جسمانی نشوونما کی رفتار باپ پر گئی تھی، یہ بات ابتدا ہی سے واضح تھی کہ اس میں تخیل کی کمی ہے۔ وہ ماکوندو بسانے سے پہلے، دشوار گذار پہاڑوں کو عبور کرنے کے دوران پیٹ میں آیا اور پیدا ہوا تھا، اور اس کے والدین نے خدا کا شکر ادا کیا تھا کہ اس کے خدوخال جانوروں جیسے نہ تھے۔ اور یلیانو، جو ماکوندو میں پیدا ہونے والا پہلا انسان تھا، مارچ میں چھ سال کا ہونے والا تھا۔ وہ ایک خاموش طبع اور اپنے آپ میں گم بچہ تھا۔ وہ ماں کے پیٹ میں رویا تھا، اور پیدائش کے وقت اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ جب نال کاٹی جا رہی تھی تو اس نے اپنا سر اِدھر اُدھر گھما کر گردوپیش کا جائزہ لیا تھا، اور کمرے میں موجود چیزوں اور چہروں کا بے خوف تجسس کے ساتھ معائنہ کیا تھا اور پھر ان لوگوں سے لاتعلق، جو اسے قریب سے دیکھنے آئے، کھجور کی چھال کی بنی چھت کو تکتا رہا تھا، جو لگتا تھا مسلسل

بارش کے دباؤ سے کسی وقت بھی ڈھے سکتی ہے۔ ارسلا کو بچے کی نگاہ کی شدت اس لمحے تک یاد نہ آئی جب تین سالہ اوریلیانو بارورچی خانے میں داخل ہوا، جس وقت وہ ابلتے ہوئے سوپ کو چولھے سے اتار کر میز پر رکھ رہی تھی۔ باورچی خانے کی دہلیز پر کھڑے بچے نے متحیر ہو کر کہا تھا، ''سوپ بہنے والا ہے!'' سوپ کا برتن، حفاظت سے میز کے بیچوں بیچ رکھا تھا، لیکن بچے کے منھ سے یہ الفاظ نکلتے ہی میز کے کنارے کی جانب حرکت کرنے لگا، گویا کسی اندرونی قوت سے کھنچا چلا جا رہا ہو، اور زمین پر گر کر ٹوٹ گیا۔ گھبرائی ہوئی ارسلا نے اپنے شوہر سے اس واقعے کا تذکرہ کیا۔ لیکن حوزے آرکادیو بوئندیا نے اسے فطری عمل سے تعبیر کیا۔ حوزے آرکادیو بوئندیا کا ہمیشہ سے یہی حال تھا۔ وہ اپنے لڑکوں کے وجود سے یکسر بیگانہ تھا، کچھ اس وجہ سے کہ وہ بچپن کو ذہنی کم مائیگی کا دور سمجھتا تھا، اور کچھ اس لیے بھی کہ وہ ہمیشہ اپنے تخیلاتی مفروضوں میں کھویا رہتا۔

لیکن اس دوپہر کے بعد سے جب اس نے لڑکوں کو بلا کر ڈبوں سے تجربہ گاہ کی چیزیں نکلوانے میں مدد لی تھی، اس نے انھیں اپنا بہترین وقت دیا۔ اُس چھوٹے سے الگ تھلگ کمرے میں، جس کی دیواریں رفتہ رفتہ عجیب و غریب نقشوں اور حیران کن خاکوں سے بھر گئی تھیں، اس نے ان کو پڑھنا لکھنا اور حساب کرنا سکھایا، اور دنیا کے عجوبوں کے بارے میں بتایا۔ اس عمل میں وہ نہ صرف اپنا حاصل کردہ علم استعمال میں لاتا، بلکہ اپنے تخیل کو اس کی انتہائی حدود تک کھینچ لے جاتا۔ اس طرح لڑکوں کو معلوم ہوا کہ جنوبی افریقہ کی آخری حدوں پر بسنے والے لوگ اتنے ذہین اور شانت ہوتے ہیں کہ فرصت کے لمحات میں ان کی ایک ہی سرگرمی ہوتی ہے: بیٹھ کر سوچنا، اور یہ کہ بحرا یجیئن کو پیدل ایک جزیرے سے دوسرے جزیرے پر چھلانگ لگاتے ہوئے عبور کر کے سالونیکا کی بندرگاہ تک پہنچا جا سکتا ہے۔ وہ سحر انگیز نشستیں لڑکوں کے ذہنوں پر اس طرح نقش ہوئیں کہ، بہت برسوں بعد، فوجی افسر کے فائرنگ اسکواڈ کو گولی چلانے کا حکم دینے سے ایک سیکنڈ پہلے، کرنل اوریلیانو بوئندیا کو مارچ کی وہ گرم سہ پہر دوبارہ دکھائی دی جب اس کا باپ، دور سے آتی ہوئی نقاروں، نفیریوں اور خانہ بدوشوں کے گیتوں کی آوازیں سن کر، جو میمفِس کے سیانوں کی تازہ ترین اور سب سے حیران کن ایجاد کی منادی کرتے ہوئے گاؤں میں ایک بار پھر داخل ہو رہے تھے، طبیعیات کا سبق ادھورا چھوڑ کر، ساکت آنکھوں اور ہوا میں بلند ہاتھوں کے ساتھ، سحر زدہ کھڑا رہ گیا تھا۔

وہ نئے خانہ بدوش تھے، جوان مرد اور عورتیں، جو صرف اپنی زبان جانتے تھے، چکنی جلدوں اور ذہین ہاتھوں والے خوبصورت لوگ، جن کے رقص اور موسیقی نے ماکوندو کی گلیوں میں مسرت آمیز ہنگامہ برپا کر دیا؛ رنگا رنگ طوطے لیے، جو اطالوی گیت گاتے، اور ایک مرغی جو طنبورے کی آواز پر سونے کے سوانڈے دیتی؛ اور ایک سدھا ہوا بندر جو لوگوں کے خیالات پڑھ لیتا، اور ایک ایسی مشین جس کے کئی استعمال تھے، جو بٹن ٹانکنے اور بخار کم کرنے کا کام ساتھ ساتھ انجام دیتی، اور ایک ایسا آلہ جس سے انسان اپنی ناخوشگوار یادیں فراموش کر سکتا تھا، اور ایک پلٹس جس سے وقت زائل ہو جاتا، اور مزید ایک ہزار ایجادات، جو اتنی عجیب و غریب اور انوکھی تھیں کہ حوزے آرکادیو بوئندیا کا یقیناً دل چاہا ہوگا کہ وہ ایک ایسی مشین ایجاد کرے جس کے ذریعے ان تمام چیزوں کو یاد رکھا جا سکے۔ ایک لمحے میں خانہ بدوشوں نے گاؤں کی کایا پلٹ دی۔ ماکوندو کے باشندوں نے خود کو اپنی ہی گلیوں میں گم، میلے کی بھیڑ میں حیران و سرگرداں پایا۔

دونوں بچوں کے ہاتھ تھامے، تاکہ وہ اس ہنگامے میں گم نہ ہو جائیں، سونے کے دانتوں والے مسخروں سے ٹکراتا، چھ بازوؤں والے جادوگروں سے الجھتا، ہجوم سے اٹھتی ہوئی صندل اور کھاد کی ملی جلی بو سے گھٹتے ہوئے دم کے ساتھ، حوزے آرکادیو بوئندیا کسی جنونی کی طرح میلے میں ملکیادیس کو ڈھونڈتا پھرا، تاکہ وہ اس کے عجیب و غریب، داستان انگیز، ڈراؤنے خواب کے بے پایاں رموز اس پر کھول سکے۔ اس نے کئی خانہ بدوشوں سے دریافت کیا جو اس کی زبان نہ جانتے تھے۔ آخرکار وہ اس جگہ جا پہنچا جہاں ملکیادیس اپنا خیمہ لگایا کرتا تھا، اور وہاں اس کو ایک کم گو آرمینی نظر آیا، جو ہسپانوی زبان میں ایک ایسا شربت بیچ رہا تھا جس کو پی کر انسان نظروں سے اوجھل ہو جاتا۔ جب حوزے آرکادیو بوئندیا کہنیاں مارتا، مجمعے کو چیرتا، اس سے سوال کرنے پہنچا، آرمینی گلاس بھر عنبریں مائع ایک گھونٹ میں چڑھا چکا تھا۔ خوفناک طاعونی دھویں کے بادل میں غائب ہونے سے پیشتر، خانہ بدوش نے حوزے آرکادیو بوئندیا کو اپنی نگاہ کی مہیب فضا میں لپیٹ لیا۔ دھویں کے اوپر اس کے جواب کی گونج سنائی دی، ''ملکیادیس مر چکا ہے۔'' یہ خبر سن کر حوزے آرکادیو بوئندیا سکتے کے عالم میں کھڑے کا کھڑا رہ گیا، اور اس بپتا سے سنبھلنے کی کوشش کرنے لگا، یہاں تک کہ مجمع دوسرے کرشموں کی طرف متوجہ ہو کر چھٹنے لگا، اور کم گو آرمینی کا گدلا کیچڑ بخارات بن کر اڑ گیا۔ دوسرے خانہ بدوشوں نے اس بات کی تصدیق کی کہ

ملکیادیس سنگاپور کے ساحل پر بخار کا شکار ہو کر مر چکا ہے، اور یہ کہ اس کی لاش کو جاوا کے سمندر کے سب سے گہرے حصے میں پھینکا جا چکا ہے۔ لڑکوں کو اس خبر سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ اپنے باپ سے ضد کرنے لگے کہ میمفس کے سیانوں کی انوکھی شے دکھانے لے چلے جس کی خیمے کے باہر منادی کی جا رہی تھی اور جو، بقول مشتہر کے، سلیمان بادشاہ کی ملکیت تھی۔ بچوں نے اتنی ضد کی کہ حوزے آرکادیو بوئندیا تیس سکے دے کر بچوں کو خیمے کو وسط میں لے گیا، جہاں بالوں سے ڈھکے جسم اور گنجے سر والا ایک عظیم الجثہ آدمی ناک میں تانبے کی بالی لٹکائے اور ٹخنے پر لوہے کی زنجیر پہنے، ایک صندوق کی نگرانی کر رہا تھا۔ جب اس دیو نے صندوق کھولا تو اس میں سے ایک سرد بھبکا اٹھا۔ صندوق کے اندر ایک بے حد بڑی شفاف سل دھری تھی جس کے اندر لاتعداد سوئیاں بنی ہوئی تھیں، جن سے ٹکرا کر سورج کی شعاعیں دھنک کے رنگ پیدا کر رہی تھیں۔ مضطرب حوزے آرکادیو بوئندیا، جو جانتا تھا کہ بچے اس شے کی وضاحت سننے کے لیے بے تاب ہیں، آہستہ سے بڑبڑایا:

''یہ دنیا کا سب سے بڑا ہیرا ہے۔''

''نہیں،'' خانہ بدوش نے اس کی تصحیح کی۔ ''یہ برف ہے۔''

حوزے آرکادیو بوئندیا نے کچھ سمجھے بغیر سل کی جانب ہاتھ بڑھایا، لیکن دیو ہیکل شخص نے اسے روک دیا۔ ''پانچ سکے اَور، اسے چھونے کے۔'' حوزے آرکادیو بوئندیا نے سکے دیے اور اپنا ہاتھ برف پر رکھ دیا، اور کئی منٹ تک رکھے رہا، یہاں تک کہ اس کا دل اسرار سے اتصال پر خوف اور مسرت سے پھٹنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہے۔ اس نے دس سکے اور دیے، تاکہ اس کے بیٹے بھی اس عظیم تجربے سے گزر سکیں۔ ننھے حوزے آرکادیو نے برف کو چھونے سے انکار کر دیا، جبکہ اوریلیانو نے قدم آگے بڑھا کر اپنا ہاتھ اس پر رکھا اور فوراً کھینچ لیا۔ ''یہ تو اُبل رہا ہے،'' اس نے حیرت سے چیخ کر کہا۔ لیکن اس کے باپ نے کوئی توجہ نہ دی۔ معجزے کی شہادت سے سرشار، وہ اس لمحے اپنی مایوسیوں کو بھول گیا جو اس کی ہذیانی مہمات، اور ملکیادیس کی لاش کے سمندری ہشت پایوں کی بھوک کے حوالے کر دیے جانے سے پیدا ہوئی تھیں۔ اس نے پانچ سکے اور بڑھائے، اور اپنا ہاتھ سل پر رکھ کر، گویا کسی مقدس صحیفے پر شہادت دے رہا ہو، بولا:

''یہ ہمارے وقتوں کی عظیم ایجاد ہے۔''

❋

٢

جب قزاق سر فرانسس ڈریک نے سولھویں صدی میں ریوہاچا پر حملہ کیا، تو اُرسلا کی سگڑنانی خطرے کی گھنٹیوں اور توپوں کی گھن گرج سے اتنی خوفزدہ ہوئی کہ اس کے اوسان خطا ہو گئے اور وہ سراسیمگی کے عالم میں جلتے ہوئے چولھے پر جا بیٹھی۔ جلنے کے سبب وہ تمام عمر کے لیے ایک ناکارہ بیوی بن کر رہ گئی۔ وہ تکیے کے سہارے صرف ایک پہلو پر بیٹھ سکتی تھی۔ اس کی چال میں کوئی عجیب وغریب چیز واقع ہوئی تھی، کیونکہ اس حادثے کے بعد وہ کبھی لوگوں کے سامنے نہ چلی۔ اس نے تمام معاشرتی سرگرمیاں ترک کر دیں، کیونکہ اس کے ذہن میں یہ وسوسہ سما گیا تھا کہ اس کے جسم سے جلے ہوئے گوشت کی بو آتی ہے۔ پو پھٹے وہ آنگن میں بیٹھی پائی جاتی، اس خوف سے سو نہ پاتی کہ کہیں خواب میں اسے انگریز اور ان کے خوں خوار حملہ آور کتے نظر نہ آ جائیں، جو اس کے کمرے کی کھڑکی سے کود کر اندر آئے تھے اور اسے جلتے ہوئے لوہے کی شرمناک اذیت سے دوچار کیا تھا۔ اس کا شوہر، ایک آراگونیز تاجر، جس سے اس کے دو بچے تھے، اپنی دکان کی نصف مالیت اس کی دوائیوں اور دلجوئیوں میں لگا بیٹھا تھا، اس کوشش میں کہ اس کی دہشت کسی صورت جاتی رہے۔ آخر کار اس نے اپنا کاروبار بیچ کر سمندر سے دور پہاڑیوں کے دامن میں مقامی انڈین لوگوں کی ایک پُرسکون بستی میں اپنی بیوی کے لیے ایک ایسا گھر بنایا جس کی خواب گاہ میں کوئی کھڑکی نہ تھی، تاکہ اس کے خوابوں کے قزاقوں کو اندر داخل ہونے کا کوئی راستہ نہ ملے۔

اس پوشیدہ گاؤں میں تمباکو کا ایک مقامی کاشتکار حوزے آرکادیو بوئندیا کچھ عرصے سے مقیم تھا۔ ارسلا کے سگڑنانا نے اس کے ساتھ مل کر ایک مشترکہ کاروبار شروع کیا، جو اتنا منافع بخش ثابت ہوا کہ ان کی قسمت بدل گئی۔ چند صدیوں بعد تمباکو کے مقامی کاشتکار کے پڑپوتے نے آراگونیز تاجر کی پرنواسی سے شادی کر لی۔ لہٰذا ہر دفعہ جب ارسلا کو اپنے شوہر کے پاگل پن کے خیالات پر طیش آتا، تو وہ ایک ہی جست میں قسمت کے تین سو سال طے کرتی، اور اُس دن کو کوستی جب سر فرانسس ڈریک نے ریوہاچا پر حملہ کیا تھا۔ یہ صرف اپنے آپ کو تسلی دینے کا ایک بہانہ تھا، کیونکہ وہ دونوں درحقیقت ایک ایسے

بندھن میں بندھے ہوے تھے جو محبت سے زیادہ مستحکم تھا، اور وہ بندھن تھا: ضمیر کی مشترکہ چبھن۔ وہ عم زاد تھے۔ دونوں اُس پرانے گاؤں میں اکٹھے پلے بڑھے تھے جس کو ان کے آباواجداد کی محنت اور اچھی عادتوں نے تمام صوبے کا ایک عمدہ ترین قصبہ بنا دیا تھا۔ گو کہ اُن دونوں کی شادی کی پیش گوئی ان کے دنیا میں آتے ہی کر دی گئی تھی، جب انھوں نے آپس میں شادی کرنے کی خواہش کا خود اظہار کیا تو ان کے رشتے داروں نے ان کو روکنے کی کوشش کی۔ انھیں خوف تھا کہ دو صحت مند جوانوں کو، جو دو نسلوں کے صدیوں تک اختلاط سے پیدا ہوے تھے، اِگوانا جننے کی ذلت سے دوچار نہ ہونا پڑے۔ ان کے سامنے اس سے پہلے کی ایک ہولناک مثال موجود تھی۔ اُرسلا کی ایک خالہ کا، جس کی حوزے آرکادیو بوئندیا کے چچا سے شادی ہوئی تھی، ایک ایسا بیٹا تھا جو زندگی بھر ڈھیلی ڈھالی پتلونیں پہنتا رہا، اور جو بیالیس برس کنوارا رہنے کے بعد، زیادہ مقدار میں خون بہہ جانے کے سبب جاں بحق ہوا، کیونکہ اس کی، بوتل کا کارک نکالنے والے اوزار کی مانند، ایک کرکری ہڈی دار دم تھی، جس کے سرے پر بالوں کا گچھا تھا، سؤر کی دم، جسے دیکھنے کی کسی عورت کو اجازت نہ تھی، اور جس کی وجہ سے اس کو اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑے جب اس کے ایک قصاب دوست نے بُغدے سے وہ دم اڑا دی۔ انیس سالہ حوزے آرکادیو بوئندیا نے اس مسئلے کو جوانی کے جوش میں صرف ایک جملے سے حل کر ڈالا تھا: "مجھے پروا نہیں اگر میرے ہاں سؤر پیدا ہوں، بشرطے کہ وہ بول سکتے ہوں۔" لہٰذا ان کی، دھوم دھام سے، آتش بازی اور بینڈ باجے کے ساتھ، شادی ہوگئی۔ وہ اس کے بعد ہنسی خوشی زندگی گزار سکتے تھے، اگر اُرسلا کی ماں نے ان کی اولاد کے بارے میں منحوس پیش گوئیاں کر کے انھیں ڈرا نہ دیا ہوتا، یہاں تک کہ اس نے اُرسلا کو مشورہ دیا کہ شادی کے باوجود مباشرت سے احتراز کرے۔ اس خوف سے کہ اس کا تنومند اور پرعزم شوہر کہیں سوتے میں اس کے ساتھ زبردستی اختلاط نہ کر بیٹھے وہ بستر میں لیٹنے سے پہلے ایک بھدا سا زیرجامہ پہن لیتی جو اس کی ماں نے مضبوط بادبانی کپڑے کا سیا تھا، جس پر چمڑے کی پٹیاں چڑھی ہوئی تھیں اور جو سامنے سے لوہے کے بکسوے سے کھلتا تھا۔ اس طرح انھوں نے چند ماہ گزارے۔ دن کے وقت حوزے آرکادیو بوئندیا اپنے لڑاکا مرغوں کی دیکھ بھال کرتا، اور اُرسلا ماں کے ساتھ بیٹھی کشیدہ کاری کیا کرتی۔ رات وہ گھنٹوں ایک دکھ بھری دھینگامشتی میں گزارتے جو اختلاط کا بدل معلوم ہوتی، یہاں تک کہ لوگوں کو کوئی غیرمعمولی بات محسوس ہونے لگی، اور افواہ اُڑ گئی کہ ارسلا شادی کا ایک سال پورا

ہو جانے پر بھی کنواری کی کنواری ہے، کیونکہ اس کا شوہر نامرد ہے۔ حوزے آرکادیو بوئندیا کو سب سے آخر میں اس بات کا علم ہوا۔

''دیکھو، لوگ کس قسم کی باتیں کرتے پھر رہے ہیں اُرسلا،'' اس نے اپنی بیوی سے پُرسکون لہجے میں کہا۔

''انھیں بکنے دو،'' اُرسلا نے جواب دیا۔ ''ہمیں معلوم ہے کہ یہ سچ نہیں ہے۔''

سو یہ صورتِ حال چھ ماہ مزید، اس دردناک اتوار تک برقرار رہی جب حوزے آرکادیو بوئندیا نے پرودانسیوا گویلار سے مرغوں کی لڑائی جیتی۔ پرودانسیوا گویلار خون میں لتھڑے اپنے مرغ کو دیکھ کر طیش میں آ گیا، اور حوزے آرکادیو بوئندیا سے دور ہٹ کر، تاکہ پالی کے گرد موجود لوگ سن لیں کہ وہ کیا کہہ رہا ہے، چیخ کر بولا، ''مبارک ہو! شاید تمھارا مرغ تمھاری بیوی کا بھی کچھ بھلا کر سکے۔''

حوزے آرکادیو بوئندیا نے تحمل کے ساتھ اپنے مرغ کو اٹھایا۔ ''میں ابھی واپس آتا ہوں،'' اس نے مجمعے سے کہا۔ اور پھر پرودانسیوا گویلار سے مخاطب ہوا:

''تم گھر جاؤ اور ایک ہتھیار لے آؤ، کیونکہ میں تمھیں قتل کرنے جا رہا ہوں۔''

دس منٹ بعد وہ ہاتھ میں اپنے دادا کا دندانے دار بھالا لیے لوٹا۔ میدان میں، جہاں آدھے سے زیادہ گاؤں جمع ہو چکا تھا، پرودانسیوا گویلار اس کا منتظر تھا۔ اسے اپنا دفاع کرنے کا موقع نہ ملا۔ حوزے آرکادیو بوئندیا نے بیل کی سی طاقت سے، اُس صحیح نشانے کے ساتھ جس سے اوریلیانو بوئندیا اول نے علاقے کے چیتوں کا خاتمہ کیا تھا، بھالے سے اس کا گلا چیر ڈالا۔ اس رات، جو گاؤں کے لوگوں نے میدان میں پڑی لاش کے ساتھ جاگ کر گزاری، حوزے آرکادیو بوئندیا اپنی خواب گاہ میں گیا، جہاں اس کی بیوی اپنی عصمت کی حفاظت کے لیے زیرِ جامہ چڑھا رہی تھی۔ بھالے کی نوک اس کی جانب کر کے حوزے آرکادیو بوئندیا نے حکم دیا: ''اتارو اسے!'' ارسلا کو اپنے شوہر کے فیصلے کے بارے میں کوئی شبہ نہ تھا۔ ''جو کچھ ہو گا اس کے تم ہی ذمے دار ہو گے،'' وہ آہستہ سے بڑبڑائی۔ حوزے آرکادیو بوئندیا نے بھالا کچی زمین میں گاڑ دیا۔

''اگر تم نے اگوانوں کو جنم دیا تو ہم اِگوانے پال لیں گے،'' وہ بولا۔ ''لیکن اس گاؤں میں تمھاری وجہ سے مزید کوئی قتل نہیں ہو گا۔''

وہ جون کی ایک خوشگوار رات تھی، خنک اور چاندنی میں ڈوبی ہوئی، اور وہ صبح تک بستر میں پڑے خرمستیاں کرتے رہے، پرودانسیوا گویلار کے اقربا کے بین سے بوجھل ہوا کے ان جھونکوں سے لاتعلق جوان کی خواب گاہ میں آتے جاتے رہے۔

اس معاملے کو عزت کی خاطر ڈوئل کہہ کر دبا دیا گیا، لیکن حوزے آرکادیو بوئندیا اور اُرسلا دونوں کے ضمیر میں پھانس لگ چکی تھی۔ ایک رات نیند نہ آنے پر ارسلا بستر سے اٹھ کر آنگن میں رکھے مٹکے سے پانی لینے گئی تو اس نے پرودانسیوا گویلار کو مٹکے کے قریب کھڑا دیکھا۔ وہ نیلا ہو رہا تھا، اس کے چہرے پر اداسی تھی اور وہ اپنی گردن کے سوراخ کو ایسپارتو گھاس سے بھرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے دیکھ کر ارسلا کو بجائے خوف کے اس پر رحم آیا۔ وہ اُلٹے پاؤں کمرے میں واپس گئی اور اپنے شوہر کو بتایا کہ اس نے کیا دیکھا ہے، لیکن حوزے آرکادیو بوئندیا نے کوئی خاص توجہ نہ دی۔ ''اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ہمارے ضمیر کا بوجھ ہمیں پریشان کر رہا ہے۔''

دو راتوں بعد ارسلا نے پرودانسیوا گویلار کو پھر دیکھا۔ اس دفعہ وہ غسل خانے میں، ایسپارتو گھاس کی مدد سے، گردن پر جما خون صاف کر رہا تھا۔ ایک اور رات وہ بارش میں ٹہلتا ہوا نظر آیا۔ حوزے آرکادیو بوئندیا، جو اپنی بیوی کے فریبِ نظر سے تنگ آ چکا تھا، بھالے سے لیس ہو کر آنگن میں گیا۔ مقتول اپنے چہرے پر اداسی کے تاثرات لیے کھڑا تھا۔

''جہنم میں جاؤ،'' حوزے آرکادیو بوئندیا چلایا۔ ''جتنی مرتبہ تم آؤ گے، میں اتنی دفعہ تمھاری جان لوں گا۔'' پرودانسیوا گویلار وہیں کھڑا رہا۔ حوزے آرکادیو بوئندیا کی ہمت نہ ہوئی کہ اس پر بھالا پھینکے۔ اس رات کے بعد وہ کبھی چین سے نہ سو سکا۔ جس ویرانی کے ساتھ بارش میں کھڑے پرودانسیوا گویلار نے اس کی طرف دیکھا تھا، اس کی زِندوں میں لوٹنے کی وہ اتھاہ آرزو، اور وہ تفکر جس کے ساتھ وہ پانی کی تلاش میں پورے گھر میں بھٹکتا پھرتا تاکہ گھاس کو گیلا کر کے زخم پر پھاہا رکھ سکے، اس نے حوزے آرکادیو بوئندیا کو عذاب میں ڈال دیا۔ ''وہ سنگین اذیت سے دوچار ہے،'' اس نے ارسلا سے کہا۔ ''تم دیکھ سکتی ہو وہ خود کو کتنا تنہا محسوس کر رہا ہے۔'' ارسلا نے جب اگلی دفعہ اس کو چولھے پر رکھی پتیلیوں کے ڈھکن کھولتے دیکھا تو سمجھ گئی کہ وہ پانی تلاش کر رہا ہے؛ اسے پرودانسیوا گویلار پر اتنا ترس آیا کہ اس نے گھر میں جگہ جگہ پانی سے بھرے جگ رکھ دیے۔ ایک رات جب حوزے آرکادیو بوئندیا نے اسے

اپنے کمرے میں زخم دھوتے دیکھا تو اس سے مزید برداشت نہ ہوسکا۔

"ٹھیک ہے، پرودانسیو،" حوزے آرکادیو بوئندیا اس سے مخاطب ہوا، "ہم یہ گاؤں چھوڑ کر جا رہے ہیں، اتنی دور جتنا کہ ہم جا سکتے ہیں۔ اور اب ہم کبھی لوٹ کر نہ آئیں گے۔ اب تم سکون سے واپس جا سکتے ہو۔"

تو اس طرح انھوں نے پہاڑ عبور کرنے کی ٹھانی۔ حوزے آرکادیو بوئندیا کے چند دوستوں نے، جن کو اس مہم نے اکسایا، اپنے اپنے گھروں کا ساز و سامان لپیٹا، بیوی بچوں کو ساتھ لیا، اور انجانی سرزمین کی طرف چل پڑے۔

روانگی سے پیشتر حوزے آرکادیو بوئندیا نے بھالا آنگن میں دفن کیا اور اپنے شاندار مرغوں کی ایک ایک کر کے گردن کاٹی، اس یقین کے ساتھ کہ اس عمل سے پرودانسیو آگویلار کو سکون پہنچے گا۔ جو کچھ ارسلا نے ساتھ لیا وہ اس کی شادی کے چند جوڑے، کچھ برتن اور ایک چھوٹا سا صندوق تھا، جس میں سونے کے سکے تھے جو اس کے باپ نے اس کے لیے چھوڑے تھے۔ انھوں نے سفر کا کوئی قطعی منصوبہ نہیں بنایا۔ صرف اتنا کیا کہ ریوہاچا کی مخالف سمت راہ پکڑنے کی کوشش کی، تا کہ انھیں راستے میں کوئی شناسا نہ نظر آئے، اور وہ اپنا کوئی نام و نشان نہ چھوڑیں۔ وہ ایک مضحکہ خیز سفر تھا۔ چودہ ماہ بعد ارسلا نے، جس کا پیٹ بندر اور سانپ کا گوشت کھا کھا کر بگڑ چکا تھا، ایک لڑکے کو جنم دیا جس کے تمام خد و خال انسانوں جیسے تھے۔ ارسلا نے نصف سفر جھولے میں لیٹے لیٹے طے کیا جسے دو مرد اپنے کاندھوں پر اٹھائے چلتے تھے، کیونکہ ورم سے اس کی ٹانگیں بدہیئت ہوگئی تھیں اور ان میں بلبلوں کی مانند نیلی رگیں ابھر آئی تھیں۔ گو کہ ان کے دھنسے ہوئے پیٹ اور ویران آنکھیں دیکھ کر ترس آتا تھا، بچوں نے والدین کی بہ نسبت سفر کو بہتر طور پر سہا تھا۔ زیادہ تر وقت انھوں نے سفر سے مزہ ہی اٹھایا تھا۔ ایک صبح، تقریباً دو سال کے طویل سفر کے بعد، پہاڑی سلسلے کے مغربی دامن کو دیکھنے والے وہ پہلے انسان تھے۔ بادلوں میں ڈھکی چوٹی سے انھیں، دنیا کے دوسری طرف، عظیم دلدل کی آبی وسعت پھیلی نظر آئی۔ لیکن انھیں سمندر کبھی نہ ملا۔ اس دلدلی علاقے میں کئی ماہ بھٹکنے کے بعد، ان آخری مقامی انڈین لوگوں کو بہت پیچھے چھوڑ کر جو انھیں راستے میں نظر آئے تھے، ایک رات انھوں نے ایک پتھریلے دریا کے کنارے پڑاؤ ڈالا جس کا پانی شیشے کے جمے ہوئے دھارے کی طرح تھا۔ برسوں بعد، دوسری خانہ جنگی کے دوران، کرنل

اور ریلیانو بوئندیا نے اسی راستے سے گزرنے کی کوشش کی تھی، تاکہ ریوہاچا پر اچانک حملہ کر کے قبضہ جما سکے، اور چھ دن بعد وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ پاگل پن ہے۔ بہر حال، اس رات جب انھوں نے دریا کے کنارے خیمے گاڑے، اس کے باپ کے ساتھیوں کے چہروں پر ایسے تاثرات تھے گویا ان کا جہاز تباہ ہو چکا ہو اور اب واپسی کی کوئی راہ نہ ہو، لیکن ان کی تعداد میں سفر کے آغاز سے اب تک اضافہ ہو چکا تھا اور وہ طویل عمر پا کر مرنے کے لیے تیار تھے۔ اس رات حوزے آرکادیو بوئندیا نے خواب میں دیکھا کہ اس جگہ ایک آباد اور پُرصدا شہر کھڑا ہے جس کے گھروں کی دیواریں آئینے کی ہیں۔ اس نے لوگوں سے پوچھا یہ کون سا شہر ہے، اور انھوں نے جواب میں ایک ایسا نام لیا جو اس نے پہلے کبھی نہ سنا تھا، جس کے کوئی معنی نہ تھے، لیکن اس نام نے حوزے آرکادیو بوئندیا کے خواب میں ایک ماورائے طبیعی بازگشت پیدا کر دی: ماکوندو۔ دوسرے دن اس نے اپنے ساتھیوں کو قائل کر لیا کہ وہ سمندر کبھی نہ تلاش کر پائیں گے، اور ان سے دریا کے کنارے سب سے ٹھنڈے مقام پر زمین کو درختوں سے صاف کرنے کو کہا، اور وہاں انھوں نے گاؤں کی بنیاد ڈالی۔

حوزے آرکادیو بوئندیا کو خواب میں آئینے کی دیواروں والے گھروں کا مطلب اس وقت تک سمجھ میں نہ آیا جب تک اس نے زندگی میں برف نہ دیکھی۔ برف دیکھ کر اس نے سوچا کہ وہ خواب کے عمیق معنی کو پا گیا ہے۔ اس نے سوچا کہ مستقبل قریب میں وہ پانی جیسی معمولی چیز سے برف کی سلیں بنا سکیں گے، اور پھر گاؤں میں ان سلوں سے نئے گھر تعمیر کریں گے۔ پھر ماکوندو جھلستی ہوئی جگہ نہ رہے گا، جہاں دروازوں کے قبضے اور کنڈیاں تپش سے بل کھا جاتی تھیں، بلکہ ایک سرد، پُرفضا مقام میں بدل جائے گا۔ اگر وہ برف کا کارخانہ بنانے میں ثابت قدم نہ رہ سکا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اُن دنوں اپنے بیٹوں کی تعلیم کے سلسلے میں بے حد پُرجوش تھا، خاص طور پر اور ریلیانو کی تعلیم کے سلسلے میں، جس نے شروع ہی سے کیمیاگری کی طرف وجدان ظاہر کیا تھا۔ تجربہ گاہ پر جمی گرد صاف کی گئی۔ ملکیادیس کی دستاویزات کو سنجیدگی کے ساتھ، اس کے انوکھے پن کی تعریف و توصیف کیے بغیر، از سرِ نو پڑھا گیا، اور کئی پُرتحمل اور طویل نشستوں میں انھوں نے ارسلا کے سونے کو اس ملغوبے سے علیحدہ کرنے کی کوشش کی جو کڑھائی کے پیندے سے چپک گیا تھا۔ چھوٹے حوزے آرکادیو نے اس عمل میں برائے نام ہی حصہ لیا۔ جس عرصے میں اس کا باپ دل و جان کے ساتھ پانی کی نلکیوں میں الجھا رہا، وہ سرکش پہلوٹا، جو

ہمیشہ اپنی عمر سے بڑا نظر آتا، ایک لحیم شحیم نوبالغ میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اس کی آواز بدل گئی تھی۔ اس کے بالائی لب کے اوپر ابتدائی روئیدگی نمودار ہو چلی تھی۔ ایک رات جب ارسلا اس کے کمرے میں داخل ہوئی تو وہ بستر میں لیٹنے سے پہلے کپڑے اتار رہا تھا۔ ارسلا کو شرم اور رحم کا ملا جلا احساس ہوا۔ شوہر کے بعد وہ پہلا مرد تھا جس کو اس نے عریاں دیکھا۔ وہ زندگی کے لیے اتنے بھرپور طریقے سے لیس تھا کہ غیر معمولی نظر آتا تھا۔ ارسلا کو، جو تیسری دفعہ حمل سے تھی، شادی کے ابتدائی دنوں کی دہشت یاد آ گئی۔

اُن دنوں ایک چنچل، منھ پھٹ اور اشتعال انگیز عورت گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹانے کے لیے آئی۔ وہ تاش کے پتے دیکھ کر مستقبل بتانا جانتی تھی۔ ارسلا نے اپنے بیٹے کے بارے میں اس سے بات کی۔ اس کا خیال تھا کہ اس کے بیٹے کا عضو غیر معمولی طور پر بڑا ہے، اور اتنا ہی غیر فطری جتنا کہ اس کے عم زاد کی دُم تھی۔ عورت نے ایک انبساط پذیر قہقہہ لگایا جو پورے گھر میں ٹوٹتے ہوئے شیشے کے چھناکے کی طرح گونجتا رہا۔ ''تمھارے اندیشے کے برعکس وہ بے حد خوش قسمت ثابت ہوگا۔'' اپنی پیش گوئی کو ثابت کرنے کے لیے وہ تاش کے پتے ان کے گھر لے کر آئی، اور حوزے آرکادیو کے ساتھ باورچی خانے سے پرے گودام میں بند ہوگئی۔ اس نے خاموشی سے تاش کے پتے ایک پرانے بڑھئی کے تختے پر رکھے، اور جو کچھ اس کے دماغ میں آیا، منھ ہی منھ میں بڑبڑانا شروع کر دیا۔ لڑکا اس کے قریب منتظر کھڑا رہا۔ وہ تجسس کے بجائے اکتاہٹ محسوس کر رہا تھا۔ اچانک عورت نے ہاتھ بڑھا کر اس کو چھولیا۔ ''اوہ خدایا!'' وہ صرف اتنا ہی کہہ سکی؛ وہ حقیقتاً تعجب میں آ گئی تھی۔ حوزے آرکادیو کو اپنی ہڈیوں میں جھاگ سا بھرتا محسوس ہوا۔ ایک مضمحل خوف اور رونے کی شدید خواہش نے اسے آلیا۔ عورت نے کوئی اشارہ نہ کیا تھا، لیکن حوزے آرکادیو تمام رات اس کے لیے بے چین رہا؛ اُس کی بغلوں سے اٹھنے والی دھوئیں کی بو حوزے آرکادیو کی کھال میں سرایت کر گئی تھی۔ وہ چاہتا تھا تمام وقت اس عورت کے ساتھ رہے، وہ چاہتا تھا کہ وہ اس کی ماں ہوتی، اور وہ دونوں گودام سے کبھی نہ نکلتے، اور وہ کہتی، ''اوہ خدایا!'' ایک دن حوزے آرکادیو سے برداشت نہ ہو سکا اور وہ اس کو تلاش کرتا ہوا اس کے گھر تک جا پہنچا۔ وہ جھجکتا ہوا اندر داخل ہوا اور بیٹھک میں بے خود سا، منھ سے ایک لفظ نکالے بغیر بیٹھا رہا۔ اس لمحے حوزے آرکادیو کو اس عورت کی کوئی طلب نہ تھی۔ اس کو وہ مختلف لگی، اس تصور سے یکسر مختلف جو اس کی خوشبو نے جگایا تھا، گویا وہ کوئی اور ہو۔ اس نے کافی پی اور پژمردگی کے عالم میں باہر نکل آیا۔ اس رات

نیند نہ آنے کے مہیب لمحے میں، حوزے آرکادیو نے ایک وحشیانہ اضطراب کے ساتھ اس کی آرزو کی۔ لیکن اس دفعہ اسے اُس عورت کی طلب نہ ہوئی جیسی وہ اس دن گودام میں تھی، بلکہ اس عورت کی جیسا اسے حوزے آرکادیو نے اس سہ پہر پایا تھا۔

کئی دنوں بعد اُس نے اَچانک حوزے آرکادیو کو اپنے گھر بلوایا جہاں وہ اپنی ماں کے ساتھ تنہا تھی، اور اسے تاش کے پتے دکھانے کے بہانے اپنے کمرے میں لے گئی، اور پھر اس نے حوزے آرکادیو کو اتنی آزادی سے چھوا کہ اسے ابتدائی جھرجھری کے بعد مغالطہ ہونے لگا، اور اس نے لذت سے زیادہ خوف محسوس کیا۔ عورت نے اسے رات کے وقت آنے کی دعوت دی۔ حوزے آرکادیو نے ہامی بھرلی تا کہ وہاں سے نکل سکے، گو کہ وہ جانتا تھا کہ وہ جانے کے قابل نہیں ہے۔ لیکن اس رات حوزے آرکادیو نے جان لیا کہ اسے اس عورت کے پاس بہر صورت جانا ہے، اگر وہ اس قابل نہ ہوتب بھی۔ اس نے اندھیرے میں ٹٹول کر کپڑے پہنے، اور اپنے بھائی کی پُرسکون سانسوں کی آواز، دوسرے کمرے میں اپنے باپ کی اٹھنے والی خشک کھانسی، آنگن میں مرغیوں کا دمہ، مچھروں کی بھنبھناہٹ، تیزی سے دھڑکتے ہوئے دل کی دھڑکن، اور دنیا کی بے ترتیب ہلچل، جو اس نے پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی، سنتے ہوئے وہ خوابیدہ گلی میں نکل گیا۔ دل ہی دل میں اس نے تمنا کی کہ دروازے کے نہ صرف پٹ بند ہوں، بلکہ اس میں اندر سے چٹخنی بھی چڑھی ہوئی ہو۔ لیکن دروازہ کھلا تھا۔ اس نے انگلیوں کے سروں سے جیسے ہی دھکیلا، پٹ کھل گیا، ایک درد بھری لیکن واضح سسکی کے ساتھ، جس کی گونج اس کی روح میں منجمد ہو کے رہ گئی۔ جس لمحے وہ دیوار کے ساتھ ساتھ سرکتا ہوا اندر داخل ہوا، اسے وہی خوشبو آئی۔ وہ ابھی تک دالان میں تھا، جہاں عورت کے تینوں بھائیوں نے اپنی جھولنیاں تان رکھی تھیں، جو نہ اس کو دکھائی دے رہی تھیں اور نہ جن کے محلِ وقوع کا وہ اندھیرے میں اندازہ لگا سکتا تھا۔ وہ ٹٹولتا ہوا دالان سے گزر کر عورت کے کمرے کا دروازہ کھولنے کے لیے بڑھا، تا کہ اسے اندازہ ہو سکے کہ وہ کہاں کھڑا ہے۔ وہ جھولنیوں کی رسیوں سے، جو اس کے اندازے سے نیچی تھیں، اور ایک خراٹے لیتے ہوئے مرد سے ٹکرایا، جس نے سوتے میں کروٹ بدلی اور خواب میں بڑبڑایا: ''وہ بدھ کا دن تھا۔'' کمرے کے دروازے کا پٹ کھولتے وقت وہ ناہموار فرش پر گرتے گرتے بچا۔ اس گمبھیر اندھیرے میں، گزرے ہوئے لمحے کی نراس آرزو میں، اس کو اچانک احساس ہوا کہ وہ قطعی طور پر ہوش و حواس کھو بیٹھا ہے۔ اس

تنگ سے کمرے میں اس کی ماں، اس کی دوسری بیٹی اپنے بچوں اور شوہر کے ساتھ، اور وہ عورت، جو شاید وہاں تھی ہی نہیں، سو رہی تھی۔ وہ اُس کی خوشبو کے ذریعے اس تک جا پہنچتا اگر وہ خوشبو پورے گھر میں پھیلی ہوئی نہ ہوتی۔ وہ خوشبو اتنی بھرپور اور اتنی گمراہ کن تھی گویا اس کی اپنی جلد سے ہمیشہ سے لپٹی ہوئی ہو۔ وہ کافی دیر تک ساکت کھڑا رہا، اس تعجب میں کہ وہ بے خودی کے اس پاتال میں کیونکر جا گرا۔ اس دوران ایک ہاتھ پوری کھلی انگلیوں کے ساتھ آگے بڑھا، اور اندھیرے میں ٹٹولتے ہوئے اس کے چہرے کو چھوا۔ اسے تعجب نہ ہوا۔ انجانے میں وہ اس کی توقع کر رہا تھا۔ پھر اس نے خود کو اس ہاتھ کے سپرد کر دیا، اور ایک مہیب تھکان کی کیفیت میں، خود کو ایک بے ہیئت جگہ پر لے جانے دیا، جہاں اس کے کپڑے اتارے گئے اور اسے آلوؤں کی بوری کی طرح الٹا پلٹا گیا اور ایک طرف سے دوسری طرف لڑھکایا گیا، ایک اتھاہ اندھیرے میں جہاں بازو کسی کام کے نہ تھے، اور جہاں عورت کی خوشبو کے بجائے امونیا کی مہک تھی، اور جہاں اس نے عورت کے چہرے کو یاد کرنے کی کوشش کی اور نظروں کے سامنے اُرسلا کا چہرہ پایا، سراسیمہ آگہی میں، کہ وہ وہی کر رہا ہے جس کے کرنے کی اسے طویل مدت سے آرزو تھی اور جو اس کا خیال تھا وہ کبھی نہ کر سکے گا، یہ سمجھے بغیر کہ وہ کیا کر رہا ہے کیونکہ اسے ہوش نہ تھا کہ اس کے پیر کہاں ہیں اور سر کس طرف ہے، یا کس کا سر اور کس کے پیر، اور اس کے احساس کے ساتھ کہ اب وہ مزید اپنے گردوں کی سرد، طوفانی گڑگڑاہٹ کو برداشت نہ کر سکے گا، اور اپنی انتڑیوں کی ہوا کو، اور اس سراسیمگی کو کہ فرار ہو جائے، اور ساتھ ساتھ اس آرزو کو کہ اس برانگیختہ خاموشی اور مہیب تنہائی میں ہمیشہ کے لیے ٹھہرا رہے۔

اس کا نام پیلار ترنیرا تھا۔ وہ اُس خروج کا حصہ تھی جو ماکوندو کی بنیاد پڑنے پر اختتام کو پہنچا تھا۔ گھر والے گھسیٹ کر اسے اپنے ساتھ لائے تھے، تاکہ اسے ہمیشہ کے لیے اس شخص سے جدا کر سکیں جس نے اس کے ساتھ اُس وقت دست درازی کی تھی جب وہ چودہ سال کی تھی، اور اس سے محبت کرتا رہا یہاں تک کہ وہ بائیس برس کی ہو گئی۔ لیکن وہ اس صورت حال کو گاؤں پر ظاہر کرنے کا فیصلہ نہ کر پایا تھا، کیونکہ وہ ان لوگوں سے الگ تھا۔ اس نے دنیا کے آخری کونے تک پیلار ترنیرا کا پیچھا کرنے کا وعدہ کیا تھا لیکن اپنے معاملات کو سلجھانے کے بعد، اور وہ اس کے انتظار سے تھک چکی تھی۔ وہ ان تمام لمبے یا پستہ قد، گورے یا کالے مردوں پر اس کا گمان کرتی رہی جو اس کے تاش کے پتوں کے خوش آئند وعدوں

کے مطابق سمندر یا خشکی کے راستے، تین دن، تین ماہ یا تین سال کے اندر اندر آنے والے تھے۔ انتظار میں وہ اپنی رانوں کی مضبوطی، اپنے سینوں کی اٹھان اور اپنی نرم خوئی کھو بیٹھی تھی۔ اس نے صرف اپنے دل کا پاگل پن برقرار رکھا تھا۔ اس انوکھے کھلونے نے حوزے آرکادیو کو پاگل کر دیا۔ وہ ہر رات اس کے کمرے کی بھول بھلیوں سے گزر کر اس تک پہنچتا۔ ایک رات اس نے دروازہ بند پایا، اور کئی دفعہ دستک دی، یہ سوچ کر کہ جب وہ پہلی دفعہ دروازہ کھٹکھٹانے کی ہمت کر چکا ہے تو اسے، آخری لمحے تک دستک دینی ہوگی، یہاں تک کہ ایک ختم نہ ہونے والے انتظار کے بعد پیلار نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ وہ دن بھر لیٹا جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھتے ہوئے، چپکے چپکے گزشتہ رات کی یادوں کا مزہ لیتا۔ لیکن جب وہ گھر آتی، شادمان، لاتعلق، باتونی، تو حوزے آرکادیو کو اپنی گھبراہٹ چھپانے کی چنداں ضرورت نہ ہوتی، کیونکہ اس عورت کا، جس کے گونج دار قہقہے فاختاؤں کو خوف زدہ کر دیا کرتے، اس انجانی قوت سے کوئی واسطہ نہ تھا جس نے حوزے آرکادیو کو اپنی روح میں سانس لینا اور اپنے دل کی دھڑکن پر قابو پانا سکھایا تھا اور اسے یہ بات سمجھنے کا موقع دیا تھا کہ مردوں کو موت سے خوف کیوں آتا ہے۔ حوزے آرکادیو اپنے آپ میں اتنا مگن تھا کہ جب اس کے باپ اور بھائی نے یہ مژدہ سنایا کہ وہ دھاتوں کے اس ملغوبے کو توڑنے اور ارسلا کا سونا الگ کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں، تو وہ سمجھ نہ پایا کہ گھر والے آخر کیوں اتنا خوش ہو رہے ہیں۔

وہ درحقیقت کئی دنوں کی پیچیدہ اور انتھک محنت کی وجہ سے کامیاب ہوئے تھے۔ ارسلا خوش تھی، یہاں تک کہ اس نے علمِ کیمیاگری کی ایجاد کے لیے خدا کا شکر ادا کیا، جبکہ گاؤں کے لوگوں نے تجربہ گاہ پر یلغار کر دی اور گھر والوں نے بسکٹوں پر امرود کی جیلی لگا کر ان کی خاطر تواضع کر کے اس شاندار کامیابی کا جشن منایا، اور حوزے آرکادیو بوئندیا نے الگ کیا ہوا سونا لوگوں کو اس طرح دکھایا گویا وہ اس نے ایجاد کیا ہو۔ سب کو دکھانے کے بعد وہ اپنے بڑے بیٹے کے پاس گیا جو گزشتہ چند دنوں سے تجربہ گاہ میں شاذونادر ہی نمودار ہوا تھا۔ حوزے آرکادیو بوئندیا نے پیلی خشک ڈھیری بیٹے کی آنکھوں کے سامنے لا کر پوچھا، ''تمھیں یہ کیا نظر آتا ہے؟'' حوزے آرکادیو سچائی سے بولا:

''کتے کا پاخانہ۔''

حوزے آرکادیو بوئندیا نے اس کو ایسا طمانچہ رسید کیا کہ اس کے منہ سے خون اور آنکھوں سے

آنسو نکل آئے۔ اس رات پیلار نے اندھیرے میں روئی اور بوتل ٹٹول کر حوزے آرکادیو کے سوجے ہوئے منھ کی آرنیکا سے سکائی کی، اور ساتھ ساتھ وہ سب کچھ کیا جو وہ کرنا چاہتی تھی، اس بات کا خیال رکھتے ہوئے کہ اس کو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ وہ دونوں آپس میں قربت کی اس کیفیت کو پہنچ گئے کہ انھیں پتا ہی نہ چلا کہ کب انھوں نے آپس میں سرگوشیاں کرنا شروع کیں۔

''میں تمھارے ساتھ تنہا ہونا چاہتا ہوں،'' اس نے کہا۔ ''میں آج کل میں سب کو بتانے جا رہا ہوں، اور پھر ہم چوری چھپے رات کے اندھیرے میں ملنا بند کر دیں گے۔''

پیلار نے اس کو تسلی دینے کی کوشش نہ کی۔

''یہ بہت اچھا ہوگا،'' وہ بولی۔ ''اگر ہم تنہا رہیں تو میں لیمپ روشن رکھا کروں گی تاکہ ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ سکیں، اور میں دل کھول کر شور مچا سکوں گی اور کوئی ٹوکنے والا نہ ہوگا، اور تم میرے کانوں میں جو بھی بکواس کرنا چاہو، کر سکو گے۔''

اس گفتگو نے، اس چبھتی ہوئی عداوت نے جو اس کو اپنے باپ سے پیدا ہو گئی تھی، اور ایک غیر تابع محبت کے امکان نے، حوزے آرکادیو کے اندر ایک بردبار جرأت پیدا کر دی تھی۔ بے ساختگی میں، بغیر کسی تیاری کے، حوزے آرکادیو نے اپنے بھائی کو سب کچھ بتا دیا۔

شروع میں چھوٹا اوریلیانو صرف خطرے کو سمجھ سکا، خطرے کے بے پناہ امکان کو جو اس کے بھائی کے کارنامے سے منتھی تھا، اور وہ اس شے کے طلسم کو نہ سمجھ پایا۔ رفتہ رفتہ فکر نے اسے آ جکڑا۔ خطروں کی تفصیلات کے بارے میں سوچ کر، اپنے بھائی کی اذیتوں اور لذتوں کا گمان کر کے، اس کو بیک وقت خوف اور مسرت محسوس ہوئی۔ وہ اس کے انتظار میں صبح تک آنکھیں کھولے بستر میں پڑا رہتا، اس تنہا بستر میں جس کے نیچے لگتا تھا کوئلے دہک رہے ہیں، اور پھر وہ لیٹے باتیں کیا کرتے، یہاں تک کہ بستر سے اٹھنے کا وقت آ جاتا؛ لہٰذا جلد ہی دونوں لڑکے دن میں غنودگی کا شکار رہنے لگے، ان کو کیمیاگری اور باپ کی علم و دانش سے کوئی دلچسپی نہ رہی، اور دونوں نے تنہائی میں پناہ ڈھونڈی۔ ''یہ بچے پاگل ہو گئے ہیں،'' ارسلا نے کہا۔ ''یقیناً ان کے پیٹ میں کیڑے ہیں۔'' اس نے ایک بدذائقہ، کڑوا کسیلا مشروب پیٹ کے کیڑے نکالنے والی جڑی بوٹی کو کچل کر بنایا، جسے ان دونوں نے غیر متوقع آمادگی کے ساتھ پی لیا، اور وہ دونوں ایک ساتھ دن میں گیارہ دفعہ پاخانے گئے، اور سرخ رنگ کے کچھ کیڑے

خارج کیے جو انھوں نے مسرت کے ساتھ سب کو دکھائے، تاکہ اس طرح وہ ارسلا کو اپنی لاتعلقی اور غنودگی کی اصل وجہ کی جانب سے فریب میں مبتلا رکھ سکیں۔ چھوٹے اور یلیانو کو نہ صرف اب سب کچھ سمجھ میں آنے لگا تھا، بلکہ وہ اپنے بھائی کے تجربات کو اپنا سمجھ کر تصور ہی تصور میں ان تمام کیفیات سے گزرنے لگا، کیونکہ ایک موقعے پر جب حوزے آرکادیو تفصیل کے ساتھ محبت کی ترکیبیں اسے سمجھا رہا تھا، اور یلیانو نے بات روک کر پوچھا، ''کیسا محسوس ہوتا ہے؟'' حوزے آرکادیو نے فوراً جواب دیا:

''یہ زلزلے کی طرح ہوتا ہے۔''

جنوری کی ایک جمعرات کو دو بجے رات امارانتا پیدا ہوئی۔ پیشتر اس کے کہ لوگ کمرے میں داخل ہوتے، ارسلا نے اچھی طرح اس کا معائنہ کیا۔ وہ ہلکی پھلکی ریگ ماہی کی طرح تھی، لیکن اس کے تمام اعضا انسانی تھے۔ اور یلیانو اس نئی چیز کی طرف اس وقت تک متوجہ نہ ہوا جب تک گھر لوگوں سے بھر نہ گیا۔ افراتفری کے پردے میں وہ اپنے بھائی کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا جو گیارہ بجے رات سے غائب تھا۔ یہ ایک اتنا اضطراری فیصلہ تھا کہ اسے خود سے یہ بھی پوچھنے کا موقع نہ ملا کہ وہ اپنے بھائی کو پیلار ترنیرا کے کمرے سے کیسے نکالے گا۔ اس نے اس کے گھر کے کئی چکر لگائے، سیٹیاں بجائیں، یہاں تک کہ پو پھٹنے لگی، اور اسے مجبوراً واپس ہونا پڑا۔ ماں کے کمرے میں اس نے دیکھا کہ حوزے آرکادیو معصوم سا چہرہ لیے نومولود بہن سے کھیل رہا ہے۔

ارسلا نے ابھی چلّہ بھی ختم نہ کیا تھا کہ خانہ بدوش پھر وارد ہو گئے۔ اور یہ وہی شعبدہ باز اور جادوگر تھے جو برف لے کر آئے تھے۔ ملکیادیس کے قبیلے کے برعکس، انھوں نے یہ بات جلد ہی واضح کر دی کہ وہ ترقی کے پیامبر نہیں، بلکہ تفریح کے میرِ ساماں ہیں، یہاں تک کہ جب انھوں نے برف ان کے سامنے پیش کی تھی تب بھی انسانی زندگی کے لیے اس کے فوائد کی تشہیر نہیں کی تھی، بلکہ اسے صرف سرکس کے ایک عجوبے کے طور پر دکھایا تھا۔ اس دفعہ، دوسری بہت سی نت نئی اشیا کے ساتھ، وہ اڑنے والا قالین بھی لائے۔ لیکن انھوں نے اسے حمل و رسد کی ترقی کے ایک مظہر کے بجائے ایک تفریحی شے کے طور پر پیش کیا۔ لوگوں نے فوراً اپنے آخری سکوں کو کھود کر نکالا، تاکہ گاؤں کے گھروں کے اوپر اڑنے کا مزہ لوٹ سکیں۔ ایک اجتماعی افراتفری کے مسرت آمیز پردے میں، حوزے آرکادیو اور پیلار نے کئی خوشگوار گھنٹے ایک دوسرے کی قربت میں گزارے۔ وہ ہجوم میں ایک خوش و خرم، محبت میں گرفتار جوڑے کی مانند

گھومتے رہے، یہاں تک کہ خود انھیں بھی شبہ ہونے لگا کہ محبت ایک ایسا احساس بھی ہو سکتی ہے جوان کی خفیہ ملاقاتوں کی بے لگام، لیکن لمحاتی مسرت سے زیادہ گمبھیر اور فرحت بخش ہو۔ پیلار نے البتہ اس طلسم کو توڑ دیا۔ حوزے آرکادیو کے جوش وخروش سے، جو اس میں اس کی قربت سے پیدا ہوا تھا، متاثر ہو کر، پیلار نے موقع اور دستور کو خلط ملط کر کے اچانک حوزے آرکادیو کے سر پر آسمان ڈھا دیا۔ ''تم اب واقعی ایک مرد بن چکے ہو،'' اس نے کہا۔ اور چونکہ اس کی سمجھ میں نہ آسکا کہ پیلار کی بات کا کیا مطلب ہے، اس نے وضاحت کی:

''تم باپ بننے والے ہو۔''

چند روز تک حوزے آرکادیو کو گھر سے نکلنے کی ہمت نہ ہوئی۔ باورچی خانے میں پیلار کے گونجتے ہوئے قہقہے سن کر وہ بھاگ کر تجربہ گاہ میں پناہ لیتا، جہاں ارسلا کی رضامندی سے کیمیا گری کے آلات میں پھر سے جان پڑ گئی تھی۔ حوزے آرکادیو بوئندیا نے اپنے گمراہ بیٹے کو مسرت کے ساتھ تجربہ گاہ میں خوش آمدید کہا، اور اسے پارس پتھر کی تلاش سے روشناس کرایا، جو اس نے آخر کار شروع کر دی تھی۔ ایک سہ پہر لڑکے تجربہ گاہ کی کھڑکی کے قریب سے تیزی سے اڑتے ہوئے قالین کو دیکھ کر، جس پر خانہ بدوش اور گاؤں کے بچے بیٹھے ہاتھ ہلا رہے تھے، جوش میں آگئے، لیکن حوزے آرکادیو بوئندیا نے نظر اٹھا کے بھی نہ دیکھا۔ ''انھیں خواب دیکھنے دو،'' اس نے کہا۔ ''ہم ان سے بہتر طریقے پر پرواز کریں گے، ایک گھٹیا سی بستر کی چادر سے کہیں بہتر سائنسی وسائل کے ساتھ۔'' گو کہ اس نے دلچسپی کا ڈھونگ رچایا، حوزے آرکادیو پارس پتھر کی قوتوں کو سمجھ نہ پایا، جو اسے ایک بے ہنگم بوتل کی مانند نظر آتا تھا۔ وہ اپنی فکروں سے آزاد ہونے میں کامیاب نہ ہو سکا تھا۔ اس کی بھوک اڑ چکی تھی اور آنکھوں سے نیند غائب تھی۔ وہ بدمزاجی کا شکار ہو گیا، بالکل اسی طرح جس طرح اس کا باپ اپنے تجربات کی ناکامی پر ہو جایا کرتا تھا، اور اس کی بے چینی اتنی بڑھ گئی کہ حوزے آرکادیو بوئندیا نے اس کو تجربہ گاہ کی ذمے داریوں سے سبک دوش کر دیا، یہ سوچ کر کہ غالباً وہ کیمیا گری کو دل پر لے گیا ہے۔ اوریلیانو البتہ سمجھ چکا تھا کہ اس کے بھائی کی پریشانی کا سبب پارس پتھر کی تلاش نہیں، لیکن وہ اُس کا اعتماد حاصل نہ کر سکا۔ حوزے آرکادیو اپنی پرانی بے ساختگی کھو بیٹھا تھا۔ وہ ایک رازدار اور بے تکلف شخص سے اپنی ذات میں سمٹے ہوئے بداندیش انسان میں بدل گیا تھا۔ دنیا سے تلخ کینہ لیے، تنہائی کی تلاش میں ایک رات وہ

حسبِ معمول گھر سے نکلا، لیکن پیلار ترنیرا کے گھر نہ گیا بلکہ میلے کی گہما گہمی میں جا کر گم ہو گیا۔ سب تماشوں کو بغیر کسی دلچسپی کے دیکھنے کے بعد، اس کو ایک ایسی شے نظر آئی جو اس میلے کا حصہ نہ لگتی تھی: وہ ایک بے حد نوخیز، خانہ بدوش لڑکی تھی، تقریباً ایک بچی، جو منکوں موتیوں کے بوجھ تلے جھکی جاتی تھی، اور اس سے زیادہ حسین لڑکی حوزے آرکا دیو نے آج تک نہ دیکھی تھی۔ وہ اس مجمعے میں کھڑی تھی جو والدین کی نافرمانی کرنے کے سبب ایک شخص کے سانپ کے قالب میں ڈھل جانے کا مغموم تماشا دیکھ رہا تھا۔

حوزے آرکا دیو نے تماشے پر کوئی توجہ نہ دی۔ جب سانپ نما آدمی سے تکلیف دہ پوچھ گچھ ہو رہی تھی، وہ مجمعے کو چیرتا پہلی قطار تک جا پہنچا، جہاں وہ لڑکی کھڑی تھی، اور اس کے پیچھے جا کر رک گیا۔ اس نے لڑکی کی پشت پر دباؤ ڈالا۔ لڑکی نے ہٹنے کی کوشش کی، لیکن وہ زیادہ قوت کے ساتھ اس کی پشت سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ تب لڑکی نے اسے محسوس کیا۔ وہ ساکت کھڑی رہی، تعجب اور خوف سے لرزاں؛ اس کو اس لمس کا یقین نہیں آ رہا تھا، اور آخر اس نے ایک لرزتی مسکراہٹ کے ساتھ پیچھے مڑ کر حوزے آرکا دیو کو دیکھا۔ اس لمحے دو خانہ بدوشوں نے سانپ نما آدمی کو پنجرے میں ڈالا اور خیمے کے اندر لے گئے۔ ایک خانہ بدوش نے، جو تماشا پیش کر رہا تھا، اعلان کیا:

''اور اب، خواتین و حضرات، ہم آپ کے سامنے اُس عورت کی خوفناک آزمائش کا تماشا پیش کرتے ہیں جس کا سر ڈیڑھ سو سال سے قلم کیا جا رہا ہے؛ یہ سزا اسے اس بات کی مل رہی ہے کہ اس نے وہ دیکھ لیا جو اسے نہیں دیکھنا چاہیے تھا۔''

حوزے آرکا دیو اور خانہ بدوش لڑکی نے عورت کا سر قلم ہوتے ہوئے نہیں دیکھا۔ وہ مجمعے سے نکل کر لڑکی کے خیمے میں چلے گئے، جہاں انھوں نے کپڑے اتارتے ہوئے ایک بے خوف اشتیاق کی کیفیت میں ایک دوسرے کو بوسے دیے۔ خانہ بدوش لڑکی نے کلف دار لیس کی قمیص اور انگیا اتاری۔ اب اس کے جسم پر کچھ نہ تھا۔ اپنے ابتدائی پستانوں اور پتلی پتلی ٹانگوں کے ساتھ، جو حوزے آرکا دیو کے بازوؤں سے بھی پتلی تھیں، وہ ایک چھوٹے سے کمزور مینڈک کی مانند لگ رہی تھی، لیکن اس کی قوتِ فیصلہ اور حرارت نے اس کی کمزوری چھپا لی تھی۔ لیکن پھر بھی حوزے آرکا دیو پر اس کی گرمی کا اثر نہ ہوا، کیونکہ وہ ایک خیمۂ عام تھا جہاں خانہ بدوش کھیل تماشوں کی اشیا لیے آ جا رہے تھے اور اپنے کاموں میں مصروف تھے، یہاں تک کہ وہ بستر کے قریب پانسہ کھیلنے کے لیے توقف بھی کرتے۔ لیمپ نے، جو وسط

میں ایک کھمبے سے لٹک رہا تھا، تمام خیمے کو روشن کر رکھا تھا۔ خرمستیوں کے ایک وقفے میں حوزے آرکا دیو، یہ جانے بغیر کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے، بستر میں دراز ہو گیا، جبکہ لڑکی اس کے جذبات جگانے کی کوشش کرتی رہی۔ کچھ دیر بعد ایک بھرپور جسم والی خانہ بدوش عورت ایک آدمی کے ساتھ خیمے میں داخل ہوئی، جو نہ خانہ بدوشوں میں سے تھا اور نہ گاؤں کا باسی تھا، اور وہ دونوں بستر کے قریب آکر کپڑے اتارنے لگے۔ عورت نے لیٹے ہوئے آرکا دیو پر یوں ہی ایک نظر ڈالی، اور ایک جاں گداز شوق کے ساتھ اس کے شاندار، آسودہ عضو کا معائنہ کیا۔

''میرے بیٹے،'' اس نے کہا، ''خدا تم کو سلامت رکھے، اسی طرح جیسے کہ تم ہو۔''

حوزے آرکا دیو کی ساتھی نے ان سے کہا کہ وہ ان کو تنہا چھوڑ دیں، اور وہ جوڑا بستر کے قریب فرش پر لیٹ گیا۔ ان کے شہوانی اختلاط سے حوزے آرکا دیو کے جذبات جاگ اٹھے۔ پہلے لمس کے ساتھ ہی لڑکی کے جسم کی ہڈیوں کا ایک ایک جوڑ چیخ کر گوٹیوں کے ڈبے کی طرح کھل گیا، اس کی جلد پر پسینے کے قطرے ابھر آئے، اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں، اور اس کے جسم سے مٹی کی موہوم سی خوشبو اور ایک غمگین فغاں اٹھنے لگی۔ لیکن اس نے اس اتصال کو اپنی مضبوط خاصیت اور ایک قابل تحسین بہادری کے ساتھ برداشت کیا۔ حوزے آرکا دیو نے خود کو فضا میں، ایک ملکوتی تاثر کی کیفیت کی جانب بلند ہوتے ہوئے محسوس کیا، اور اس کا دل محبت آمیز فحش فقروں سے بھر آیا، جو اس نے لڑکی کے کانوں میں انڈیل دیے، اور جو لڑکی کے منھ سے اس کی اپنی زبان میں ترجمہ ہو کر نکلے۔ وہ جمعرات کا دن تھا۔ سنیچر کے روز حوزے آرکا دیو نے ایک سرخ کپڑا سر پر لپیٹا اور خانہ بدوشوں کے ساتھ نکل گیا۔

جب ارسلا کو اس کی غیر موجودگی کا علم ہوا تو اس نے حوزے آرکا دیو کو پورے گاؤں میں تلاش کیا۔ جس مقام سے خانہ بدوشوں نے اپنے خیمے لپیٹے تھے، وہاں کوڑے کے ڈھیر اور بجھے ہوئے الاؤ سے دھواں دیتی راکھ کے سوا کچھ نہ تھا۔ کسی نے، جو کوڑے پر سے منکے چن رہا تھا، اُرسلا کو بتایا کہ ایک رات پہلے اس نے ارسلا کے بیٹے کو کارواں کے ہنگامے میں سانپ نما آدمی کا پنجرہ دھکیلتے دیکھا تھا۔ ''وہ خانہ بدوش ہو گیا ہے،'' ارسلا نے چیخ کر اپنے شوہر کو اطلاع دی، جس نے بیٹے کی گمشدگی پر ذرا بھی تشویش کا اظہار نہ کیا تھا۔

''کاش یہ بات سچ ہو،'' حوزے آرکا دیو بوئندیا نے ہاون دستے میں اس شے کو کوٹتے ہوئے کہا

جسے وہ ہزاروں دفعہ پیس کر گرم کرنے کے بعد دوبارہ کوٹ رہا تھا۔ ''اس طرح وہ مرد بننا سیکھ لے گا۔''

ارسلا نے لوگوں سے پوچھا کہ خانہ بدوش کس سمت گئے ہیں۔ وہ اس راستے پر پوچھتے پوچھتے آگے نکلتی چلی گئی، اس خیال میں کہ خانہ بدوشوں کو جا پکڑے گی۔ وہ گاؤں سے دور ہوتی گئی، یہاں تک کہ اس نے اتنی مسافت طے کر لی کہ واپس پلٹنے کا خیال ہی نہ رہا۔ حوزے آرکادیو بوئندیا کو رات کے آٹھ بجے اس وقت اپنی بیوی کے لاپتا ہو جانے کا علم ہوا جب وہ اس ملغوبے کو گوبر کی کیاری میں گرم ہونے کے لیے رکھ کر، ننھی امارانتا کے رونے کی آواز سن کر یہ دیکھنے کے لیے اندر گیا کہ بچی کو کیا ہوا ہے۔ چند گھنٹوں کے اندر اندر اس نے ساز و سامان سے لیس لوگوں کا ایک گروہ اکٹھا کر لیا، اور امارانتا کو ایک عورت کے حوالے کر کے، جس نے اس کو دودھ پلانے کی ذمے داری لی، ارسلا کی تلاش میں اَن دیکھی راہوں پر نکل کھڑا ہوا۔ اور یلیانوان کے ساتھ تھا۔ چند مقامی مچھیروں نے، جن کی زبان وہ نہ سمجھ سکے، اشاروں کی مدد سے بتایا کہ انھوں نے اس راستے سے کسی کو گزرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ تین دن کی ناکام تلاش کے بعد وہ گاؤں لوٹ آئے۔

حوزے آرکادیو بوئندیا کئی ہفتے پریشانی کے عالم میں رہا۔ اس نے ننھی امارانتا کا ماں کی طرح خیال رکھا۔ وہ اس کو نہلاتا، کپڑے بدلاتا، دن میں چار دفعہ عورت کے گھر دودھ پلوانے لے جاتا، یہاں تک کہ رات کو اسے لوریاں بھی دیتا جو ارسلا کو کبھی سنانی نہ آئی تھیں۔ ایک دن پیلار نے گھر کا کام کاج اپنے ذمے لینے کی پیشکش کی۔ اور یلیانو کو، جس کی پراسرار حس اس افتاد کے بعد اور تیز ہو گئی تھی، پیلار کو آتے دیکھ کر ایک الہام سا ہوا۔ اس کو یقین ہو گیا کہ پیلار کسی ناقابلِ بیان طریقے سے اس کے بھائی کے فرار اور اس کی ماں کی گمشدگی کی ذمے دار ہے، اور اس نے پیلار کو ایک خاموش اور کٹھور عداوت کے ساتھ اس طرح دیکھا کہ وہ اس گھر میں پھر کبھی داخل نہ ہوئی۔

وقت نے سب کچھ معمول کے مطابق کر دیا۔ حوزے آرکادیو بوئندیا اور اس کے بیٹے کو اس بات کا احساس بھی نہ ہوا کہ کب وہ تجربہ گاہ میں واپس لوٹے، گرد و غبار صاف کیا، پانی کی نلکیاں سلگائیں اور دوبارہ دھات کے اس ملغوبے کو گوبر سے نکالا جہاں وہ مہینوں سے پڑا سو رہا تھا۔ ننھی امارانتا بید کی ٹوکری میں لیٹی تجسس سے اپنے باپ اور بھائی کو تجربوں میں ڈوبا ہوا دیکھا کرتی، اس چھوٹے سے کمرے میں جس کی فضا پارے کے بخارات کی موجودگی سے لطیف ہو گئی تھی۔ ارسلا کے جانے کے چند ماہ کے بعد،

ایک خاص موقعے پر عجیب وغریب واقعات رونما ہونے لگے۔ ایک خالی فلاسک جو الماری میں مدتوں سے رکھا ہوا تھا، اتنا بھاری ہو گیا کہ اسے ہلانا مشکل ہو گیا، برتن میں رکھا پانی بغیر آگ پر چڑھے ابلنے لگتا یہاں تک کہ بخارات بن کر اڑ جاتا۔ حوزے آرکادیو بوئندیا اور اس کے بیٹے نے یہ عجیب وغریب کرشمے حیرانی اور اضطراب کے ساتھ دیکھے۔ ایک دن امارانتا کی ٹوکری نے خود بخود ہلنا شروع کر دیا اور کمرے میں گردش کرنے لگی، اور اوریلیانو نے پریشانی کے عالم میں اسے روکنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کا باپ اس واقعے سے خائف نہ ہوا۔ اس نے ٹوکری کو اس کی جگہ پر رکھ کر میز کے پائے سے باندھ دیا، اس یقین کے ساتھ کہ جس واقعے کا اسے مدتوں سے انتظار تھا، وہ رونما ہونے والا ہے۔ یہی وہ موقع تھا جب اوریلیانو نے اپنے باپ کو کہتے سنا:

''اگر تمھیں خدا کا خوف نہیں تو دھاتوں کے ذریعے اس سے ڈرو۔''

ارسلا تقریباً پانچ ماہ بعد اچانک واپس آ گئی۔ وہ ہشاش بشاش، تجدیدِ شباب کے ساتھ، خوشی میں مست، اور نئے کپڑوں میں ملبوس لوٹی جن کی وضع قطع گاؤں میں پہلے کسی نے نہ دیکھی تھی۔ ارسلا کی واپسی کا حوزے آرکادیو بوئندیا پر اتنا اثر ہوا کہ اس سے کھڑا نہ ہوا جاتا تھا۔ ''تو یہ بات تھی!'' وہ چلّایا۔ ''مجھے معلوم تھا یہ ہونے والا ہے۔'' اور اسے واقعی اس کا یقین تھا، کیونکہ اس طویل قید کے دوران، جب وہ دھاتوں کے تجربات میں مصروف تھا، اس نے دل کی گہرائیوں سے تمنا کی تھی کہ وہ معجزہ جو ظہور میں آنے والا ہے، پارس پتھر کی دریافت، اس سانس کی آزادی جس سے خوابیدہ دھاتیں جی اٹھیں، یا وہ قوت جس سے گھر کے تالے اور چوکھٹیں سونے میں بدل جائیں، نہ ہو، بلکہ وہی ہو جو ہوا: ارسلا کی واپسی۔ لیکن ارسلا اس گرم جوشی میں شریک نہ ہوئی۔ اس نے حوزے آرکادیو بوئندیا کو ایک روایتی بوسہ دیا، گویا وہ محض ایک گھنٹے بعد گھر لوٹی ہو، اور کہا:

''دروازے کے باہر تو دیکھنا۔''

حوزے آرکادیو بوئندیا نے جب باہر جا کر گلی میں مجمعے کو دیکھا تو ششدر و پنج سے نکلنے میں اسے کافی وقت لگا۔ وہ خانہ بدوش نہ تھے۔ وہ انھی جیسے مرد اور عورتیں تھیں، سیدھے بالوں اور سانولی رنگت والے لوگ، جو انھی کی زبان بولتے اور انھی تکلیفوں کا رونا روتے۔ ان کے ساتھ کھانے پینے کی اشیا سے لدے خچر تھے، اور بیل گاڑیاں جن پر گھریلو استعمال کے برتن لدے ہوئے تھے، سیدھی سادھی دنیاوی

اشیا جنھیں روزمرہ کی دنیا کے خوانچہ فروش بغیر کسی شور شرابے کے بیچ رہے تھے۔ وہ دلدلی علاقے کے اُس پار سے آئے تھے جو صرف دو دن کے فاصلے پر تھا، جہاں ایسے قصبے تھے جن میں سال کے ہر ماہ ڈاک پہنچا کرتی تھی، اور جن کے باشندے عمدہ رہن سہن کے طور طریقوں سے واقف تھے۔ ارسلا کو خانہ بدوش تو نہ ملے تھے، لیکن اس نے وہ راستہ پالیا تھا جو اس کا شوہر اپنی شاندار ایجادات کی بے نتیجہ جستجو کے دوران دریافت کرنے میں ناکام رہا تھا۔

❋

۳

پیلار ترنیرا کے بیٹے کو اس کے پیدائش کے دو ہفتے بعد دادا دادی کے گھر لے آیا گیا۔ ارسلا نے اسے ناخوشی سے گھر میں داخل کیا، اپنے شوہر کی ضد کے آگے ایک بار پھر بے بس ہوکر، جو یہ خیال برداشت نہ کرسکتا تھا کہ اس کا خون اس سے دور رہے، لیکن اس نے یہ شرط عائد کی کہ بچے کو اس کے اصل حسب نسب کا کبھی پتا نہ چلے۔ گو کہ بچے کو حوزے آرکادیو کا نام دیا گیا، اسے سب لوگ صرف آرکادیو کہہ کر پکارتے تا کہ الجھن نہ ہو۔ اُن دنوں گاؤں میں اتنی گہما گہمی، اور گھر میں اتنی چہل پہل تھی کہ بچوں کی دیکھ بھال کا کام ضمنی سطح پر چلا گیا تھا۔ بچوں کو ویزیتاسیون، ایک مقامی گواہیرو عورت، کے حوالے کردیا گیا تھا، جو اپنے بھائی کے ساتھ قصبے پہنچی تھی، بے خوابی کی وبا سے فرار ہوکر جو اُن کے قبیلے میں کئی سال سے پھیلی ہوئی تھی۔ وہ دونوں اتنے اطاعت گذار اور مدد کے لیے تیار تھے کہ ارسلا نے انھیں گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹانے کے لیے رکھ لیا۔ اس طرح آرکادیو اور امارانتا ہسپانوی زبان سیکھنے سے پہلے گواہیرو بولنے لگے تھے، اور انھوں نے چھپکلی کا شوربہ اور مکڑیوں کے انڈے کھانا سیکھ لیے، جس کا علم ارسلا کو نہ ہوا، جو اپنے شکر کے جانوروں کے بڑھتے ہوئے کاروبار میں بے حد مصروف رہنے لگی تھی۔ ماکوندو میں تبدیلی آگئی تھی۔ جو لوگ ارسلا کے ساتھ آئے تھے، انھوں نے یہ خبر پھیلا دی کہ یہاں کی زمین بہت عمدہ ہے اور دلدلی علاقے کے مقابلے مین امتیازی حیثیت کی حامل ہے، لہٰذا ماکوندو پرانے وقتوں کے چھوٹے سے گاؤں سے ایک فعال قصبے میں بدل گیا، دکانوں، کارگاہوں اور ایک

باقاعدہ تجارتی راستے والا قصبہ، جس سے عرب ڈھیلی ڈھالی پتلونیں پہنے اور کانوں میں بالے لٹکائے آتے، اور کانچ کے منکوں کے عوض طوطے لیا کرتے۔ حوزے آرکادیو بوئندیا کو ایک لمحے کا آرام نہ ملتا۔ سامنے کی حقیقت کے سحر میں آ کر، جو اس کے تخیل کی وسیع کائنات سے زیادہ انوکھی تھی، وہ کیمیا گری میں تمام دلچسپی کھو بیٹھا، اس نے وہ مادّہ اٹھا کر رکھ دیا جو مہینوں کے جوڑ توڑ سے رقیق ہو چلا تھا، اور دوبارہ پرانے دنوں والا ایک پُرعزم آدمی بن گیا، جب اس نے گاؤں کا نقشہ اس طرح ترتیب دیا تھا کہ کوئی شخص ایسی مراعات نہ پا سکے جو سب کو حاصل نہ ہوں۔ نئے آنے والوں میں اس کو اتنا استناد حاصل ہو گیا کہ اس سے مشورہ کیے بغیر نہ گھر کی بنیاد ڈالی جاتی اور نہ دیواریں کھڑی کی جاتیں، اور فیصلہ کیا گیا کہ زمین کی تقسیم کا نگراں اسے بنایا جائے۔ جب کرتب دکھانے والے خانہ بدوش واپس آئے، جن کا آوارہ کارنیوال تقدیر اور اتفاقات کے کھیلوں کے ایک عظیم الشان ادارے میں بدل گیا تھا، تو ان کا بے حد مسرت کے ساتھ استقبال کیا گیا، کیونکہ خیال یہ تھا کہ حوزے آرکادیو ان کے ساتھ واپس آیا ہوگا۔ لیکن حوزے آرکادیو واپس نہ آیا تھا، اور نہ ہی وہ سانپ نما آدمی ان کے ساتھ تھا جو ارسلا کے خیال میں واحد شخص تھا جو حوزے آرکادیو کے بارے میں ان کو کچھ بتا سکتا تھا، لہٰذا خانہ بدوشوں کو قصبے میں پڑاؤ ڈالنے کی اجازت نہ ملی اور انھیں آئندہ وہاں قدم نہ رکھنے کی تنبیہ کی گئی، کیونکہ انھیں شہوت پرستی اور جنسی کجروی کا پیامبر سمجھا جاتا تھا۔ حوزے آرکادیو بوئندیا نے البتہ صاف لفظوں میں واضح کر دیا کہ ملکیادیس کے پرانے قبیلے کے لیے گاؤں کے دروازے ہمیشہ کھلے رہیں گے، جس نے گاؤں کی ترقی اور خوشحالی میں اپنے علم و دانش اور شاندار ایجادات کے ذریعے معاونت کی تھی۔ لیکن ملکیادیس کا قبیلہ، بقول ان خانہ بدوشوں کے، روئے زمین سے فنا ہو چکا تھا، کیونکہ وہ انسانی علم کی حدوں سے پرے نکل گیا تھا۔

تخیل کے عذاب سے کم از کم کچھ عرصے کے لیے آزاد ہو کر، حوزے آرکادیو بوئندیا نے مختصر سی مدت میں نظم و ضبط اور کام کا ایک نظام ترتیب دیا جس میں صرف ایک آزادی کی گنجائش رکھی گئی: ان پرندوں کی آزادی جنھوں نے ماکوندو کی بنیاد پڑنے سے اب تک وقت کے گزران کو خوش الحان نغموں سے پُرمسرت کیا تھا، اور ان کی جگہ ہر گھر میں موسیقی والی گھڑیاں نصب کی گئیں۔ وہ شاندار گھڑیاں منقش لکڑی کی بنی ہوئی تھیں جو عربوں نے طوطوں کے عوض انھیں دی تھیں، اور جنھیں حوزے آرکادیو بوئندیا نے اس صراحت سے ہم وقت کیا تھا کہ پورا گاؤں ہر آدھ گھنٹے بعد ایک ہی نغمے کے اٹھتے ہوئے سروں

سے جھوم اٹھتا، وہ نغمہ جو عین دوپہر کے وقت اپنے عروج پر پہنچتا، ایک مکمل والز کی طرح درست اور ہم آواز۔ یہ حوزے آرکادیو بوئندیا ہی تھا جس نے ان برسوں میں یہ فیصلہ کیا کہ انھیں کیکر کی جگہ گلیوں میں بادام کے درخت لگانے چاہییں، اور اسی نے ایسا طریقہ دریافت کیا، جو اس نے کسی کو نہ بتایا، جس سے وہ درخت ہمیشہ ہرے بھرے رہتے۔ بہت برسوں بعد، جب ماکوندو جست کی چھتوں والے لکڑی کے گھروں کے ایک میدان میں تبدیل ہو گیا تھا، بادام کے شکستہ اور گرد آلود درخت قدیم ترین گلیوں میں اب بھی کھڑے تھے، جو کسی کو معلوم نہ تھا کہ کس نے لگائے تھے۔ جن دنوں اس کا باپ گاؤں کا نظام درست کر رہا تھا، اور اس کی ماں شکر کی مچھلیوں اور مرغیوں کے شاندار کاروبار سے گھر کی دولت میں اضافہ کر رہی تھی جس کی وجہ سے گھر میں دن میں دو دفعہ سالسا لکڑی کی ڈنڈیاں لٹکائی جاتیں، اور یلیانو گھنٹوں اس ترک کردہ تجربہ گاہ میں گزارتا اور خود تجربے کر کر کے چاندی کا کام سیکھتا۔ مختصر سی مدت میں اس نے اتنی تیزی سے قد نکالا کہ بڑے بھائی کے چھوڑے ہوئے کپڑے اس پر تنگ ہونے لگے اور وہ اپنے باپ کے کپڑے پہننے لگا۔ لیکن ویزیتاسیون کو قمیصوں اور پتلونوں میں چنٹیں ڈالنی پڑتی تھیں، کیونکہ اوریلیانو پر دوسرے لوگوں جیسا مٹاپا نہ چڑھا تھا۔ بلوغت نے اس کی آواز کی نرمی ختم کر دی تھی اور اس کو خاموش طبع اور قطعی طور پر تنہا کر دیا تھا، لیکن دوسری طرف اس کی آنکھوں میں تاثرات کی وہ شدت دوبارہ عود کر آئی تھی جو پیدائش کے وقت تھی۔ وہ چاندی کے کام پر اتنی توجہ مرکوز رکھتا کہ بمشکل کھانا کھانے کے لیے تجربہ گاہ سے نکلتا، حوزے آرکادیو بوئندیا اس کے اندر ہی اندر سمٹنے سے اتنا متفکر ہوا کہ اس نے، یہ سوچ کر کہ شاید اسے عورت کے پاس جانے کی ضرورت ہے، اسے گھر کی چابیاں اور کچھ پیسے دیے، لیکن اوریلیانو نے وہ پیسے آبِ شاہی تیار کرنے کے لیے جوہرِ نمک خریدنے میں لگا دیے، اور چابیوں پر سونے کا پانی چڑھا کر انھیں خوبصورت بنا دیا۔ اس کی بے اعتدالی کا آرکادیو اور امارانتا کی حرکتوں سے مقابلہ نہ ہو سکتا تھا، جن کے دودھ کے دانت ٹوٹ چکے تھے اور نئے دانت نمودار ہو رہے تھے، اور جو مقامی انڈین لوگوں کی سی عبائیں گھسیٹتے پھرتے اور اس بات پر اڑے رہتے کہ ہسپانوی نہیں بلکہ گواہیرو ہی بولیں گے۔ ''تمھیں شکایت نہیں کرنی چاہیے،'' ارسلا نے اپنے شوہر سے کہا۔ ''بچوں کو والدین کا پاگل پن وراثت میں ملتا ہے۔'' اور جب وہ اپنی قسمت کو کوس رہی تھی، اس یقین کے ساتھ کہ اس کے بچوں کی وحشیانہ حرکتیں اتنی ہی خوفناک ہیں جتنی کہ سؤر کی دم، اور یلیانو نے اس کی طرف اس

طرح دیکھا کہ وہ تذبذب میں مبتلا ہو گئی۔

''کوئی آ رہا ہے،'' اس نے اُرسلا کو بتایا۔

ارسلا نے اس پیش گوئی کو گھریلو عورت کی منطق سے سمجھنا چاہا، جیسا کہ وہ ہمیشہ کیا کرتی تھی جب بھی اوریلیانو اس قسم کی بات کرتا۔ کسی کا آنا عام بات تھی۔ روزانہ درجنوں اجنبی، بغیر شکوک و شبہات ابھارے اور بغیر کسی اسرار کے، ماکوندو آیا کرتے۔ بہر حال، ہر منطق سے بالاتر، اوریلیانو کو اپنی پیش گوئی پر پورا یقین تھا۔

''میں نہیں جانتا وہ کون ہوگا،'' اس نے اصرار کیا، ''لیکن وہ جو کوئی بھی ہے، روانہ ہو چکا ہے۔''

اس اتوار در حقیقت ربیکا پہنچی۔ وہ صرف گیارہ سال کی تھی۔ اس نے مانورے سے ماکوندو تک کا کٹھن سفر چمڑے کے چند تاجروں کے ہمراہ طے کیا تھا، جنھوں نے ربیکا کو ایک خط سمیت حوزے آرکادیو بوئندیا تک پہنچانے کی ذمے داری لی تھی، لیکن وہ ٹھیک سے سمجھا نہ پائے کہ آخر وہ کون شخص تھا جس نے یہ کام ان کے سپرد کیا تھا۔ ربیکا کا ساز و سامان صرف ایک چھوٹے سے صندوق، رنگ دار پھولوں سے مزین ایک جھولنے والی کرسی اور ایک ٹاٹ کی بوری پر مشتمل تھا، جس سے کلاک، کلاک، کلاک کی آواز نکلتی، اور جس میں وہ اپنے والدین کی ہڈیاں لیے پھرتی تھی۔ وہ گرم جوش خط جو حوزے آرکادیو بوئندیا کے نام تھا، کسی ایسے شخص کی طرف سے لکھا گیا تھا جو اب تک، زبان و مکاں کے فاصلوں کے باوجود، اس سے محبت کرتا تھا، اور جس نے ایک بنیادی انسانی ہمدردی کے تحت اس بے سہارا یتیم بچی کو اس کے پاس بھیجا تھا؛ وہ ارسلا کی رشتے کی بہن تھی، اور اس طرح اس کا حوزے آرکادیو بوئندیا سے بھی دور کا رشتہ نکلتا تھا، اس لیے کہ وہ اس کے کبھی نہ بھلانے جانے والے دوست نکانور اُلویا اور اس کی نیک بیوی ربیکا مونتیئل کی بیٹی تھی، خدا اُن دونوں روحوں کو اپنی امان میں رکھے، اور ان کی ہڈیاں ساتھ لے کر آئی تھی تا کہ عیسائی طریقے سے ان کو دفنایا جا سکے۔ خط میں دیے گئے نام اور دستخط صاف صاف پڑھے جاتے تھے، لیکن نہ حوزے آرکادیو بوئندیا کو اور نہ ارسلا کو اس نام کے کسی رشتے دار کا علم تھا، اور نہ ہی انھوں نے آج تک مانورے گاؤں کا نام سنا تھا۔ لڑکی سے کوئی مزید معلومات حاصل کرنا ناممکن تھا۔ جس وقت سے وہ آئی تھی، جھولنے والی کرسی میں بیٹھی انگوٹھا چوستی ہوئی، ہر ایک کو اپنی بڑی بڑی وحشت زدہ آنکھوں سے دیکھ رہی تھی، اور اس کے چہرے اور حرکات سے اس سے کیے جانے والے سوالات

کے سمجھنے کے کوئی آثار نہ پائے جاتے تھے۔ وہ آڑی دھاریوں والا، کالے رنگ میں رنگا ہوا لباس پہنے تھی جو پرانا نظر آتا تھا۔ اس نے پٹی دار چمڑے کے جوتے پہن رکھے تھے۔ اس کے بال کانوں کے پیچھے کالے ربن سے بندھے ہوئے تھے۔ وہ ایک دوشالہ اوڑھے ہوئے تھی جس پر بنی شبیہیں پسینے سے مٹ چلی تھیں، اور دائیں کلائی میں نظرِ بد کے حفاظتی تعویذ کے طور پر گوشت خور جانور کے دانتوں سے منڈھا ہوا ایک تانبے کا کڑا تھا۔ اس کی سبزی مائل جلد اور ڈھول کی طرح تنا ہوا گول پیٹ اس کی خرابیِ صحت اور بھوک کی نشان دہی کرتا تھا، جس کی عمر اس کی عمر سے زیادہ تھی، لیکن جب انھوں نے اسے کچھ کھانے کو دیا تو وہ پلیٹ کو ٹخنوں پر رکھے بیٹھے رہی اور کچھ نہ چکھا۔ ان لوگوں کو شبہ ہونے لگا کہ وہ گونگی بہری ہے، یہاں تک کہ مقامی لوگوں نے اپنی زبان میں اس سے پوچھا کہ آیا اسے پانی چاہیے، اور اس نے اپنی آنکھیں گھمائیں، جیسے انھیں پہچان رہی ہو، اور سر ہلا کر اثبات میں جواب دیا۔

انھوں نے بچی کو رکھ لیا، کیونکہ اس کے سوا وہ کچھ نہ کر سکتے تھے۔ انھوں نے اسے ربیکا پکارنے کا فیصلہ کیا جو خط کے مطابق اس کی ماں کا نام تھا، کیونکہ اورلیانو نے انتہائی تحمل کے ساتھ تمام ولیوں کے نام لیے اور کسی بھی نام پر اس نے ردعمل کا اظہار نہ کیا۔ چونکہ اس وقت تک ماکوندو میں قبرستان نہ تھا، انھوں نے ہڈیوں کی بوری کو تدفین کے مناسب مقام کی تلاش کے انتظار میں رکھا رہنے دیا، اور ایک طویل عرصے تک وہ بوری ہر جگہ نظر آتی اور مرغی کی کڑکڑاہٹ کی سی آواز کے ساتھ ایسی جگہ پائی جاتی جہاں اس کے ہونے کی کوئی توقع نہ کی جا سکتی تھی۔ ربیکا کو اس خاندان کی زندگی کا حصہ بننے میں طویل عرصہ لگا۔ وہ گھر کے کسی دور دراز کونے میں اپنی چھوٹی سی جھولنے والی کرسی پر بیٹھی انگوٹھا چوسا کرتی۔ اسے کوئی چیز متوجہ نہ کرتی سوائے گھڑیوں کی موسیقی کے، جس کے لیے وہ ہر آدھ گھنٹے بعد اپنی خوفزدہ آنکھیں اٹھا کر یوں دیکھتی گویا وہ اسے ہوا میں دکھائی دینے والی ہو۔ وہ اسے کئی دنوں تک کھانے پر مائل نہ کر سکے۔ کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ اب تک بھوک سے مر کیوں نہیں گئی، یہاں تک کہ مقامی انڈین لوگوں نے، جو کئی باتوں سے باخبر تھے اور جو گھر میں دبے پاؤں بغیر کسی آہٹ کے آیا جایا کرتے، دریافت کیا کہ ربیکا صرف آنگن کی گیلی مٹی اور دیواروں کا چونا کھانا پسند کرتی ہے، جو وہ اپنے ناخونوں سے کھرچ کر نکالا کرتی۔ یہ بات واضح تھی کہ اس کے والدین نے، یا جس کسی نے اس کی پرورش کی، اس کی اس عادت پر خاصی سرزنش کی تھی، کیونکہ وہ یہ کام چھپ کر اور ایک احساسِ جرم کے ساتھ کرتی،

اور اس کوشش میں رہتی کہ کچھ مٹی چونا چھپا رکھے اور جب کوئی نہ دیکھ رہا ہو، چپکے چپکے کھائے۔ تب سے انھوں نے اس کی کڑی نگرانی شروع کردی۔ انھوں نے آنگن میں گائے کا گوبر پھیلا دیا اور دیواروں پر تیز مرچیں مل دیں، اس امید پر کہ اس طرح وہ اس کی مہلک عادت کو شکست دے سکتے ہیں۔ لیکن اس نے مٹی حاصل کرنے میں اتنی ہوشیاری اور چترائی دکھائی کہ ارسلا کو مجبوراً سخت اقدامات کرنے پڑے۔ اس نے ایک برتن میں موسمبی کا عرق اور ریوند چینی ملا کر رات بھر کے لیے آنگن میں چھوڑ دیا تاکہ اس میں شبنم پڑ سکے، اور یہ دوا اس نے دوسرے دن ربیکا کو خالی پیٹ پلائی۔ گو کہ ارسلا کو کسی نے نہ بتایا تھا کہ یہ مٹی کھانے کی عادت کا علاج ہے، اس کا خیال تھا کہ کوئی بھی تلخ مائع خالی پیٹ میں جائے گا تو جگر میں ردعمل پیدا کرے گا۔ ربیکا اپنے نازک جسم کے باوجود اتنی مضبوط اور سرکش تھی کہ انھیں اس کو ایک بچھڑے کی طرح باندھ کر دوا پلانی پڑی، اور انھوں نے بہ مشکل خود کو اس کی لاتوں سے بچایا اور ان عجیب وغریب آوازوں کو برداشت کیا جو وہ دانتوں سے کاٹنے اور تھوکنے کے دوران نکالتی رہی۔ صدمے سے حیرت زدہ مقامی لوگوں کے مطابق، یہ غلیظ ترین گالیاں تھیں جو کوئی ان کی زبان میں سوچ سکتا تھا۔ جب ارسلا کو اس بات کا پتا چلا تو اس نے دوا پلانے کے ساتھ ساتھ اس کی خوب پٹائی بھی کی۔ یہ کبھی معلوم نہ ہو سکا کہ وہ ریوند چینی کا اثر تھا یا پٹائی کا، یا دونوں کا، لیکن سچ یہ ہے کہ چند ہی ہفتوں میں ربیکا کے سدھرنے کے آثار نظر آنے لگے۔ وہ آرکادیو اور امارانتا کے ساتھ کھیلا کرتی جو اس سے بڑی بہن کا سا برتاؤ کرتے، اور برتنوں کا صحیح استعمال کرتے ہوئے جی بھر کے کھانا کھاتی۔ جلد ہی یہ حقیقت کھل گئی کہ وہ ہسپانوی زبان بھی اتنی ہی روانی سے بولتی ہے جتنی کہ مقامی، اور جسمانی مشقوں کی اس میں حیرت انگیز استعداد ہے، اور گھڑیوں کے والز کو وہ خود سے بنائے ہوئے مزاحیہ بولوں کے ساتھ گا سکتی ہے۔ ان لوگوں کو اسے گھر کا فرد سمجھنے میں زیادہ عرصہ نہ لگا۔ وہ ارسلا سے اتنی محبت کرنے لگی تھی کہ اس کی حقیقی اولاد بھی نہ کرتی ہوگی۔ وہ آرکادیو اور امارانتا کو بھائی بہن، اور ریلیانو کو چاچا، اور حوزے آرکادیو بوئندیا کو نانا کہہ کر پکارتی اور اس طرح آخر کار دوسروں کی طرح، وہ ربیکا بوئندیا کے نام کی مستحق ہوئی، وہ نام جس کو اس نے اپنی موت تک وقار کے ساتھ برقرار رکھا۔

ان دنوں جب ربیکا کو مٹی کھانے کی عادت سے چھٹکارا دلا کر اسے دوسرے بچوں کے کمرے میں سلایا جانے لگا تھا، ایک رات مقامی انڈین عورت کی، جو بچوں کے ساتھ سوتی تھی، اتفاق سے آنکھ

کھل گئی، اور اسے کونے سے ایک عجیب وغریب آواز وقفے وقفے سے اٹھتی سنائی دی۔ وہ تشویش سے اٹھ بیٹھی، یہ سوچتے ہوے کہ شاید کمرے میں کوئی جانور گھس آیا ہے، اور تب اس نے ربیکا کو آرام کرسی میں بیٹھے ہوے پایا۔ وہ انگوٹھا چوس رہی تھی اور اندھیرے میں اس کی آنکھیں بلی کی آنکھوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ دہشت زدہ، اپنی تقدیر سے ہار کر، ویزیتاسیون نے ان آنکھوں میں اُس بیماری کی علامات پہچان لیں جس کے اندیشے نے اسے اور اس کے بھائی کو ہمیشہ کے لیے اس قدیم سلطنت سے، جس کے وہ شہزادہ شہزادی تھے، جلاوطن ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ بے خوابی کی وبا تھی۔

مقامی انڈین، کاتورے، صبح تک گھر چھوڑ کر جا چکا تھا۔ اس کی بہن وہیں رہی، کیونکہ اس کے تقدیر پرست دل نے اس کو بتا دیا تھا کہ وہ جان لیوا بیماری دنیا کے آخری کونے تک اس کا پیچھا نہ چھوڑے گی۔ کوئی ویزیتاسیون کے خوف کو نہ سمجھ پایا۔ ''اگر ہم کبھی نہ سوسکیں تو بہت اچھا ہو،'' حوزے آرکادیو بوئندیا نے ازراہِ مذاق کہا، ''اس طرح ہم زندگی سے زیادہ حاصل کر سکتے ہیں۔'' لیکن مقامی عورت نے سمجھایا کہ اس بیماری کا سب سے خوفناک پہلو یہ نہیں کہ نیند کا آنا ناممکن ہو جاتا ہے، کیونکہ جسم کو تھکن کا احساس ہی نہیں ہوتا، بلکہ اس کا رفتہ رفتہ، بے رحمی سے، ایک خطرناک مظہر کی جانب بڑھنا ہے، اور وہ ہے: یادداشت کی گم شدگی۔ اس کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ جب اس بیماری میں مبتلا آدمی اپنی بے خوابی کا عادی ہو جاتا تو بچپن کے واقعات کی یادیں اس کے ذہن سے مٹنے لگتیں، اور پھر اشیا کے نام اور تصورات محو ہو جاتے، اور بالآخر لوگوں کی شناخت، یہاں تک کہ خود اپنی ذات کی آگہی بھی جاتی رہتی، حتیٰ کہ وہ حماقت کی ایک ایسی کیفیت میں ڈوب جاتا جس کا کوئی ماضی نہ ہوتا۔ حوزے آرکادیو بوئندیا نے، جس کا ہنستے ہنستے دم نکلنے لگا، سوچا کہ یہ مقامی لوگوں کے توہمات کی ایجاد کردہ بیماریوں میں سے ایک ہے، لیکن ارسلا نے احتیاط کے طور پر ربیکا کو بچوں سے علیحدہ کر دیا۔

چند ہفتوں بعد جب ویزیتاسیون کی دہشت کم ہو چلی تھی، حوزے آرکادیو بوئندیا نے خود کو بستر پر کروٹیں بدلتے پایا؛ اس کو کسی طرح نیند نہیں آ رہی تھی۔ ارسلا نے، جو خود بھی جاگ اٹھی تھی، اس سے پوچھا کہ کیا بات ہے، اور اس نے جواب دیا، ''میں پھر پرودانسیوا گویلار کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔'' وہ ایک لمحے کے لیے بھی نہ سوئے، لیکن دوسرے دن خود کو اتنا ہشاش بشاش محسوس کر رہے تھے کہ انھیں یاد ہی نہ رہا کہ ان کی رات کتنی بُری طرح گزری ہے۔ اور یلیانو نے دوپہر کے کھانے کے

وقت اس بات پر حیرت کا اظہار کیا کہ وہ خود کو بہتر محسوس کر رہا ہے، اس کے باوجود کہ اس نے پوری رات تجربہ گاہ میں ایک بروچ پر سونے کا پانی چڑھانے میں گزاری تھی جو وہ ارسلا کی سالگرہ پر دینا چاہتا تھا۔ انھیں کوئی تشویش نہ ہوئی، حتیٰ کہ تیسرے دن جب کسی کو رات میں نیند نہ آئی تو انھیں اس بات کا احساس ہوا کہ وہ پچاس گھنٹوں سے زیادہ وقت سوئے بغیر گزار چکے ہیں۔

"بچے بھی جاگ رہے ہیں،" مقامی عورت نے تقدیر پرستانہ وثوق سے کہا۔ "ایک دفعہ یہ وبا گھر میں داخل ہو جائے تو اس سے کوئی نہیں بچ سکتا۔"

وہ واقعی بے خوابی کی وبا کا شکار ہو گئے تھے۔ ارسلا نے، جس نے اپنی ماں سے جڑی بوٹیوں کی طبی خاصیتوں کے بارے میں سیکھا تھا، گل تاج ملک کشید کر کے سب کو پلایا، لیکن انھیں پھر بھی نیند نہ آئی اور وہ تمام رات کھڑے خواب دیکھتے رہے۔ فریبِ نظر کی اس تابندگی میں انھیں نہ صرف اپنے خوابوں کی شبیہیں نظر آئیں، بلکہ ان میں سے کچھ کو وہ شبیہیں بھی دکھائی دیں جو دوسروں نے خواب میں دیکھی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے گھر مہمانوں سے بھر گیا ہو۔ باورچی خانے کے ایک کونے میں، اپنی جھولنے والی کرسی میں بیٹھے بیٹھے، ربیکا نے دیکھا کہ ایک آدمی جو بالکل اس کا ہم شکل نظر آتا ہے، سفید کپڑوں میں ملبوس ہے اور جس کی قمیص کا کالر سونے کے بٹن سے بند ہے، اس کے لیے گلابوں کا ایک دستہ لیے آ رہا ہے۔ اس کے ساتھ نازک ہاتھوں والی ایک عورت تھی جس نے گلدستے سے ایک گلاب نکال کر بچی کے بالوں میں لگایا۔ ارسلا سمجھ گئی کہ وہ مرد اور عورت ربیکا کے والدین ہیں، گو کہ ربیکا نے انھیں پہچاننے کی بڑی کوشش کی، وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ اس نے ان لوگوں کو پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ اس دوران، ایک لغزش کے تحت جس کے لیے حوزے آرکادیو بوئندیا نے خود کو کبھی معاف نہ کیا، گھر میں بننے والے شکر کے جانور قصبے بھر میں اسی طرح بکتے رہے۔ بچے اور بڑے مزے لے لے کر بے خوابی کے ننھے ننھے ہرے مرغ، بے خوابی کی لطیف گلابی مچھلیاں، اور بے خوابی کے نازک پیلے گھوڑے چوستے رہے، لہٰذا سوموار کی صبح پورے قصبے کو جاگتے پایا گیا۔ شروع شروع میں کسی کو تردد نہ ہوا۔ بلکہ وہ نیند نہ آنے پر خوش تھے، کیونکہ ان دنوں ماکوندو میں اتنا کچھ کرنے کو تھا کہ وقت بمشکل ہی بچتا۔ وہ اتنی محنت کرتے تھے کہ جلد ہی کرنے کو کچھ نہ رہ گیا، اور وہ صبح تین بجے ہاتھ پر ہاتھ دھرے گھڑیوں کا والز سنتے پائے جاتے۔ وہ لوگ جو سونا چاہتے تھے، تھکن کی وجہ سے نہیں بلکہ خوابوں کی آرزو میں، انھوں نے خود کو تھکانے کے تمام حربے

استعمال کر ڈالے۔ وہ اکٹھے بیٹھ کر گھنٹوں باتیں کیا کرتے، ایک ہی لطیفہ بار بار دُہراتے، خصی مرغ کی کہانی کو ابتری کی آخری حدوں تک گنجلک کرتے، جو ایک کبھی نہ ختم ہونے والا کھیل تھا، اور جس میں کہانی سنانے والا پوچھتا کہ آیا انھیں خصی مرغ کی کہانی سننی ہے، اگر وہ کہتے ''ہاں''، تو داستان گو کہتا کہ اس نے ان سے ہاں کہنے کے لیے نہیں کہا تھا بلکہ یہ پوچھا تھا کہ وہ خصی مرغ کی کہانی سننا چاہتے ہیں یا نہیں، اگر وہ کہتے ''نہیں''، تو داستان گو کہتا کہ اس نے ان سے نہیں کہنے کو نہیں کہا تھا بلکہ یہ سوال کیا تھا کہ آیا وہ چاہتے ہیں کہ انھیں خصی مرغ کی کہانی سنائی جائے، اور اگر وہ خاموش ہو جاتے تو داستان گو کہتا کہ اس نے ان سے خاموش رہنے کو نہیں کہا تھا بلکہ پوچھا تھا کہ کیا وہ چاہتے ہیں کہ انھیں خصی مرغ کی کہانی سنائی جائے، اور کوئی اٹھ کے نہ جا سکتا تھا کیونکہ داستان گو کہتا کہ اس نے ان سے جانے کو نہیں کہا تھا بلکہ یہ پوچھا تھا کہ آیا وہ خصی مرغ کی کہانی سننا چاہتے ہیں، وغیرہ وغیرہ؛ اس طرح وہ ایک لاحاصل دائرے میں تمام رات گھومتے رہتے۔

جب حوزے آرکادیو بوئندیا کو احساس ہوا کہ قصبے پر وبا کا حملہ ہو چکا ہے تو اس نے خاندانوں کے سربراہوں کو اکٹھا کیا، اور جو کچھ وہ بے خوابی کے مرض کے بارے میں جانتا تھا انھیں بتایا، اور انھوں نے وبا کو دلدلی علاقے کے دوسرے قصبوں میں پھیلنے سے روکنے کے لیے اقدامات طے کیے۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے بکریوں کے گلے سے گھنٹیاں اتار لیں جو عربوں نے انھیں طوطوں کے مول دی تھیں، اور ان گھنٹیوں کو قصبے میں داخل ہونے والی راہگزر پر ان لوگوں کے لیے رکھ دیا جو سنتریوں کی منت سماجت سے باز نہ آتے، اور قصبے میں داخل ہونے کے لیے بضد رہتے۔ تمام اجنبیوں کو، جو اُن دنوں ماکوندو کی گلیوں سے گزرتے، یہ گھنٹیاں بجانی پڑتیں، تاکہ بیماروں کو علم ہو سکے کہ وہ صحت مند لوگ ہیں۔ اپنے قیام کے دوران انھیں کھانے پینے کی اجازت نہ تھی، کیونکہ اس میں کوئی شبہ نہ تھا کہ بیماری کے جراثیم منھ کے ذریعے پھیلتے ہیں، اور تمام کھانے پینے کی اشیا بے خوابی کے اثرات کی زد میں آ چکی ہیں۔ اس طرح انھوں نے وبا کو قصبے تک محدود رکھا۔ یہ قرنطینہ اتنا موثر ثابت ہوا کہ ان ناگہانی حالات کو ایک فطری چیز سمجھ کر قبول کر لیا گیا، اور زندگی کو اس طرح منظّم کیا گیا کہ کام کاج کی رفتار معمول پر آ گئی، اور لوگوں نے نیند کی بے کار عادت کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا۔

یہ اوریلیانو تھا جس نے وہ نسخہ دریافت کیا جو ان کی یادداشت کو گم ہونے سے کئی مہینے تک محفوظ

رکھنے والا تھا۔ اس کو یہ نسخہ اتفاق سے معلوم ہوا۔ ایک ماہر بے خواب ہونے کی وجہ سے، کیونکہ وہ ان لوگوں میں سے تھا جنھیں سب سے پہلے یہ بیماری لاحق ہوئی تھی، اس نے چاندی کے کام میں تکمیل کی حد تک مہارت حاصل کر لی تھی۔ ایک دن وہ چھوٹا سندان تلاش کر رہا تھا جسے وہ دھات پر ملمع چڑھانے کے لیے استعمال کیا کرتا تھا، اور اسے اس اوزار کا نام یاد نہ آسکا۔ اس کے باپ نے اسے بتایا: ''دستہ''۔ اوریلیانو نے کاغذ کے چھوٹے سے پرزے پر یہ نام لکھا، اور اسے سندان کے پیندے سے چپکا دیا: ''دستہ۔'' اسے یقین تھا کہ اس طرح وہ آئندہ یہ لفظ نہ بھولے گا۔ اس کو اس بات کا خیال نہ آیا، کیونکہ اس شے کا نام کافی مشکل تھا، کہ یہ یادداشت گم ہونے کی پہلی علامت ہے۔ لیکن کچھ دنوں بعد اسے احساس ہوا کہ تجربہ گاہ میں رکھی ہوئی تقریباً تمام چیزوں کے نام یاد رکھنے میں اسے دشواری ہو رہی ہے۔ تب اس نے تمام اشیا پر ان کے نام لکھ کر لگا دیے، تاکہ وہ لکھے ہوے نام پڑھ کر انھیں شناخت کر سکے۔ جب اس کے باپ نے اپنے بچپن کے قابلِ ذکر ترین واقعات بھی ذہن سے جاتے رہنے پر تشویش کا اظہار کیا تو اوریلیانو نے اسے اپنا طریقہ بتایا، اور حوزے آرکادیو بوئندیا نے پہلے اسے گھر بھر میں رائج کیا اور پھر تمام گاؤں میں نافذ کر دیا۔ برش کو سیاہی میں ڈبو کر اس نے تمام اشیا پر ان کے نام لکھ دیے: میز، کرسی، گھڑی، دروازہ، دیوار، بستر، برتن۔ وہ جانوروں کے باڑے میں گیا، اور جانوروں اور پودوں پر نام لکھے: گائے، بکری، سؤر، مرغی، کساوا، کلادیئم، کیلا۔ رفتہ رفتہ مٹتی ہوئی یادداشت کے لامتناہی امکانات پر غور کرتے ہوے اسے احساس ہوا کہ وہ دن آسکتا ہے جب لوگ چیزوں کو ان پر لکھے ناموں کی مدد سے پہچان لیں، لیکن ان کا استعمال انھیں یاد نہ رہے۔ تب وہ زیادہ وضاحت سے کام لینے لگا۔ وہ تختی جو اس نے گائے کی گردن میں لٹکائی، اس تدبیر کی عمدہ مثال تھی جس سے ماکوندو کے باشندوں نے حافظے کے زوال کے خلاف جنگ کے لیے خود کو لیس کیا: ''یہ گائے ہے۔ اس کو ہر صبح دوہنا ہے تاکہ یہ دودھ پیدا کرتی رہے، اور دودھ کو اُبالنا ہے تاکہ کافی میں ملا کر دودھ کافی بنائی جا سکے۔'' اس طرح وہ ایسی حقیقت میں رہا کیے جو ان کے ہاتھوں سے پھسلتی جا رہی تھی، وقتی طور پر الفاظ کے ذریعے گرفت میں لائی ہوئی حقیقت، لیکن جسے لکھے الفاظ کی قدر فراموش ہونے پر ہمیشہ کے لیے معدوم ہو جانا تھا۔

اس راہگزر کے آغاز پر، جو دلدلی علاقے کو نکلتی تھی، انھوں نے ''ماکوندو'' کی تختی لگا دی، اور ایک بڑی سی تختی شاہراہِ عام پر نصب کر دی، جس پر لکھا تھا: ''خدا ہے''۔ تمام گھروں میں اشیا اور

احساسات کو یاد رکھنے کے لیے شرحیں تیار کر لی گئی تھیں۔ لیکن وہ نظام اتنی ہوشیاری اور اخلاقی قوت کا متقاضی تھا کہ بہت سے لوگ خیالی حقیقت کے طلسم سے زیر ہو گئے، اپنی گھڑی ہوئی حقیقت جوان کے لیے عملی کم، لیکن آرام دہ زیادہ تھی۔ پیلار ترنیرا وہ ہستی تھی جس کا اس پنہاں سازی کو مقبول کرنے میں سب سے بڑا ہاتھ تھا۔ اس کو تاش کے پتوں سے ماضی پڑھنے کی ترکیب سوجھی، جس طرح وہ پہلے مستقبل دیکھا کرتی تھی۔ اس ترکیب کی بدولت بے خوابی کے شکار لوگ ایک ایسی دنیا میں رہنے لگے جس کی بنیاد تاش کے پتوں کے غیر یقینی متبادل پر تھی، جہاں ایک باپ کو مبہم طور پر ایک ایسے سانولے آدمی کی صورت یاد کیا جاتا جو اپریل کے اوائل میں آیا تھا، اور ماں کو صرف ایک ایسی سانولی عورت کے روپ میں جس نے اپنے بائیں ہاتھ میں سونے کی انگوٹھی پہن رکھی تھی، اور جہاں جنم دن اس پچھلے منگل تک محدود ہو گیا جب برگِ غار کے درخت پر چکاوک چہچہایا تھا۔ دل بہلانے کے ان طریقوں سے شکست کھا کر حوزے آرکادیو بوئندیا نے یادداشت کی مشین بنانے کی ٹھانی، جس کی اس نے کبھی تمنا کی تھی تاکہ خانہ بدوشوں کی شاندار ایجادات کو یاد رکھ سکے۔ یہ کل، انسان کی تمام زندگی میں حاصل کیے گئے علم پر، ہر صبح، شروع سے آخر تک نظر ڈالنے کے امکان پر مبنی تھی۔ حوزے آرکادیو بوئندیا نے اس کا تصور ایک چرخی نما لغت کے طور پر کیا تھا، جس کو محور پر رکھ کر دستے کے ذریعے چلایا جا سکے، اور اس طرح، زندگی کے سب سے ضروری تصورات، ہر چند گھنٹوں بعد، اس کی آنکھوں کے سامنے آسکیں۔ وہ تقریباً چودہ ہزار اندراجات کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا، جب دلدلی علاقے والی راہگزر سے ایک عجیب و غریب حلیے کا آدمی بے خوابی سے محفوظ لوگوں کی غمناک گھنٹی کے ساتھ نمودار ہوا، جس نے رسّی سے بندھا ایک پھولا ہوا سوٹ کیس اٹھا رکھا تھا، اور کالے کپڑے سے ڈھکے ایک ٹھیلے کو کھینچتا ہوا لا رہا تھا۔ وہ سیدھا حوزے آرکادیو بوئندیا کے گھر پہنچا۔

ویزیتاسیون نے اسے نہ پہچانا جب اس نے دروازہ کھولا، اور اس نے سوچا شاید وہ کچھ بیچنے کے ارادے سے آیا ہے، اس بات سے بے خبر کہ اس قصبے میں، جو فراموشی کی دلدل میں ہمیشہ کے لیے دھنستا جا رہا ہے، کوئی چیز نہیں بیچی جا سکتی۔ وہ ایک پیرِ فرتوت تھا۔ اس کی آواز بے اعتباری سے شکستہ تھی، اور اس کے ہاتھ لگتا تھا جیسے اشیا کے وجود پر شبہ کرنے لگے ہوں، مگر یہ بات واضح تھی کہ وہ ایک ایسی دنیا سے آرہا ہے جہاں لوگ اب تک سو سکتے ہیں، اور یاد رکھ سکتے ہیں۔ حوزے آرکادیو بوئندیا نے اسے

بیٹھک میں پایا، جہاں وہ بیٹھا اپنے پیوند لگے کالے ہیٹ سے ہوا جھل رہا تھا، اور ایک دردمند توجہ کے ساتھ دیوار پر چسپاں ناموں اور علامتوں کو پڑھ رہا تھا۔ حوزے آرکادیو بوئندیا نے گرم جوشی کے کھلے مظاہرے کے ساتھ اس کا استقبال کیا، اس بات پر فکرمند کہ وہ کسی زمانے میں اسے جانتا تھا اور اب پہچان نہیں پا رہا۔ لیکن ملاقاتی کو اس بناوٹی شیفتگی کا احساس ہو چکا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ اسے بھلایا جا چکا ہے، دل کے ناقابلِ علاج نسیان سے نہیں بلکہ ایک مختلف فراموشی سے، جو زیادہ ظالمانہ اور کبھی نہ ختم ہونے والی تھی، اور جس سے وہ اچھی طرح واقف تھا کیونکہ وہ موت کی فراموشی تھی، تب وہ جان گیا۔ اس نے سوٹ کیس کھولا، جو سمجھ میں نہ آنے والی اشیا سے بھرا ہوا تھا، اور اس میں سے ایک چھوٹی سی پیٹی نکالی جس میں بہت ساری بوتلیں تھیں۔ اس نے حوزے آرکادیو بوئندیا کو ایک ہلکی رنگت والا مائع پینے کو دیا، اور اس کی یادداشت کے قمقمے جل اٹھے۔ اس سے پہلے کہ وہ خود کو ایک احمقانہ بیٹھک میں پاتا جہاں اشیا پر نشان لگے ہوئے تھے، اس سے پہلے کہ وہ دیواروں پر لکھی سنجیدہ بکواس پر شرمندہ ہوتا، اور اس سے پہلے کہ وہ آنے والے کو ایک تابناک مسرت کے ساتھ پہچانتا، اس کی آنکھیں بھیگ چکی تھیں۔ آنے والا ملکیادیس تھا۔

جب تمام ماکوندو یادداشت کے واپس آنے کا جشن منا رہا تھا، حوزے آرکادیو بوئندیا اور ملکیادیس نے اپنی پرانی دوستی پر پڑی گرد جھاڑی۔ خانہ بدوش قصبے میں ٹھہرنے پر مائل تھا۔ وہ حقیقتاً موت کے منھ میں جا چکا تھا، لیکن اس لیے واپس آ گیا کہ اس سے تنہائی برداشت نہ ہوئی۔ قبیلے سے باہر نکال دیے جانے کے بعد، اپنی تمام مافوق الفطرت صلاحیتوں کو زندگی سے وفاداری کے سبب کھو دینے کے بعد، اس نے دنیا کے اس کونے میں پناہ لینے کا فیصلہ کیا جسے موت اب تک نہ ڈھونڈ پائی تھی، اور خود کو ڈگیروٹائپ سے تصویر اتارنے کی ایک تجربہ گاہ کے کام پر مامور کر دیا۔ حوزے آرکادیو بوئندیا نے اِس ایجاد کے بارے میں اب تک نہ سنا تھا، لیکن جب اس نے خود کو اور پورے خاندان کو قزح رنگی دھات کے پتّرے پر ابد تک کے لیے نقش کیا ہوا پایا، وہ بدحواسی سے گنگ رہ گیا۔ وہ تاریخ تھی اُس زنگ آلود ڈگیروٹائپ تصویر کی، جس میں حوزے آرکادیو بوئندیا اپنے سرمئی کھڑے بالوں کے ساتھ نظر آتا تھا، اس کے کلف دار کالر کانسی کے بٹن سے قمیص سے جڑے ہوئے تھے اور چہرے پر ایک حیران کن سنجیدگی تھی، جس پر ارسلا نے ہنسی سے دوہرا ہوتے ہوئے اسے ''خوفزدہ جرنیل'' کا نام دیا تھا۔ دسمبر کی اُس نکھری ہوئی

صبح، جب تصویر اتاری گئی، حوزے آرکا دیو بوئندیا واقعی خوفزدہ تھا، کیونکہ وہ یہ سوچ رہا تھا کہ لوگ رفتہ رفتہ بوڑھے ہوتے جائیں گے جبکہ اس کی شبیہ دھات کے اس پترے پر ہمیشہ کے لیے محفوظ رہ جائے گی۔ رواج کی ایک انوکھی کایا کلپ میں، یہ ارسلا تھی جس نے حوزے آرکا دیو بوئندیا کے ذہن سے یہ خیال نکالا، اور وہی تھی جس نے پرانی تلخی کو بھلا کر یہ فیصلہ کیا کہ ملکیادیس اس گھر میں ٹھہرے، گوکہ اس نے کبھی اپنی تصویر اتارنے کی اجازت نہ دی، کیونکہ (بقول خود اس کے) وہ اپنے پڑپوتوں کی ہنسی کا سامان بننا نہ چاہتی تھی۔ اس صبح اس نے بچوں کو بہترین لباس پہنائے، چہروں پر پوڈر لگایا، اور ہر بچے کو ایک ایک چمچہ شربتِ مغز پلایا تاکہ وہ تصویر اتروانے کے لیے ملکیادیس کے انوکھے کیمرے کے سامنے دو منٹ بالکل ساکت رہیں۔ اس خاندانی ڈیگروٹائپ میں، جو اپنی نوعیت کی واحد تصویر تھی، اوریلیانو سیاہ مخمل میں ملبوس، امارانتا اور ربیکا کے درمیان نظر آتا تھا۔ اس کے چہرے پر وہی افسردگی اور روشن بینی کی کیفیت تھی جس کے ساتھ وہ بہت برسوں بعد فائرنگ اسکواڈ کا سامنا کرنے والا تھا، لیکن اُس وقت تک اسے اپنی تقدیر کے بارے میں پیش آگہی نہیں ہوئی تھی۔ وہ ایک ماہر نُقرہ کار تھا، جس کے کام کی نزاکت کی تعریف تمام دلدلی خطے میں ہوتی تھی۔ اُس کارگاہ میں، جس میں ملکیادیس کی جنونی تجربہ گاہ بھی واقع تھی، اس کے سانس لینے کی آواز بھی بمشکل سنائی دیتی۔ یوں لگتا جیسے اوریلیانو نے کسی دوسرے زمانے میں پناہ لے رکھی ہو، جبکہ اس کا باپ اور ملکیادیس، بوتلوں اور طشتوں کے شور، تیزاب چھلکنے اور پارے کے ہر لمحے نلکی کے ہر خم اور ہر بل پر گم ہونے کے حادثات کے درمیان، چلا چلا کر ناسترادیمس کی پیش گوئیوں کی تشریح کیا کرتے۔ اس سپردگی اور فیصلے کی عمدگی نے جس سے وہ اپنی توجہ کام پر مرکوز رکھتا، اوریلیانو کو اس قابل کر دیا کہ کم وقت میں وہ اس سے کہیں زیادہ پیسہ کما لے جتنا کہ ارسلا اپنے لذیذ شکر کے جانور بنا کر کمایا کرتی تھی، لیکن ہر ایک کو یہ بات عجیب لگتی تھی کہ بالغ ہونے کے باوجود اس نے آج تک کسی عورت کو نہ جانا تھا۔ یہ سچ تھا کہ وہ کبھی کسی عورت کے پاس نہ گیا تھا۔

چند ماہ بعد مرد بچے فرانسسکو کی واپسی دیکھی گئی، ایک آوارہ گرد جو تقریباً دو سو سال کا بوڑھا تھا، اور جو اکثر اپنے بنائے ہوئے نغمے گاتا ہوا ماکوندو سے گزرتا۔ ان نغموں میں مرد بچہ فرانسسکو بڑی تفصیل کے ساتھ ان تمام گاؤوں میں ہونے والے واقعات سناتا جو مانورے سے لے کر دلدل کے آخری سرے تک واقع تھے، تاکہ اگر کسی کو کہیں کوئی پیغام بھیجنا ہو، یا کسی واقعے کی تشہیر کرنی ہو، تو وہ اس کو دو سکے

دے کراس کے نغموں کی پٹاری میں شامل کروا دے۔ اسی طریقے سے ارسلا کو اپنی ماں کی موت کا علم ہوا، کیونکہ وہ یہ نغمے اس امید میں سنا کرتی تھی کہ شاید ان میں اس کے بیٹے حوزے آرکادیو کی کوئی خبر ملے۔ مرد بچہ فرانسسکو، جسے یہ نام اس لیے دیا گیا تھا کہ ایک دفعہ اس نے شیطان کو بدیہہ گوئی کے مقابلے میں شکست دی تھی، اور جس کا اصل نام کسی کو معلوم نہ تھا، بے خوابی کی وبا کے دنوں میں ماکوندو سے غائب ہو گیا تھا، اور ایک رات اچانک کاتارینو کی دکان میں پھر نمودار ہوا۔ پورے گاؤں کے لوگ اس کے نغمے سننے گئے، یہ جاننے کے لیے کہ دنیا میں کیا واقعات پیش آئے ہیں۔ اس دفعہ اس کے ساتھ ایک عورت بھی آئی تھی، جو اتنی فربہ تھی کہ چار مقامی انڈین اس کو ایک جھولنے والی کرسی میں اٹھا کر چلتے تھے، اور اس کے ساتھ کھوئی کھوئی آنکھوں والی ایک نوخیز ملاتو لڑکی تھی، جو ایک چھتری اٹھائے عورت کو دھوپ سے بچائے رکھتی تھی۔ اور یلیانو اس رات کاتارینو کی دکان پر گیا۔ اس نے مرد بچے فرانسسکو کو تماشائیوں کے دائرے کے بیچ ایک لحیم شحیم گرگٹ کی مانند بیٹھا پایا۔ وہ اپنی بوسیدہ، بے سُری آواز میں خبروں بھرے نغمے گا رہا تھا؛ اس کے پاس وہی قدیم اکارڈین تھا جو سر والٹر ریلے نے اسے گیانا میں دیا تھا، اور وہ اپنے انتھک چلنے والے پیروں سے، جو شورے سے چیچ گئے تھے، تال دے رہا تھا۔ دکان کے عقب میں ایک دروازہ تھا جس میں سے لوگ آ جا رہے تھے، اور جس کے سامنے جھولنے والی کرسی میں رئیسہ خاموشی سے بیٹھی خود کو پنکھا جھل رہی تھی۔ کاتارینو، کان کے پیچھے ایک مصنوعی گلاب اٹکائے، مجمع میں گنّے کی شراب مگ میں بیچ رہا تھا، اور موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ مردوں کے قریب جاتا اور ان پر وہاں ہاتھ رکھتا جہاں نہیں رکھنا چاہیے۔ آدھی رات تک گرمی ناقابلِ برداشت ہو گئی۔ اور یلیانو نے بغیر دھیان دیے آخر تک خبریں سنیں، اور اسے کوئی ایسی خبر نہ ملی جو اس کے خاندان کے لیے دلچسپی کا باعث ہو۔ وہ گھر جانے کے لیے اٹھ ہی رہا تھا کہ فربہ رئیسہ نے اسے ہاتھ سے اشارہ کیا۔

''تم بھی اندر جاؤ،'' اس نے اور یلیانو سے کہا۔ ''صرف بیس پیسو لگیں گے۔''

اور یلیانو نے رئیسہ کی گود میں دھری ٹوکری میں ایک سکہ پھینکا، اور بغیر سوچے سمجھے کمرے میں چلا گیا۔ نوبالغ ملاتو لڑکی، جس کے چھوٹے چھوٹے سر پستان کتیا کے سے تھے، بستر پر عریاں لیٹی تھی۔ اور یلیانو سے پہلے تریسٹھ آدمی اس رات اس کمرے سے گزرے تھے۔ کمرے کی کثیف فضا، پسینے اور آہوں میں گندھی ہوئی، کیچڑ میں بدلنے لگی تھی۔ لڑکی نے تر چادر اٹھائی، اور اور یلیانو سے اسے ایک

طرف سے پکڑنے کو کہا۔ چادر کینوس کے ٹکڑے کی طرح بھاری ہو رہی تھی۔ انھوں نے اس کے سرے مروڑ کر اسے نچوڑا، یہاں تک کہ وہ اپنی اصل حالت پر واپس آ گئی۔ انھوں نے دری کو اُلٹایا اور دوسری طرف سے پسینے کی بوندیں ٹپکنے لگیں۔ اوریلیانو فکر مند تھا، اس کی خواہش تھی کہ یہ کام کبھی ختم نہ ہو۔ وہ نظریاتی طور پر محبت کے عمل سے واقف تھا، لیکن اس کے گھٹنے جواب دے رہے تھے، اور گو کہ اس کی جلتی ہوئی کھال کا ایک ایک رُواں کھڑا ہو چکا تھا، وہ اپنی آنتوں کے بوجھ کو خارج کرنے کی فوری طلب کی مزاحمت نہ کر پا رہا تھا۔ جب لڑکی بستر درست کر چکی اور اس نے اوریلیانو سے کپڑے اتارنے کو کہا، اس نے ایک بوکھلائی ہوئی توجیہہ پیش کی: ''انھوں نے مجھے اندر بھیجا تھا۔ انھوں نے مجھ سے بیس پیسو پھینکنے کو اور جلدی کرنے کو کہا تھا۔'' لڑکی اس کی سراسیمگی کو سمجھ گئی۔ ''اگر تم جاتے وقت بیس پیسو اور ڈالتے جاؤ تو تم کچھ دیر اور یہاں ٹھہر سکتے ہو،'' اس نے نرمی سے کہا۔ اوریلیانو نے کپڑے اتار دیے؛ شرم کی اذیت میں گرفتار، وہ اس خیال سے چھٹکارا حاصل کرنے میں ناکام رہا کہ اس کی برہنگی اس کے بھائی کے مقابلے کی نہیں ہو سکتی۔ لڑکی کی کوششوں کے باوجود اس نے خود کو بے حد تنہا اور لاتعلق محسوس کیا۔ ''میں بیس پیسو اور ڈال دوں گا،'' اس نے سُونی آواز میں کہا۔ لڑکی نے خاموشی سے اس کا شکریہ ادا کیا۔ اس کی پیٹھ ناپختہ تھی۔ اس کی کھال ہڈیوں سے منڈھی ہوئی تھی، اور وہ کوشش کر کے سانس کھینچتی تھی، کیونکہ وہ ناقابلِ بیان حد تک نڈھال تھی۔ دو سال پہلے، وہاں سے بہت دور، وہ شمع بجھائے بغیر سو گئی تھی، اور جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو شعلوں میں گھرا پایا تھا۔ وہ گھر، جہاں وہ اپنی دادی کے ساتھ رہتی تھی، جس نے اسے پالا تھا، جل کر راکھ ہو چکا تھا۔ اس کے بعد سے اس کی دادی اسے قصبے قصبے لیے پھر رہی تھی، بیس بیس پیسو کے عوض اسے بستر پر لٹاتی، تاکہ جلے ہوئے گھر کی مالیت کے نقصان کی تلافی ہو سکے۔ لڑکی کے حساب کے مطابق اس کو دس سال مزید، ہر رات ستّر مردوں کے ساتھ لیٹنا تھا، کیونکہ اسے اپنے اور دادی کے سفر اور کھانے کا خرچ بھی اٹھانا تھا اور ان چار مقامیوں کی تنخواہ بھی دینی تھی جو کرسی اٹھا کر چلنے کے کام پر مامور تھے۔ جب ریئسہ نے دوسری دفعہ دروازہ کھٹکھٹایا تو اوریلیانو، بغیر کچھ کیے، رونے کی شدید خواہش سے پریشان، کمرے سے نکل آیا۔ اس رات وہ سو نہ سکا، آرزو اور رحم کے ملے جلے جذبات کے ساتھ لڑکی کے متعلق سوچتا رہا۔ اسے لڑکی سے محبت کرنے، اور اس کی حفاظت کرنے کی ایک ناقابلِ رد ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ صبح کے وقت، بے خوابی اور بخار کی تھکن میں چور،

اس نے خاموشی سے فیصلہ کیا کہ وہ اس لڑکی سے شادی کر لے گا، تاکہ اس کو دادی کے چنگل سے آزاد کرا سکے، اور اُن تمام راتوں کی لذتوں سے محظوظ ہو سکے جو وہ ستر مردوں کو بخشتی تھی۔ لیکن جب دس بجے صبح وہ کاتارینو کی دکان پر پہنچا تو لڑکی قصبہ چھوڑ کر جا چکی تھی۔

وقت نے رفتہ رفتہ اس دیوانگی کے خیال کو مندمل کر دیا، لیکن اس کا احساسِ محرومی بڑھتا گیا۔ اس نے کام میں پناہ لی۔ اس نے زندگی بھر بغیر عورت کے زندگی گزارنے کی قسمت پر رضا اختیار کر لی، تاکہ اپنے بے کار وجود کی شرم چھپا سکے۔ اس دوران ملکیادیس دھات کے پتروں پر ماکوندو کی ان تمام چیزوں کے عکس اتار چکا تھا جو عکس اتارنے کے قابل تھیں، اور اس نے ڈگیروٹائپ کی تجربہ گاہ حوزے آرکادیو بوئندیا کے تخیلات کے لیے چھوڑ دی تھی، جس نے اسے خدا کے وجود کو ثابت کرنے کے استعمال میں لانے کی ٹھان لی تھی۔ گھر کے مختلف حصوں میں اتاری گئی تصویروں کو ایک دوسرے پر اتارنے کے پیچیدہ عمل سے، اسے یقین تھا کہ جلد یا بدیر وہ خدا کی تصویر کھینچنے میں کامیاب ہو جائے گا، اگر اس کا وجود ہے، یا پھر ہمیشہ کے لیے خدا کے وجود کے مفروضے کا خاتمہ کر دے گا۔ ملکیادیس ناستراڈیمس کی پیش گوئیوں کی شرحوں کی گہرائی میں اترتا چلا گیا۔ وہ رات دیر تک جاگتا، اپنی بوسیدہ، مخملی واسکٹ میں ملبوس، اپنے چھوٹے چھوٹے چڑیا جیسے ہاتھوں سے لکھتا رہتا، جن کی انگوٹھیوں سے پرانے دنوں کی چمک گم ہو چکی تھی۔ ایک رات اس نے سوچا کہ اس نے ماکوندو کے مستقبل کی پیش گوئی پالی ہے۔ یہ ایک روشن شہر ہوگا، شیشے کے بڑے بڑے گھروں پر مشتمل، جہاں بوئندیا نسل کا نام و نشان تک باقی نہ ہوگا۔ ''یہ غلط ہے،'' حوزے آرکادیو بوئندیا گرجا۔ ''وہ شیشے کے نہیں بلکہ برف کے گھر ہوں گے، جیسا کہ میں نے خواب میں دیکھا تھا، اور یہاں ایک بوئندیا ہمیشہ رہے گا'' ارسلا بے اعتدال گھر میں ہوش و حواس اور شعور کی فضا قائم رکھنے کی کوشش کرتی رہی، شکر کی ٹافیوں کے کاروبار کو ایک تنور کے ذریعے وسیع کر کے، جو تمام رات گرم رہتا، اور جس میں سے ٹوکریاں بھر ڈبل روٹیاں اور انوکھی انواع و اقسام کی پڈنگ اور بسکٹ نکلتے رہتے، جو چند گھنٹوں کے اندر اندر دلدلی خطے میں پیچ و خم کھاتی گلیوں میں بک جاتے۔ اب وہ عمر کے اس حصے میں پہنچ گئی تھی جب اسے آرام کرنے کا حق پہنچتا تھا، لیکن وہ مزید فعال ہو گئی تھی۔ وہ اپنے پھلتے پھولتے کاروبار میں اتنی مصروف ہو چکی تھی کہ ایک دوپہر جب اس نے بے خیالی میں آنگن کی طرف نگاہ اٹھائی، جب مقامی انڈین عورت گندھے ہوئے آٹے میں شکر ملا رہی

تھی، تو اس نے دوانجانی، خوبصورت، نوعمر لڑکیوں کو ڈوبتے سورج کی روشنی میں کشیدہ کاری کرتے پایا۔ وہ ربیکا اور امارانتا تھیں۔ جب سے انھوں نے ماتمی لباس اتارے تھے، جو وہ نانی کی موت کے بعد تین سال تک تن دہی سے پہنتی رہی تھیں، ان کے شوخ رنگا رنگ کپڑوں نے لگتا تھا انھیں دنیا میں ایک خاص مقام دے دیا ہے۔ ربیکا، توقعات کے برخلاف، زیادہ خوبصورت نکلی تھی۔ اس کی رنگت گوری تھی، آنکھیں بڑی اور پُرسکون، اور جادوئی ہاتھ جو کشیدہ کاری کے نمونے لگتا تھا نظر نہ آنے والے دھاگوں سے کاڑھ رہے ہیں۔ امارانتا، جو اس سے چھوٹی تھی، نسبتاً کم پُروقار تھی، لیکن اسے اپنی مرحوم نانی کا فطری امتیاز اور اندرونی استحکام حاصل تھا۔ آرکادیو، جو اگرچہ ابھی سے اپنے باپ کی سی جسمانی نشوونما کا مظہر تھا، ان کے سامنے بچہ سا نظر آتا تھا۔ وہ اوریلیانو سے چاندی کا کام سیکھنے میں جُٹ گیا تھا، جس نے اسے پڑھنا لکھنا بھی سکھایا تھا۔

ارسلا نے اچانک محسوس کیا کہ گھر لوگوں سے بھر گیا ہے، اور اس کے بچے شادی کرنے اور اپنے بچے پیدا کرنے کے قابل ہو گئے ہیں، اور ان کو جگہ کی کمی کے باعث تتر بتر ہونا پڑے گا۔ پھر اس نے وہ پیسے نکالے جو اس نے طویل برسوں میں کڑی محنت سے جمع کیے تھے، اور اپنے کچھ گاہکوں کے ساتھ انتظامات کر کے گھر کو بڑا کرنے کے کام کا بیڑا اٹھایا۔ اس نے ملاقاتیوں کے بیٹھنے کے لیے ایک بڑا دیوان خانہ بنوایا، اور روزمرہ کے استعمال کے لیے ایک اور بیٹھک، جو زیادہ آرام دہ اور ٹھنڈی تھی، ایک کھانے کا کمرہ، جس میں بارہ کرسیوں والی میز لگوائی تاکہ گھر کے تمام افراد اپنے مہمانوں سمیت اکٹھے بیٹھ سکیں؛ نو کمرے، جن کی کھڑکیاں آنگن میں کھلتی تھیں؛ اور ایک لمبی سی ڈیوڑھی جسے گلاب کے ایک باغ کے ذریعے دوپہر کی گرمی سے محفوظ کیا گیا تھا۔ باغ میں فَرن اور بیگونیا کے گملے رکھنے کے لیے احاطہ لگایا گیا۔ ارسلا نے باورچی خانہ بڑا کروایا تاکہ اس میں وہ دو تنور آ سکیں۔ وہ گودام جہاں پیلار ترنیرا نے حوزے آرکادیو کا مستقبل پڑھا تھا، توڑا گیا اور اس سے دگنا بڑا گودام تعمیر کرایا گیا، تاکہ گھر میں کھانے پینے کی اشیا کی کبھی قلت نہ ہو۔ اس نے آنگن میں شاہ بلوط کے درخت کی چھاؤں میں غسل خانے بنوائے، ایک عورتوں کے لیے، دوسرا مردوں کے لیے؛ اور گھر کے عقب میں ایک بڑا سا اصطبل، باڑھ لگا ہوا مرغی خانہ، بھینسوں کا باڑا، اور ایک چڑیا خانہ، جو چاروں سمت کی ہوا کے لیے کھلا تھا، تاکہ گزرتے ہوئے پرندے وہاں اپنی خوشی سے انڈے بچے دے سکیں۔ درجنوں مستریوں اور بڑھئیوں کو

ساتھ لیے لیے، گویا اسے اپنے شوہر کا سا ہذیانی بخار چڑھ گیا ہو، ارسلا روشنی اور دھوپ کے مقام طے کرتی، اور حدود کی پروا کیے بغیر جگہ کی تقسیم کرتی پھرتی۔ پرانی عمارت، جو بانیوں نے بنائی تھی، اوزاروں اور سامانِ تعمیر، اور پسینے میں شرابور، تھکے ہوئے مزدوروں سے بھر گئی، جو ہر ایک سے درخواست کرتے کہ براہِ مہربانی ان کے کام میں مداخلت نہ کریں، اور ہڈیوں کی اس بوری سے پریشان رہتے جو ایک غمگین کھڑکھڑاہٹ کے ساتھ ان کا پیچھا کرتی۔ اس بے آرامی میں، چونے اور کولتار کے دھویں میں سانس لیتے ہوئے، کوئی درست طور پر نہ دیکھ سکتا تھا کہ زمین کے پیٹ سے یہ گھر کیونکر ابھر رہا ہے، جو نہ صرف قصبے کا سب سے بڑا گھر تھا، بلکہ سب سے زیادہ مہمان نواز اور ٹھنڈا گھر جو اس دلدلی خطے میں کبھی پایا گیا ہو۔

حوزے آرکادیو بوئندیا، جو اس تمام ہنگامے کے دوران خدا کی قدرت کو حیرت میں ڈالنے کی کوششوں میں لگا ہوا تھا، واحد شخص تھا جو اس بات کو بالکل نہ سمجھ پایا۔ نیا گھر تقریباً مکمل ہو چکا تھا جب ارسلا اسے اس کی خیالی دنیا سے کھینچ کر باہر لائی، یہ بتانے کے لیے کہ اسے گھر کے باہر نیلا رنگ کرانے کا حکم دیا گیا ہے، جبکہ وہ سفید رنگ کرانا چاہتی ہے۔ اس نے ایک سرکاری کاغذ نکال کر دکھایا۔ حوزے آرکادیو بوئندیا نے، بغیر سمجھے کہ اس کی بیوی کیا کہہ رہی ہے، کاغذ میں کیے گئے دستخط کو پڑھا۔

''یہ کون شخص ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''مجسٹریٹ،'' ارسلا نے پریشانی کے عالم میں جواب دیا۔ ''لوگ کہتے ہیں کہ وہ حکومت کی طرف سے بھیجا گیا با اختیار اہلکار ہے۔''

دون اپولینار موسکوتے، مجسٹریٹ، بے حد خاموشی کے ساتھ ماکوندو آیا تھا۔ وہ ہوٹل ہاکوب میں ٹھہرا، جو طوطوں کے عوض اشیاء دینے والے پہلے عربوں میں سے ایک نے بنایا تھا، اور دوسرے دن اس نے حوزے آرکادیو بوئندیا کے گھر سے دو بلاک دور ایک چھوٹا سا کمرہ کرائے پر لے لیا، جس کا دروازہ گلی میں کھلتا تھا، اور اس نے ایک میز اور کرسی، جو اس نے ہوٹل ہاکوب سے خریدی تھی، اس کمرے میں لگائی، کیل سے دیوار پر جمہوریہ کی مُہر ٹھونک دی جو وہ اپنے ساتھ لایا تھا، اور دروازے کے باہر ایک تختی لگا دی: ''مجسٹریٹ''۔ اس کا پہلا حکم یہ تھا کہ ملک کے یومِ آزادی کا جشن منانے کے لیے تمام گھروں کو نیلا رنگ دیا جائے۔ حکم نامے کی نقل ہاتھ میں لیے، حوزے آرکادیو بوئندیا نے مجسٹریٹ کو ایک جھولنی میں قیلولہ کرتے پایا جو اس نے اپنے تنگ سے دفتر میں تان رکھی تھی۔ ''کیا یہ تم نے لکھا ہے؟'' اس نے

مجسٹریٹ سے پوچھا۔ دون اپولینار موسکوتے نے، جو ایک پختہ، شرمیلا، سرخی مائل رنگت والا شخص تھا، اثبات میں جواب دیا۔ ''کس حق کے تحت؟'' حوزے آرکادیو بوئندیا نے پھر پوچھا۔ دون اپولینار موسکوتے نے میز کی دراز سے ایک کاغذ نکال کر اسے دکھایا۔ ''مجھے اس قصبے کا مجسٹریٹ نامزد کیا گیا ہے۔'' حوزے آرکادیو بوئندیا نے اس کی تقرری کے کاغذ کی طرف دیکھا تک نہیں۔

''اس قصبے میں ہم کاغذ کے پرزوں پر لکھ کر حکم نہیں دیتے ہیں،'' وہ تحمل سے بولا۔ ''اور تم یہ جان لو، اس وقت، اور ہمیشہ کے لیے، کہ ہمیں کسی جج کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ یہاں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس پر فیصلہ کرنا پڑے۔''

دون اپولینار موسکوتے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے، آواز اونچی کیے بغیر، حوزے آرکادیو بوئندیا نے تفصیل کے ساتھ ماکوندو بسانے کی روداد سنائی۔ کس طرح انھوں نے زمین تقسیم کی تھی، سڑکیں بنائی تھیں، اور ضرورت کے تحت، بغیر حکومت کو تکلیف دیے اور بغیر کسی دخل اندازی کے، اس کی بہتری کے کام کیے تھے۔ ''ہم اتنے امن پسند ہیں کہ اب تک ہم میں سے کوئی طبعی موت بھی نہیں مرا ہے۔'' کوئی اس بات سے پریشان نہ تھا کہ حکومت نے اب تک ان کی مدد نہیں کی۔ اس کے برعکس، وہ خوش تھے کہ اب تک حکومت نے ماکوندو کو سکون کے ساتھ پھلنے پھولنے دیا ہے، اور انھیں امید تھی کہ حکومت ان کو اسی طرح رہنے دے گی، کیونکہ انھوں نے یہ قصبہ اس لیے نہیں بنایا تھا کہ پہلا نیا نواب جو یہاں آئے وہ انھیں بتائے کہ کیا کرنا ہے۔ دون اپولینار موسکوتے، ایک لمحے کے لیے بھی اپنی جنبشوں کا وقار کھوئے بغیر، اپنی ڈینم کی جیکٹ پہن چکا تھا، جو اس کی پتلون کی طرح سفید تھی۔ •

''اس لیے اگر تم کسی بھی عام شہری کی طرح یہاں ٹھہرنا چاہو تو تمھیں خوش آمدید کہا جائے گا،'' حوزے آرکادیو بوئندیا نے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اگر تم یہاں لوگوں کو اپنے گھر نیلے رنگنے پر مجبور کر کے بدامنی پھیلانے آئے ہو، تو تم اپنا کباڑ اٹھا کر اس جگہ واپس جا سکتے ہو جہاں سے تم آئے ہو، کیونکہ میرا گھر فاختہ کی طرح سفید ہونے جا رہا ہے۔''

دون اپولینار موسکوتے کا رنگ زرد پڑ گیا۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹا اور جبڑے سکیڑ کر ایک خاص غضب کے ساتھ کہا:

''میں تمھیں بتائے دیتا ہوں کہ میں مسلح ہوں۔''

حوزے آرکادیو بوئندیا کو پتا نہ چلا کہ کس لمحے اس کے ہاتھوں میں وہ کارآمد قوت پھر لوٹ آئی جس سے وہ گھوڑوں کو کانوں سے پکڑ کر روک لیا کرتا تھا۔ اس نے دون اپولینار موسکوتے کو کوٹ کے کالر سے پکڑ کر اپنی آنکھوں کی سطح تک اٹھالیا۔

"میں یہ اس لیے کر رہا ہوں،" اس نے کہا، "کیونکہ میں تمھیں زندہ اٹھائے پھرنا چاہتا ہوں، بجائے اس کے کہ تمھیں زندگی بھر کے لیے مردہ اٹھائے پھروں۔"

اور وہ اسی طرح دون اپولینار موسکوتے کو کالر سے اٹھائے سڑک کے وسط میں چلتا گیا، یہاں تک کہ دلدلی سڑک پر اسے پیروں پر کھڑا کر دیا۔ ایک ہفتے بعد وہ چھ عدد ننگے پاؤں، پھٹی وردیوں میں ملبوس، اور بندوقوں سے مسلح سپاہیوں، اور ایک بیل گاڑی کے ساتھ، جس میں اس کی بیوی اور سات بیٹیاں اس کے ساتھ سفر کر رہی تھیں، واپس آیا۔ دو اور بیل گاڑیاں بعد میں فرنیچر، گھر کا سامان اور برتن لیے پہنچیں۔ اس نے اپنے خاندان کو گھر تلاش کرنے کے دوران ہوٹل ہاکوب میں ٹھہرایا، اور خود سپاہیوں کے پہرے میں اپنا دفتر کھولنے چل دیا۔ ماکوندو کے بانی، جنھوں نے حملہ آوروں کو قصبے سے نکالنے کا تہیہ کر لیا تھا، اپنے اپنے بڑے بیٹوں کے ساتھ حوزے آرکادیو بوئندیا کے پاس پہنچ گئے۔ لیکن وہ اس کے خلاف تھا، جیسا کہ اس نے وضاحت کی، کیونکہ کسی کو اس کے بیوی بچوں کے سامنے پریشان کرنا مردانگی نہیں ہے، اور دون اپولینار موسکوتے بیوی بچوں کے ساتھ واپس آیا تھا۔ لہٰذا اس نے فیصلہ کیا کہ اس مسئلے کو خوشگوار طریقے سے حل کیا جائے۔

اوریلیانو اس کے ساتھ گیا۔ اُن دنوں اس نے سیاہ مونچھیں رکھنا شروع کر دی تھیں، جن کی نوکوں پر تیل چپڑا ہوتا، اور اس کی آواز کچھ کچھ بلند ہو چلی تھی، وہی خصوصیات جو آئندہ جنگ میں اس کو ممیز کرنے والی تھیں۔ مسلح محافظوں کی پروا کیے بغیر، نہتے، وہ مجسٹریٹ کے دفتر میں پہنچے۔ دون اپولینار موسکوتے نے اپنا تحمل برقرار رکھا۔ اس نے اپنی دو بیٹیوں کا، جو اس وقت وہاں موجود تھیں، تعارف کرایا: آمپارو، سولہ سالہ، اپنی ماں کی طرح سانولی، اور ریمیدیوس، صرف نو سال کی، ایک خوبصورت چھوٹی سی بچی، جس کی جلد گلِ سوسن کی طرح سفید اور آنکھیں سبز تھیں۔ وہ دونوں پُروقار اور شائستہ تھیں۔ جیسے ہی مرد داخل ہوئے، ان سے متعارف کرائے جانے سے پیشتر ہی، لڑکیوں نے ان کے بیٹھنے کے لیے کرسیاں پیش کیں۔ لیکن وہ دونوں کھڑے رہے۔

''بہت خوب، میرے دوست،'' حوزے آرکادیو بوئندیا نے کہا، ''تم اگر چاہو تو یہاں ٹھہر سکتے ہو، اس لیے نہیں کہ تم نے دروازے پر مسلح ڈاکوؤں کو بٹھا رکھا ہے، بلکہ تمھاری بیوی اور بچوں کے احترام میں۔''

دون اپولینار موسکوتے پریشان ہو گیا، لیکن حوزے آرکادیو بوئندیا نے اسے جواب دینے کی مہلت نہ دی۔ ''ہماری صرف دو شرائط ہیں،'' اس نے بات جاری رکھی، ''اول: جو جس رنگ میں اپنا گھر رنگنا چاہے، رنگ سکتا ہے۔ دوم: سپاہی فوراً یہاں سے واپس چلے جائیں۔ ہم امن و امان اور نظم و ضبط کی ضمانت دیتے ہیں۔'' مجسٹریٹ نے اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھایا۔

''تم اپنی زبان دیتے ہو؟''

''تمھارے دشمن کی زبان،'' حوزے آرکادیو بوئندیا نے کہا اور تلخ لہجے میں وضاحت کی: ''کیونکہ میں ایک بات تم پر واضح کردوں: تم اور میں اب تک دشمن ہیں۔''

سپاہی اسی سہ پہر چلے گئے۔ چند دنوں بعد حوزے آرکادیو بوئندیا نے مجسٹریٹ کے خاندان کے لیے ایک گھر تلاش کر دیا۔ سوائے اوریلیانو کے سب سکون سے سو گئے۔ ریمیدیوس، مجسٹریٹ کی چھوٹی بیٹی، جو اپنی عمر کے لحاظ سے خود اس کی بیٹی ہو سکتی تھی، اس کے جسم کے کسی حصے میں درد جگاتی رہی۔ وہ ایک جسمانی ہیجان تھا جو اس کو چلتے میں اس طرح تنگ کیا کرتا جیسا کہ جوتے کا کنکر۔

**

لکھنے والوں کا تعارف

ابرہام یہوشوا (A.B. Yehoshua)

ابرہام یہوشوا (اے بی یہوشوا) عبرانی زبان کے جدید فکشن کے اہم ترین نمائندوں میں سے ایک ہیں۔ ان کے ناولوں اور کہانیوں کو کہانی کہنے کے فن پر ان کی بے پناہ گرفت اور انسانی نفسیات کے گہرے ادراک کے باعث مغربی قارئین اور نقادوں کی متفقہ تحسین حاصل ہوئی ہے۔ لیکن یہوشوا کی کہانیاں محض کرداروں کے نفسیاتی مطالعے سے کہیں بڑھ کر ہیں۔ ان میں روزمرہ کی تفصیلوں کا فنکارانہ استعمال، لفظوں کا محتاط اور حساس انتخاب اور جملوں کی ساخت کا شاعرانہ ہنر ان کہانیوں کو پڑھنے والے کے لیے ایک بھرپور جمالیاتی تجربے میں تبدیل کر دیتا ہے۔

یہوشوا کی کہانی The Continuing Silence of a Poet ۱۹۸۸ء میں اسی نام سے شائع ہونے والے مجموعے کی پہلی کہانی ہے۔ یہ ترجمہ جس سے اس انتخاب نے اپنا عنوان پایا ہے، ''آج'' کے شمارہ ۶ (سرما ۱۹۹۱ء) میں شائع ہوا تھا۔

یہوشوا حیفہ یونیورسٹی میں ادبیات کے استاد ہیں۔ ان کے کئی ناول اور کہانیوں کے مجموعے انگریزی زبان میں شائع ہو چکے ہیں۔

ڈونلڈ بارتھیم (Donald Barthelme)

ڈونلڈ بارتھیم امریکہ سے تعلق رکھنے والے کہانی کار اور ناول نگار تھے۔ ان کی پیدائش ۱۹۳۱ء میں امریکی شہر فلاڈلفیا میں اس وقت ہوئی جب ان کی ماں اور باپ دونوں یونیورسٹی کے طالب علم تھے۔ ڈونلڈ بارتھیم نے صحافت کی تعلیم حاصل کی اور اخباری مضامین لکھنے اور اخباروں رسالوں کی ادارت کرنے کے علاوہ ہوسٹن کے معاصر آرٹ کے میوزیم کے ڈائرکٹر کے طور پر بھی خدمات انجام دیں۔ طالب علمی کے دوران ہی ۱۹۵۳ء میں بارتھیم کو جبری بھرتی کے قانون کے تحت امریکی فوجی کی حیثیت سے کوریا جانا پڑا لیکن ان کی آمد اسی دن ہوئی جب جنگ بندی کا معاہدہ ہو چکا تھا۔ انھوں نے واپس آ کر فلسفے کی تعلیم حاصل کرنا شروع کی لیکن کبھی تعلیم مکمل کر کے ڈگری حاصل نہ کر سکے۔ ان کا اپنے باپ سے رشتہ ایک متواتر کشمکش کا غماز رہا۔ بارتھیم نے جس قسم کے مابعد جدید فکشن کو پسند کیا اور لکھا، اس پر ان کے باپ نے ہمیشہ نکتہ چینی کی۔ اس پیچیدہ رشتے کا اظہار بارتھیم کے ناولوں *The Dead Father* اور *The King* میں بھی ہوا اور بارتھیم کی طرف سے اپنے ماں

باپ کا رومن کیتھولک مذہب چھوڑ دینے کی صورت میں بھی۔ ان کی معروف کہانی The Balloon، جس کا اردو ترجمہ پہلی بار ''آج'' کے شمارہ ۱ (خزاں ۱۹۸۹ء) میں شائع ہوا تھا اور جو موجودہ انتخاب میں شامل ہے، بارتھیم کے ۱۹۶۸ء میں شائع ہونے والے مجموعے *Unspeakable Practices, Unnatural Acts* سے لی گئی ہے اور ان کے مخصوص اسلوب کی ایک دلچسپ مثال ہے۔ بارتھیم کی وفات ۱۹۸۹ء میں ہوئی۔

کیم مونزو (Quim Monzo)

۱۹۵۲ء میں بارسلونا (اسپین) میں پیدا ہوئے۔ سولہ سال تک گرافک ڈیزائنر کے طور پر کام کیا۔ ستر کی دہائی میں بارسلونا کے روزناموں کے لیے شمالی آئرلینڈ، ویت نام اور کمبوڈیا کی جنگوں کی رپورٹنگ کی۔ اپنی کہانیوں سے زیادہ شہرت پائی لیکن فلموں میں مکالمہ نگاری، ریڈیو اور ٹیلی وژن کی اسکرپٹ نگاری اور ناولوں کے ترجمے بھی کر چکے ہیں۔ کہانیوں کے سات مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ۱۹۸۱ء میں کتالان کریٹکس پرائز حاصل کیا۔ ان کی کہانیوں کے انگریزی ترجموں کا مجموعہ *O' Clock* ۱۹۸۶ء میں امریکہ سے شائع ہوا۔ ان کی کہانی کا ترجمہ ''جہاں گرد'' کے عنوان سے ''آج'' کے شمارہ ۲ (سرما ۱۹۹۰ء) میں شائع ہوا تھا۔

اِتالو کلوینو (Italo Calvino)

اطالوی زبان کے منفرد ادیب اِتالو کلوینو ۱۹۲۳ء میں کیوبا میں پیدا ہوے اور اٹلی کے شہر سان ریمو میں پرورش پائی۔ ایک بلند پایہ فکشن نگار ہونے کے ساتھ ساتھ انھوں نے ادب سے متعلق موضوعات پر مضامین بھی لکھے اور تورینو کے ایک اشاعتی ادارے کے ادارتی عملے میں بھی شامل رہے۔ کلوینو نے اطالوی لوک کہانیوں کا ایک ضخیم مجموعہ بھی مرتب کیا۔ کلوینو کی وفات ۱۹۸۸ء میں ہوئی۔

کلوینو کی تحریروں میں پڑھنے والے کی ملاقات ایک بے حد فراواں تخیل اور اسلوب اور بیان پر بے پناہ گرفت سے ہوتی ہے۔ اس کی ایک نہایت عمدہ مثال اس انتخاب میں شامل کہانی ہے جس کا ترجمہ پہلی بار ''آج'' کے شمارہ ۳ (بہار ۱۹۹۰ء) میں شائع ہوا تھا۔ یہ کلوینو کے مجموعے *Cosmicomics* کی پہلی کہانی ہے۔ اس مجموعے میں کلوینو نے کائنات کی ابتدا کے بارے میں انسانی تخیل کے تراشے ہوے مختلف نظریوں کو جگمگاتی ہوئی کہانیوں کا روپ دیا ہے، جن میں انسانی جذبے کا لمس جان ڈال دیتا ہے۔

دانیال الارکون (Daniel Alarcon)

لاطینی امریکی ملک پیرو کے سب سے بڑے شہر لیما میں ۱۹۷۷ء میں پیدا ہوے اور امریکہ میں پرورش

پائی۔ ۲۰۰۱ء میں وہ فلبرائٹ اسکالرشپ پر لیما واپس آئے اور ۲۰۰۲ء میں امریکہ کی آیووا یونیورسٹی کے رائٹرز ورکشاپ میں طالب علم کی حیثیت سے داخل ہوئے۔ الارکون کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ ۲۰۰۵ء میں شائع ہوا۔

الارکون کی جس کہانی کا ترجمہ اس انتخاب میں شامل ہے وہ City of Clowns کے عنوان سے امریکی جریدے ''نیویارکر'' کے ۱۶ تا ۲۳ رجون ۲۰۰۳ء کے شمارے میں Debut Fiction کے زمرے میں شائع ہوئی تھی، اور یہ ترجمہ ''آج'' کے شمارہ ۴۵ (اکتوبر ۲۰۰۴ء) میں شائع ہوا۔ اس کہانی کی تحریر کے آغاز کے بارے میں الارکون کا کہنا ہے: ''ایک دن میرے ایک دوست نے مجھے لیما سے فون کیا اور پوچھا کہ کیا میں اسے دوسو ڈالر ادھار دے سکتا ہوں کیونکہ اس کو اپنے باپ کی لاش اسپتال سے اٹھوانی ہے۔ یہ کہانی وہاں سے شروع ہوتی ہے۔ اس طرح کا ظلم لیما کی روزمرہ کی کہانی ہے اور ہزاروں دوسری جگہوں کی بھی۔'' دراصل لیما شہر اس کہانی کا سب سے بڑا کردار ہے جہاں لوگ ایک نئی اور بہتر زندگی کی تلاش میں گروہ در گروہ پہنچتے ہیں اور اپنی تقدیر کی مہربانی اور سفاکی کا سامنا کرتے ہیں۔ شہر میں گھوم پھر کر چیزیں فروخت کرنے والے اور تماشے دکھانے والے مسخرے کا تصور پیرو کی عوامی ثقافت کا حصہ ہے جسے اس کہانی میں بڑی خوبصورتی اور معنویت کے ساتھ شامل کیا گیا ہے۔

افسانہ نگاری کے بارے میں الارکون کہتا ہے: ''کہانی لکھنا اپنے کرداروں سے محبت میں گرفتار ہونے کا نام ہے۔ کہانی لکھنے کے فن کی کشش یہی ہے کہ تم کئی مرتبہ مختلف لوگوں کی محبت میں گرفتار ہو سکتے ہو۔''

یوسف ادریس

مصر کے ممتاز اور معروف ادیب یوسف ادریس ۱۹۲۷ء میں اسماعیلیہ کے قریب ایک چھوٹے گاؤں میں پیدا ہوئے۔ صوبائی دارالحکومت میں اپنی سیکنڈری اسکول کی تعلیم ختم کرنے کے بعد وہ ۱۹۴۵ء میں طب کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے قاہرہ چلے گئے اور وہیں ۱۹۴۰ء کی دہائی کے آخری برسوں میں، ان کی پہلی کہانیاں ''المصری'' نامی اخبار میں شائع ہوئیں۔ وفد پارٹی کے حامی اس روزنامے کی اشاعت پر بعد میں جمال عبدالناصر کے حکم سے پابندی لگادی گئی۔ ادریس نے طب کی تعلیم ۱۹۵۱ء میں مکمل کی اور کئی برسوں تک پریکٹس کرتے رہے۔ لیکن رفتہ رفتہ ان کی زیادہ تر توجہ لکھنے پر مرکوز ہوتی گئی اور ۱۹۶۵ء کے لگ بھگ انھوں نے طب کو خیرباد کہہ کر ہمہ وقتی ادیب اور صحافی کا پیشہ اختیار کرلیا۔ ادریس کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ ۱۹۵۴ء میں شائع ہوا تھا اور اس کے بعد سے نو اور مجموعے اور متعدد ناول اور ڈرامے شائع ہو چکے ہیں۔

یوسف ادریس کی کہانی ''الغریب''، جس کا ترجمہ اس انتخاب میں شامل ہے، ان کی ۱۹۶۱ء کی تخلیق ہے۔ ''الغریب'' کے ایک مرکزی کردار کا نام بھی ہے اور عربی زبان میں ''اجنبی'' کا مفہوم بھی رکھتا ہے۔ اس کا انگریزی ترجمہ The Stranger کے عنوان سے، ان کی چار طویل کہانیوں کے انگریزی ترجموں کے مجموعے

Rings of Burnished Brass میں شامل ہے۔ اس انتخاب میں شامل ترجمہ پہلی بار ''آج'' کے شمارہ ۹ (سرما ۱۹۹۲ء) میں شائع ہوا تھا۔

یہ دوسری جنگِ عظیم کے زمانے، مصر کے دیہی علاقے کے ایک بدنام مجرم اور قاتل سے ایک نوعمر لڑکے کے انوکھے تعلق کی کہانی ہے۔ جرم کی نفسیات اور اس کو ہوا دینے والے عوامل کی جو تفصیلات اس کہانی میں پیش کی گئی ہیں ان میں سے بیشتر ہمیں غیر مانوس نہیں لگیں گی۔ دوسری طرف یہ کہانی، موضوع اور ماحول کے لحاظ سے کہانی کی صنف کی تقریباً لامحدود لچک کی بھی ایک نہایت عمدہ مثال ہے۔

گابریئل گارسیا مارکیز (Gabriel Garcia Marquez)

گابریئل گارسیا مارکیز، جن کا نام اردو پڑھنے والوں کے لیے اب اجنبی نہیں رہا، ۱۹۲۸ء میں لاطینی امریکی ملک کولومبیا کے گرم خطے کے قصبے اراکاتاکا میں پیدا ہوئے اور اپنے ناول *One Hundred Years of Solitude* (''تنہائی کے سو سال'') کی اشاعت کے بعد سے عالمی فکشن کی عظیم ترین ہستیوں میں شامل ہیں۔ انھیں ۱۹۸۲ء میں ادب کا نوبیل انعام پیش کیا گیا۔ ''آج'' کا شمارہ ۷ (بہار ۱۹۹۱ء) مارکیز کی تحریروں کے لیے وقف کیا جانے والا خصوصی شمارہ تھا۔ موجودہ انتخاب میں مارکیز کے ناول کے پہلے تین ابواب کا جو ترجمہ شامل ہے وہ اسی خصوصی شمارے کا ایک اہم حصہ تھا۔

دیگر تراجم

عربی کہانیاں
انتخاب اور ترتیب
اجمل کمال
Rs.180

ایرانی کہانیاں
انتخاب اور ترجمہ
نیر مسعود
Rs.90

ہندی کہانیاں (۳ حصے)
انتخاب اور ترتیب
اجمل کمال
Rs.540 (سیٹ)

بوف کور (ناول)
صادق ہدایت
فارسی سے ترجمہ: اجمل کمال
Rs.40

دیمک (ناول)
شرشیند ومکھو پادھیائے
ترجمہ: رفعت سروش
Rs.70

خیمہ (ناول)
میرال طحاوی
انگریزی سے ترجمہ: اجمل کمال
Rs.75

تمس (ناول)
بھیشم ساہنی
ہندی سے ترجمہ: شہلا نقوی
Rs.180

قلبِ ظلمات (کہانیاں)
جوزف کونریڈ
انگریزی سے ترجمہ: محمد سلیم الرحمٰن
Rs.80

کارل اور اینا (کہانیاں)
محمد سلیم الرحمٰن
انگریزی سے ترجمہ: محمد سلیم الرحمٰن
Rs.80

گم شدہ خطوط (کہانیاں)
انگریزی سے ترجمہ: محمد عمر میمن
Rs.90

پہلی بارش (کہانیاں)
خولیو لیاما زاریس
انگریزی سے ترجمہ: اجمل کمال
Rs.95

جوئندہ یابندہ (سوانح)
رالف رسل
انگریزی سے ترجمہ: ارجمند آرا
Rs.295

درخت نشیں (ناول)
اِتا لو کلوینو
انگریزی سے ترجمہ: راشد مفتی
(زیرِ طبع)

نوکر کی قمیص (ناول)
ونو دکمار شکل
ہندی سے ترجمہ: عامر انصاری
(زیرِ طبع)

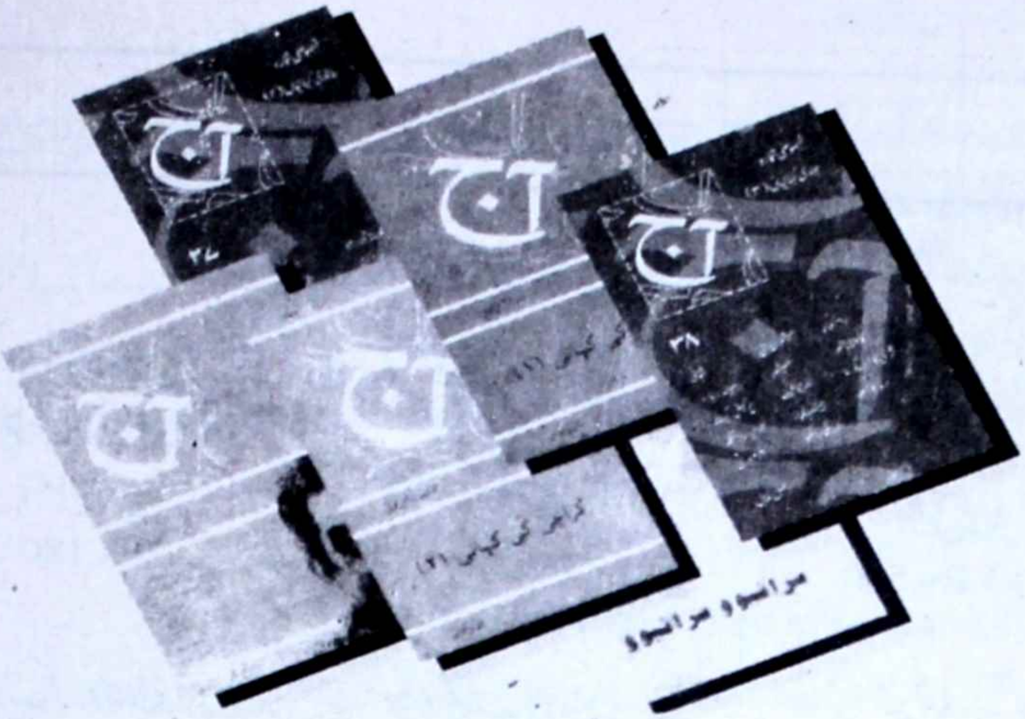

سہ ماہی ادبی کتابی سلسلے ''آج'' کی اشاعت ستمبر ۱۹۸۹ء میں کراچی سے شروع ہوئی اور اب تک اس کے ۵۴ شمارے شائع ہو چکے ہیں۔ ''آج'' کے اب تک شائع ہونے والے خصوصی شماروں میں گابریئل گارسیا مارکیز، ''سرائیوو سرائیوو'' (بوسنیا)، نرمل ورما، اور ''کراچی کی کہانی'' کے علاوہ عربی، فارسی اور ہندی کہانیوں کے انتخاب پر مشتمل شمارے بھی شامل ہیں۔

''آج'' کی مستقل خریداری حاصل کر کے آپ اس کا ہر شمارہ گھر بیٹھے وصول کر سکتے ہیں
اور ''آج کی کتابیں'' اور ''سٹی پریس'' کی شائع کردہ کتابیں ۵۰ فیصد رعایت پر خرید سکتے ہیں۔
(یہ رعایت فی الحال صرف پاکستانی سالانہ خریداروں کے لیے دستیاب ہے۔)

چار شماروں کے لیے شرح خریداری (بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان میں: ۳۰۰ روپے
دیگر ملکوں میں: ۴۵ امریکی ڈالر

عالمی ادب سے انتخاب

ابرہام یہوشوا

ڈونلڈ بارتھیم

کیم مونزو

اتالو کلوینو

دانیال الارکون

یوسف ادریس

گابرئیل گارسیا مارکیز

Cover painting: S. Harshwardhan

ISBN 969-8379-83-5

Rs.120